عنایت اللہ
ہماری شکست کی کہانی
کچھ آنکھوں دیکھی، کچھ غیروں کی زبانی
مشرقی پاکستان کس نے الگ کیا؟ کیوں کیا؟
مکتبہ داستان
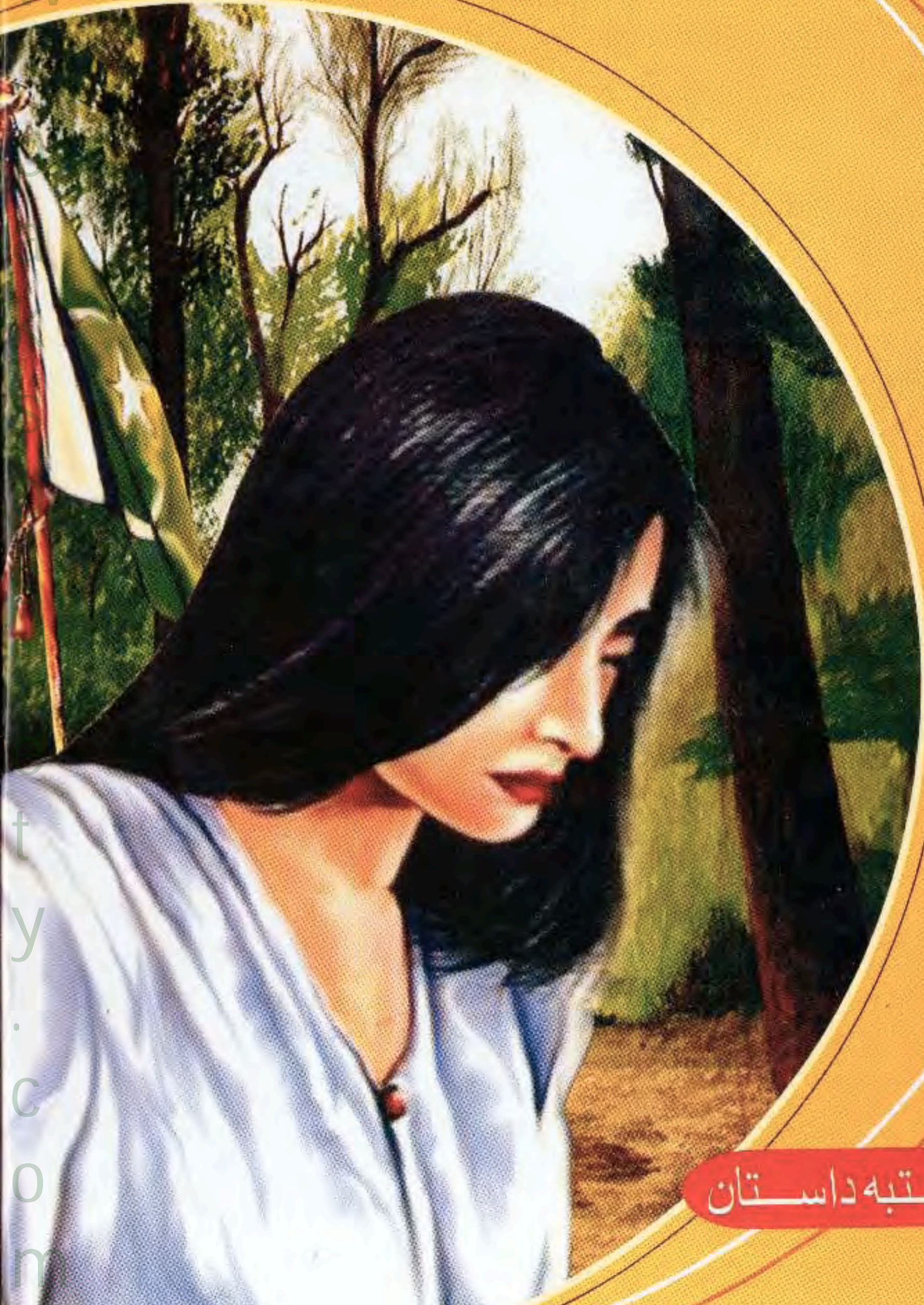
ہماری شکست کی کہانی

مشرقی پاکستان کس نے الگ کیا؟ اور کیوں کیا؟

(کچھ آنکھوں دیکھی کچھ غیروں کی زبانی)

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

پیش لفظ

انیس سال گذر گئے ہیں۔ لوگ ابھی تک پوچھ رہے ہیں کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے المیے کے ذمہ دار کون تھے؟ حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ عوام سے پوشیدہ کیوں رکھی گئی؟ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو نے رہا کیوں کر دیا تھا؟ یحییٰ خان کے خلاف کارروائی کیوں نہ ہوئی؟ کیا یہ واقعی فوجی شکست تھی؟

سقوطِ مشرقی پاکستان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ایسی کتابوں کی تعداد کم نہیں جو بظاہر مختلف پبلشروں نے چھاپی تھیں لیکن یہ درپردہ بھٹو مرحوم کی حکومت نے لکھوائی تھیں یا بعض مصنفوں نے اس حکومت کی خوشنودی کے لیے ایسے حقائق پر پردہ ڈالے رکھا جو اس وقت کے جابر سلطان کے خلاف الزامات ثابت کرتے تھے۔ ان میں جس کتاب نے زیادہ شہرت حاصل کی وہ ہے صدیق سالک مرحوم کی کتاب WITNESS TO SURRENDER جو "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" کے عنوان سے اردو میں بھی چھپی ہے۔ یہ کتاب بھٹو مرحوم کے دور میں لکھی بلکہ لکھوائی جا رہی تھی اور یہ ثابت کیا جا رہا تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کی ذمہ دار صرف فوج ہے لیکن کتاب ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ بھٹو مرحوم کا دورِ حکومت تختۂ دار پر جا ختم ہوا اور فوج کی حکومت آ گئی۔ پھر اسی کتاب کا رُخ پھیر دیا گیا۔ اس طرح ایک غیر مستند کتاب کو شہرت اور مصنف کو دولت تو مل گئی لیکن حقائق پوشیدہ اور کردار نقاب پوش ہی رہے۔

غیر ملکی وقائع نگاروں نے جو کتابیں لکھیں ان کا پاکستان میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا کیونکہ ان میں ان تمام سوالوں کے جواب موجود تھے جو پاکستانی آج تک پوچھ رہے ہیں۔

۱۹۷۵ء میں ہم نے ——"اپنی شکست کی کہانی، کچھ آنکھوں دیکھی کچھ

"غیروں کی زبانی" — کے عنوان سے سقوطِ مشرقی پاکستان کا تجزیہ قلبند کیا اور "حکایت" میں تین قسطوں میں شائع کیا تھا۔ چونکہ اس میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ یہ فوجی نہیں بلکہ سیاسی شکست تھی اور وہ انتہائی دشوار حالات بھی سامنے لائے گئے تھے جن میں فوج کو دانستہ بے مایہ اور قلیل تعداد رکھ کر لڑایا گیا تھا اس لیے "حکایت" کے یہ تینوں شمارے پاکستان کی مسلح افواج کے لیے ممنوع قرار دے دیئے گئے تاکہ افواج کو پتہ نہ چلے کہ انہیں اقتدار پرستی کے سیاسی ناٹک میں استعمال کیا گیا تھا۔ جنرل ٹکا خان اور اُس وقت کے ڈیفنس سیکرٹری جنرل فضل مقیم نے تو "حکایت" کے خلاف شدید کارروائی کرنے کے لیے وفاقی وزارتِ اطلاعات کو کہا تھا۔ معلوم نہیں "حکایت" کس طرح بال بال بچ گیا۔

پاکستان میں کسی بھی حکومت کے دور میں سچ بولنے اور سچ لکھنے کی گنجائش نہیں رکھی گئی بلکہ صداقت کو تخریب کاری کہا گیا لیکن سقوطِ مشرقی پاکستان کے فوراً بعد آنے والی حکومت کے دور میں اس سقوط کی صحیح بات کرنا سنگین جُرم سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے یہ جُرم کیا پھر ہم حق گوئی کے عادی مجرم ہو گئے۔

اتنے بڑے حادثے اور اتنی بڑی شکست کے اسباب کا علم ہونا چاہیئے۔ اپنی لغزشوں کا احتساب ہونا چاہیئے تاکہ آئندہ ایسا حادثہ نہ ہو لیکن ہمارے حکمرانوں کا رویہ وہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سندھ میں وہی حالات پیدا ہو چکے ہیں جنہوں نے پاکستان کو آدھا کیا تھا۔ یہ حالات بھارت کی پاکستان دشمنی اور عیاری سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے لیے ہمارے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے زمین ہموار کی ہے جن کی تمام تر توجہ اور سرگرمیاں اقتدار کے تحفظ پر یا اقتدار حاصل کرنے پر اور سیاسی جوڑ توڑ پر مرکوز رہتی ہیں۔ وہ تاریخ کو دُہرا رہے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو مرحوم نے اتنی بڑی سازش، غداری اور خانہ جنگی جیسے جرائم بخش دیئے تھے۔

ضیاء مرحوم نے جی ایم سید کو محبِ وطن کہا۔ بھارت جا کر جی ایم سید پاکستان کو توڑنے کے متعلق جو بیان دیتا رہا انہیں ہمارے مرحوم صدر ہنس کر نظرانداز کرتے رہے۔ کراچی میں آپس کی خونریزی میں بھارت کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہے۔ وہ کمال چابکدستی سے جلتی پر تیل ڈال رہا ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ سقوطِ بغداد اور سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلم تاریخ کا بڑا ہی شرمناک سنگِ میل ہے۔ اندلس، بغداد اور متحدہ پاکستان کے آخری شب و روز کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا سارے مناظر ایک جیسے ہیں۔ ان تینوں واقعات میں حکمرانوں کی عیش کوشی اور ان کے اخلاق و کردار کی کمزوریاں مشترکہ نظر آتی ہیں۔ ان کمزوریوں سے اسلام کے ازلی دشمنوں نے فائدہ اُٹھایا اور مسلمانوں کے عسکری تفاخر کو خاک میں ملا دیا۔

سقوطِ مشرقی پاکستان سے ہمارے حکمرانوں نے اپنا ایک مذموم مقصد پورا کرنے کی بھی کوشش کی اور اس شکست کی ذمہ داری فوج کے سر تھوپ دی۔ وہ اپنا ہی نہیں، اندرا گاندھی کا بھی مقصد پورا کر رہے تھے جس نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد فخریہ کہا تھا کہ اُس نے مسلمانوں کی عسکری برتری کا بُت توڑ دیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے حاشیہ بردار جرنیلوں اور ادیبوں سے کتابیں بھی لکھوائیں جن میں شکست کی ذمہ داری فوج پر ڈالی گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی شکست درحقیقت سیاسی شکست تھی اور اس میں فوج کو عسکری انداز سے استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اُس دور کی تاریخ پڑھیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ حکمران جان بوجھ کر قوم کو اس شکست کی طرف لے جا رہے تھے لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس سانحے کی صحیح تصویر پیش کی ہی نہیں گئی تھی۔

میں نے اُس دور میں اس سقوط کا تجزیہ پیش کر دیا تھا اور "حکایت" میں سلسلہ وار مضامین شائع کیے تھے۔ اُس دور کی حکومت نے اپنے مختلف حربوں سے میرے لیے رزق کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اللہ کے فضل اور میرے قارئین کی محبت نے مجھے اپنا کام جاری رکھنے کا حوصلہ بخشا اور اسی حوصلے پر میں نے یہ تجزیہ سالہا سال کی کاوش اور عرق ریزی سے مکمل کر لیا ہے۔

اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور وطنِ عزیز میں وہ حالات پیدا نہ ہونے دیں
جن کی وجہ سے قوم کو شکست کی ذلّت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

المیۂ مشرقی پاکستان کے اسباب ایک ایسا راز ہیں جن پر حکومتی اور فوجی حلقے ہزار پردے ڈالیں، اب یہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ قوم یہ سوال پوچھتے پوچھتے کہ مشرقی پاکستان میں ہماری شکست کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، اب اس معمّے کے حل میں سر پٹخ رہی ہے کہ حمود الرحمٰن کمشن کی کارروائی منظرِ عام پر کیوں نہیں لائی جاتی؟ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ شکست کی ذمّہ داری جن افراد پر عائد ہوتی ہے، اُن کی حفاظت ایک نازک راز کی طرح کی گئی۔ یہ یحییٰ خان تھا جسے المیۂ مشرقی پاکستان کے بعد نظر بند کیا گیا۔

اگر ہمارے اس شرابی اور بدکردار سابق بادشاہ کی نظر بندی کا مقصد یہی جو قوم سمجھتی رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حفاظت یحییٰ خان کی نہیں کی گئی، بلکہ اُس راز کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا گیا تھا جو یحییٰ خان کے سینے میں موجود تھا کیونکہ اس میں چند ایسے افراد کے بھی نام آتے تھے جو آج "عوام" کے بہی خواہ بنے پھرتے ہیں اور مشرقی پاکستان کے المیہ پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔

بعد میں ان مگرمچھوں نے اپنے آنسو پونچھ کر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا لیکن بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے سے قوم کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی قوم مشرقی پاکستان کو اتنی آسانی سے ماضی کی مٹی میں دفن کر دینے پر آمادہ ہو سکتی ہے بلکہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے قوم کے زخم پر نمک چھڑکا گیا اور بعد میں جبکہ دنیا بھر کے اخباروں نے مشرقی پاکستان کے عوام کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور جذباتی کیفیت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہاں کے بنگالی مسلمانوں نے کبھی بھی بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا تو قوم کو یہ سوال پریشان کرنے لگا ہے کہ ہماری حکومت نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں عجلت سے کام کیوں لیا؟ کیا یہ مجیب الرحمٰن کا منہ بند کرنے کا اہتمام تو نہیں تھا؟ بعد میں مجیب نے سیاسی آزادی کا گلا دبا کر اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ڈکٹیٹرشپ کا جو مظاہرہ کیا وہ اس حقیقت کا ثبوت تھا کہ وہ بنگالی مسلمانوں سے اپنا اندر اگاندھی

کا اور روس کا بنگلہ دیش تسلیم نہیں کرا سکا اور اس نے اپنی "راکھی باہنی" (ڈیکوریٹی فورس) سے اپنے مخالفین کا جو قتلِ عام کرایا تھا وہ بھی اس کے اور بھارتیوں کے عزائم کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔

بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ہم نے بھارت اور روس کی جارحیت کو بھی تسلیم کیا اور اسے برحق قرار دے دیا۔ اندرا گاندھی نے سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد کہا تھا — "ہم سندھی، بلوچی اور پٹھان بھائیوں کی بھی اسی طرح مدد کر کے انہیں پاکستان سے آزاد کرائیں گے" — روس نے بھی ایسا ہی ایک سرکاری بیان جاری کرتے ہوئے کہا تھا — "اگر پاکستان کے کسی اور صوبے میں ایسے حالات پیدا ہوئے تو ہم وہاں بھی یہی کارروائی کریں گے جو بنگلہ دیش میں کی ہے" — بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ہم نے دراصل یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی فی الواقع جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں اور یہ بھی کہ ہم نے انہیں جبراً غلام بنا رکھا تھا یعنی ہم نے انہیں FREEDOM FIGHTERS تسلیم کیا ہے۔

سب سے بڑا نقصان تو بعد میں سامنے آیا۔ ہمارے سابق وزیرِ اعظم ڈھاکہ گئے تو وہاں بنگالیوں نے بے ساختہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ غیر ملکی رپورٹروں نے لکھا ہے کہ وہاں کے عوام بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ایسے بنگلہ دیش کا مطالبہ نہیں کیا تھا جو پاکستان سے الگ ہو۔ بے شمار غیر ملکی مبصروں نے لکھا ہے کہ ہندو اور بھارت کے خلاف وہاں کے مسلمانوں کے دلوں میں جو پرانی نفرت تھی وہ زیادہ شدّت سے عود کر آئی ہے۔ برطانیہ میں مقیم بنگالی جو وہاں پاکستان کے خلاف مظاہرے اور پروپیگنڈے کرتے رہتے تھے اب "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان کے حق میں تحریک اُبھر رہی ہے جو تیزی سے عوام میں پھیل رہی ہے مگر ہم نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے اس تحریک کو کمزور اور بے جان کر دیا ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کئی اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور ایک گناہ کی پردہ پوشی کے لیے مزید گناہ کیے جاتے ہیں مگر ہماری حکومت کو فطرتِ انسانی کا یہ اٹل اصول بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کچھ لوگوں کو کچھ وقت کے لیے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے، تمام لوگوں کو تمام عمر کے لیے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔

مارچ کا مہینہ ملّتِ پاکستان کے لیے ایک مقدس مہینہ ہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے روز آسام سے افغانستان کی سرحد تک کے مسلمانوں نے ایک قرارداد کی صُورت میں اپنی منزل اور اپنے راستے کا تعیّن کیا اور جنگِ آزادی کا پلان بنایا تھا۔ اس کی یادگار ایک مینار ہے جو لاہور کی شاہی مسجد کے پہلو میں کھڑا ہے۔ یہ مینار جو دسمبر ۱۹۷۱ء تک قوم کی عظمت کا نشان بنا رہا اب یوں نظر آتا ہے جیسے اِس دھرتی کے سینے میں ایک خنجر کی مانند اُترا ہُوا ہے اور اس سے خون ٹپک رہا ہے۔ عیّاش مغل شہنشاہوں کے مقبروں کی طرح مینارِ پاکستان بھی آثارِ قدیمہ کے عجائبات کی ایک چیز بنتا جا رہا ہے۔ اس مینار کے ساتھ یہ مجرمانہ سلوک کیا گیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے زمین ہموار کرنے کی خاطر سرکاری طور پر جگہ جگہ اجلاس اور سمپوزیم منعقد کیے گئے، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ قراردادِ پاکستان میں ایک نہیں دو مسلم مملکتوں کا ذکر تھا۔ یعنی برّصغیر میں مسلم اکثریت کے علاقے دو مسلم ریاستیں ہوں گی — یہ صحیح ہے کہ ذکر دو ہی ریاستوں کا تھا مگر یہ کہیں بھی تحریر نہیں کہ ایک مسلم ریاست دوسری سے الگ ہو کر بنگلہ دیش کہلائے گی اور قرارداد میں یہ بھی تحریر نہیں کہ ایک مسلم ریاست دوسری پر شہنشاہوں کی طرح حکمران ہو گی۔ مگر ۱۹۷۳ء کے دوران ابلاغ کے تمام تر ذرائع، ادیب اور صحافی اور کرائے کے مقررین یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے کہ قراردادِ پاکستان میں دو الگ الگ مُسلم ریاستوں کا ذکر تھا اور دوسری ریاست بنگلہ دیش کے نام سے اب وجود میں آئی ہے جسے تسلیم نہ کرنا قراردادِ پاکستان کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔

ہم قراردادِ پاکستان کو زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔ اس کی تحریر آئینے کی طرح شفاف اور واضح ہے۔ اِس وقت ضرورت یہ ہے کہ ان اسباب کا

تجزیہ کیا جائے جنہوں نے قرار دادِ پاکستان کو دو ٹکڑے کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا ہے کہ یہ اسباب ایک کھلا راز بن چکے ہیں۔ شہری اور فوجی جنگی قیدیوں کے علاوہ مشرقی پاکستان سے ہزاروں لوگ مختلف طریقوں اور راستوں سے مغربی پاکستان پہنچے تھے، جنگی قیدیوں اور اُدھر سے آنے والے دیگر لوگوں میں بے شمار ایسے تھے جو ملک کے سیاسی، معاشرتی اور فوجی حلقوں سے براہِ راست متعلق تھے۔ درونِ خانہ جو کچھ ہوتا رہا وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو سول اور ملٹری انٹیلی جنس سے وابستہ رہے تھے۔ ان میں وہ شہری رضاکار بھی شامل ہیں جو پاک فوج کی مدد کرتے رہے۔ یہ تمام لوگ جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچتی ہے سینوں میں دہکتے ہوئے انگارے لے کے آئے۔ ان کی زبانوں کو تالے لگا کر اور ان کے ہونٹ سی کر ان کے سینوں کے انگاروں کو ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے جو دیکھا اور ان پر جو گزری، انہوں نے ہر محفل میں ہر کسی کے ساتھ لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کی۔

فوج کے جنگی قیدی جن کے لیے حکم ہے کہ زبانیں بند رکھیں، چُپ نہ رہ سکے، انہوں نے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا، بھوکے پیاسے لڑے، ایمونیشن کے بغیر بھی لڑے اور پھر اتنے مجبور ہُوئے کہ ان کا جو دشمن ان سے دہشت زدہ رہتا تھا ان پر غالب آگیا۔ انہوں نے جنگی قید میں ذِلت اور رسوائی برداشت کی۔ انتہائی روح کُش اذیتوں اور صعوبتوں میں سے گزرے اور اس عزم سے جذبوں کو زندہ رکھا کہ وہ اس شکست کا جس کے وہ ذمّہ دار نہیں، انتقام لیں گے مگر وہ آزاد ہو کر اپنی سرحدمیں داخل ہُوئے تو اُن پر انکشاف ہُوا کہ یہاں بھی اُن کے لیے ذِلت و رُسوائی ہے۔ پچیس برسوں کی سیاسی لغزشوں اور جرائم کا بوجھ ان کے ضمیر پر ڈالا جا رہا ہے ___ فوجی ڈسپلن، احکام، قواعد و ضوابط اور ان کی خلاف ورزی کی سزا اپنی جگہ مسلّمہ ہے مگر انسانی فطرت ہر حال میں ہر ایک حکم کی تعمیل کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتی۔ بعض واقعات اور حادثات میں انسان کی فطرت کا ردِ عمل اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ احکامِ خداوندی کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ ہمارے فوجی بھائی بھی انسان تھے۔ اتنے بڑے حادثے کے ردِ عمل پر قابو نہ پاسکے۔

ان افسروں اور جوانوں کے ردِعمل پر کس طرح قابو پایا جاسکتا تھا جو زخمی حالت میں آئے۔ اُن سے جب زخموں کے متعلق پوچھا گیا تو ہر ایک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اصل زخم تو یہاں ہے اور اس زخم کا علاج انتقام ہے مگر ہم نے جب ان کے سینے کے زخم پر نمک چھڑکنا شروع کیا تو درد کی شدت نے ان کے منہ کھول دیئے اور زبانیں بے لگام کر دیں۔ فوجی احکام اور قواعد و ضوابط دھرے رہ گئے ___ آپ کسی سے اس جُرم کا اقبال کس طرح کرا سکتے ہیں جس کا ارتکاب اس نے نہیں کسی اور نے کیا ہے اور پھر کسی پر الزام عائد کر کے آپ اسے صفائی پیش کرنے سے کیونکر روک سکتے ہیں؟ وہ وردی اور چھاؤنی میں تو شاید منہ بند رکھے۔ شلوار قمیض پہن کر شہر میں آئے گا تو ڈسپلن کی تمام زنجیریں ٹوٹ جائیں گی کیونکہ انسانی نفسیات اُس لوہے سے بنی ہے جو فولاد کو کاٹ دیتا ہے۔

اس کے علاوہ ہماری پابندیاں اُن غیر ملکی رپورٹروں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی تھیں جن کی ایک فوج مشرقی پاکستان میں لمبے عرصے سے موجود تھی اور جن کی ملٹری ایکشن کے ابتدا میں بے عزتی کی گئی، اُن کے کیمروں سے فلمیں نکال کر بیکار کی گئیں اور انہیں دھکے دے کر مارشل لا ہیڈکوارٹر سے نکالا گیا تھا۔ وہ آج تک مشرقی پاکستان کی شکست کے اسباب تفصیل سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے ضخیم کتابیں بھی لکھیں، ہماری سیاسی اور فوجی لغزشوں کو بے نقاب کیا اور ان میں سے بعض کتابیں کچھ ایسی بے لاگ تھیں کہ ہمارے ہاں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پاکستانی ساری دنیا میں پھیلے ہُوئے ہیں۔ اُنہوں نے یہ کتابیں پڑھیں جو غیر جانبدار مبصروں اور شاہدوں نے لکھی ہیں۔ یہ سارا مواد پاکستان پہنچا اور راز فاش ہوتے چلے گئے۔

ہمارا دشمن بھی خاموش نہ رہ سکا۔ اُس کے جرنیلوں نے پریس کانفرنسوں میں، کتابوں میں اور انٹرویوز میں جہاں اپنے آپ کو بہادر اور فاتح کہا وہاں پاک فوج کو بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کیا اور یہاں تک کہا کہ اس مجبوری اور بے مائیگی کی حالت میں اتنے عرصے تک کوئی فوج اتنی دلیری سے لڑتی نہیں

دیکھی گئی جس طرح پاک فوج کی اتنی قلیل نفری لڑی —— بھارتی جرنیلوں اور وقائع نگاروں نے پاکستان کے اُن سیاسی لیڈروں کو بے نقاب کر دیا جو شکست کے ذمہ دار ہیں۔

ان تمام ذرائع کے سامنے ہماری رازدارانہ سرکاری پالیسی اور اسراریت کی مثال اُس عورت کی سی ہو گئی ہے جو بھرے بازار میں مادرزاد ننگی بیٹھی ہاتھوں سے اپنا ستر چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء سے اب تک اِن تمام ذرائع سے ہم نے جو مواد حاصل کیا ہے وہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ داستان چونکہ طویل ہے اس لیے اسے ہم نے کئی مضامین میں پھیلا دیا ہے۔ ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ راز کی بعض باتیں جو براہِ راست ملٹری پلاننگ اور اپنی دفاعی پالیسی سے متعلق ہیں اور جو فوجی راز کہلاتی ہیں، ان کا ہم ذکر نہیں کریں گے۔ شہریوں کو یہ راز معلوم کرنے کے لیے بے تاب نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کا افشا مُلک کے دفاع کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہم اُن سوالوں کا جواب پیش کریں گے جنہوں نے اختلافی موضوع کی صورت اختیار کر لی ہے اور جنہوں نے قوم کو پریشان کر رکھا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے، کیا یہ فوجی شکست تھی اور کیا اس کی ذمہ داری فوج پر عائد ہوتی ہے؟ دوسرا سوال یہ کہ، کیا اس شکست کے ذمہ دار جنرل نیازی اور ان کے ساتھی جرنیل ہیں؟ —— یہ صُورت کس قدر افسوسناک ہے کہ ہمارا دشمن ان سوالوں کا جواب "نہیں" میں دے رہا ہے اور ہمارے ہاں کہا جا رہا ہے کہ ہاں، یہ فوجی شکست ہے اور اس کی ذمہ داری فوج اور جنرل نیازی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ مجرم ضمیر کی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں ایک واضح حکم کی صُورت میں اسی روز ڈال دی گئی تھی جس روز جنگی قیدیوں کی آخری کھیپ پاکستان کے حوالے کی گئی تھی اور جس میں جنرل نیازی اور دیگر جرنیل آئے تھے۔ اُس روز ہم بھی سرکاری پاس پر وہاں گئے تھے۔ چند اور اخباری نمائندے بھی تھے جن میں دو غیر ملکی بھی تھے۔ ہم واہگہ گئے تو ہم تمام اخباری نمائندوں کو اپنے ایک میجر نے سپاہیوں کی طرح اپنے سامنے کھڑا کر کے یہ حکم سنایا کہ کسی جرنیل کے ساتھ ہم کوئی بات نہیں کر سکتے اور اگر کسی کو کسی جرنیل کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل ہی جائے تو وہ کوئی بھی بات کسی بھی شکل میں شائع نہیں کر سکتا۔ ہم تو حکم کے بندے تھے، سرِ تسلیم خم کر دیا۔ غیر ملکی رپورٹروں کے چہروں پر ہم نے مایوسی اور طنز کا جو تاثر دیکھا اس نے ہمیں بہت شرمسار کیا —— یہ رازداری نہ صرف بے معنی ہوتی ہے بلکہ عالمی برادری میں ملک کے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان کے معاملے میں تو ہمارے اس رویّے نے پاکستان کو بہت ہی رُسوا کیا ہے۔

فوج اس شکست کی ذمہ دار کہاں تک تھی؟ —— اس کا جواب ہم خود دینے کی بجائے فیلڈ مارشل مانک شا کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ڈیڑھ مہینہ گذرا بمبئی کے انگریزی جریدے "ڈیبونیئر" میں فیلڈ مارشل مانک شا کا ایک انٹرویو شائع ہُوا ہے جو ونود مہتہ نے قلمبند کیا ہے۔ مانک شا سے پوچھا گیا —— "پاکستانی کہتے ہیں کہ یہ جنگ ناقابلِ برداشت حد تک غیر متوازن تھی۔ یہ جنگ تو کوئی بھی جیت سکتا تھا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟" —— فیلڈ مارشل مانک شا نے جواب دیا —— "اگر آپ اسے اسی زاویے سے دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ جنگ غیر متوازن تھی۔ ہم بچپن کروڑ ہیں اور وہ بارہ کروڑ تھے۔ میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ وہ محاصرے میں تھے" —— اسی انٹرویو میں اُس نے یہ بھی کہا —— "وہ (پاکستانی) نہایت اچھے لڑنے والے فوجی ہیں اور وہ نہایت ہی اچھی طرح جنگ لڑے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ ہم جیسے غیر فوجی لوگ یہ رائے دیتے ہیں کہ انہوں نے (پاکستانیوں نے) کوئی قابلِ ذکر مقابلہ نہیں کیا، فیلڈ مارشل مانک شا نے کہا —— "نہیں وہ بڑی شدت سے لڑے۔ اگر وہ ایسی شدت سے نہ لڑتے تو ہماری تین ہزار نفری کس طرح ماری جاتی؟"

مانک شا نے اپنی فوج کی اموات کی تعداد بہت کم بتائی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق بھارتی فوج کی جو نفری ہلاک اور زخمی ہوئی اس کی تعداد

تیس ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ اس میں بھارت کی اُس کمانڈو فورس کے ہلاک اور زخمیوں کی تعداد شامل نہیں جو مکتی باہنی کے بہروپ میں مشرقی پاکستان میں کُھلی جنگ سے بہت پہلے داخل ہو گئی تھی۔

آگے چل کر فیلڈ مارشل مانک شا نے کہا ”ایک ایسا مرحلہ آگیا جہاں یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ پاکستانی ٹروپس میرے ٹروپس کے ہاتھوں بیکار ہو جائیں یا ہماری کمانڈو فورس کے ہاتھوں۔ اس مرحلے میں اُن کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ میرے آگے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ مکتی باہنی بھی ان کے خلاف جوابی اور انتقامی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ پھر بھی وہ (پاکستانی) غاروں میں چُھپ کے نہیں بیٹھ گئے تھے۔ وہ بڑی ہی سخت جنگ لڑے مگر ان کے لیے وہ مرحلہ آگیا جہاں انہیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ بھارتی فوج ان پہ غالب آگئی ہے اور جنگ جاری رکھنا دانشمندی نہیں۔“

فیلڈ مارشل مانک شا ہتھیار ڈلوانے کے لیے خود ڈھاکہ نہیں گیا تھا۔ ونود مہتہ نے اس سے پوچھا کہ وہ خود ڈھاکہ کیوں نہیں گیا تھا؟ مانک شا نے اس سوال کے جواب میں ایسا انکشاف کیا جو اُن پاکستانیوں کو چونکا دے گا جو اپنی فوج پر الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ نہیں لڑی یا یہ کہ تمام تر فوج نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ مانک شا نے کہا — ”میں اس لیے ڈھاکہ نہیں گیا کہ پاک آرمی کے تمام ٹروپس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے بلکہ یہ اس فوج کے ایک حصے کا سرینڈر تھا۔“

ہم اس سے پہلے ”حکایت“ میں بتا چکے ہیں کہ ہتھیار ڈلوانے کی شرائط کا مسودہ جنرل جیکب کے ہاتھ ڈھاکہ بھیجا گیا تھا۔ جنرل جیکب بھارتی نہیں یہودی ہے۔ وہ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کا چیف آف سٹاف تھا۔ اُسے گوریلا طریقِ جنگ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ گوریلا ٹریننگ اور اپریشن کے لیے اسے اسرائیل سے مستعار لیا گیا تھا۔ جنرل نیازی سے پہلی ملاقات کے لیے اسی کو ڈھاکہ بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ وہاں گیا تھا مگر فیلڈ مارشل مانک شا کو وہاں جانے کی جرأت نہ ہُوئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تمام پاکستانی ٹروپس نے ہتھیار

نہیں ڈالے۔ اس سے پہلے بھارت کا جنرل پَیلیت اپنی کتاب THE LIGHTNING CAMPAIGN میں بڑے ہی واضح الفاظ میں پاک فوج کے متعلق تمام غلط فہمیاں رفع کر چکا ہے۔ اُس نے لکھا ہے:

”ایک عام غلط فہمی ابتدا میں ہی صاف ہو جانی چاہیئے۔ ہر کوئی قیاس آرائیاں کر رہا ہے کہ پاکستان آرمی اجتماعی طور پہ کیوں مفلوج ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہُوا۔ اجتماعی طور پہ ہتھیار نہیں ڈالے گئے۔ بہت سے علاقوں پر مثلاً ہِلی، جمال پور، کھلنا اور دیگر کئی جگہوں پر دشمن (پاکستان) نے اتنا شدید مقابلہ کیا کہ ان جگہوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ایک فرد کو ہلاک کرنا پڑا۔ میمن سنگھ اور جیسور سے دشمن خود پیچھے ہٹ گیا اور پیچھے ہٹ کر شدت سے لڑا۔ ہتھیار ڈالنے کے اعلان کے وقت بھی بیناامتی (کومیلا)، کھلنا، دیناج پور، سید پور اور سلہٹ کے کچھ حصے پر پاک آرمی کا قبضہ تھا اگر ہماری (بھارتی) فوج اِن علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی تو لڑائی کئی اور ہفتے لڑی جاتی۔“

جنرل پَیلیت اس تجزیے میں آگے چل کر لکھتا ہے:

”ہماری اس کامیابی میں کچھ اخلاقی عناصر بھی کارفرما تھے جن میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ بھارت نے پاکستان آرمی کے خلاف لُوٹ مار، آبرو ریزی، قتلِ عام اور غیر انسانی تشدد کا پروپیگنڈہ اس قدر بڑھ چڑھ کر کیا تھا کہ پاکستان آرمی کے سب سے بڑے افسر سے لے کر معمولی سے سپاہی تک کی قدر و قیمت بحیثیت انسان ہر کسی کی نظروں میں ختم ہو گئی تھی۔ اس پروپیگنڈے سے انہیں انسانیت کے درجے سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس کا اثر ان کے مورال پر پڑا۔ دراصل پاکستانی آرمی کا بُت IMAGE توڑ دیا گیا تھا۔ جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے ان کی یونٹیں اور بریگیڈ

گروپ غضب اور قہر سے لڑے۔"

جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کی شکست کے اسباب یہ نہیں تھے کہ پاکستانی لڑ نہیں سکے۔ وجوہات کچھ اور تھیں۔ ہم آگے چل کر جب میدانِ جنگ کا ذکر کریں گے تو تفصیل سے بتائیں گے کہ "دیگر وجوہات" نے وہ کون سے جنگی حالات پیدا کر دیئے تھے جنہوں نے جنرل نیازی کو مجبور کر دیا کہ وہ اس دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیں جس کے پورے بریگیڈ کو انہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ میں صرف ایک پلٹن سے ظفروال کے میدان میں اس حال میں شکست دی تھی کہ بھارتی پلٹنوں کے چار کمانڈنگ آفیسر مارے گئے تھے۔ اُس وقت جنرل (اُس وقت بریگیڈیئر) نیازی کے پاس ایک بٹالین کے علاوہ اتنی سی جنگی قوت تھی کہ صرف چھ قدیم شرمن ٹینک تھے جن میں سے تین انجن پرانے ہونے کی وجہ سے رُک گئے تھے اور فیلڈ (چھوٹے) توپ خانے کی صرف ایک بیٹری تھی۔ اس کے مقابلے میں دشمن کی چار پلٹنیں، ٹینک رجمنٹ اور پورا توپ خانہ تھا۔ جنرل نیازی کی پلٹن ابھی مورچے بھی نہیں کھود سکی تھی کہ دشمن نے ان پر حملہ کر دیا اور حالت تقریباً محاصرے کی پیدا کر دی تھی۔ ہماری پلٹن مورچوں کے بغیر کھلے میدان میں لڑی اور دشمن کو صحیح معنوں میں شکستِ فاش دی۔ بہت سے قیدی پکڑے۔ بے شمار اسلحہ بارود ہاتھ آیا۔ دشمن کی اموات لاتعداد تھیں۔

تو پھر کیا بات تھی کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے انہی افسروں اور انہی جوانوں نے ہتھیار ڈال دیئے؟ — صرف اس لیے کہ یہ تصادم غیر متوازن تھا، غیر فوجی تھا اور جسے جنگ کہا جا رہا ہے وہ دراصل سیاسی معرکہ تھا جو بھارت نے جیت لیا اور جیت اس لیے لیا کہ ہمارے سیاسی لیڈر اور حکمران لغزشوں اور جرائم کے مجسمے تھے۔ جب کہ بھارتی سیاسی شعبدہ بازیوں میں ماہر تھے اور ان کے سامنے ایک واضح مقصد تھا، انہوں نے اپنی فوج کو بھی یہ مقصد ذہن نشین کرا دیا تھا اور اس کے مطابق اپنی فوج کی تمام تر جنگی ضروریات پوری کیں اور فوجی کمانڈروں پر اپنی ڈکٹیٹر شپ نہیں ٹھونسی۔ جس

بھارتی لشکر نے مشرقی پاکستان کو محاصرے میں لے کر حملہ کیا اس کی باگ ڈور نئی دلی میں نہیں کلکتہ کے فورٹ ولیم میں تھی۔ اِدھر ہماری قلیل اور بے مایہ فوج جس کے پاس نہ ٹینک تھے نہ طیارے نہ ضرورت کے مطابق توپ خانہ۔ اس کی باگ ڈور اسلام آباد میں تھی، ڈھاکہ میں نہیں تھی۔ فیلڈ مارشل مانک شا نے اپنے حالیہ انٹرویو میں جو بمبئی کے جریدے "ڈیبونیئر" میں شائع ہوا ہے، اس جنگ کے سیاسی پہلو کو صاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مانک شا سے پوچھا گیا — "کہا جاتا ہے کہ ہماری (بھارتی) افواج اس لیے بہتر طور پر لڑیں کہ ان کی کارکردگی مشین کی طرح رواں تھی۔ کیا یہ اس لیے تھا کہ آپ نے بحری اور ہوائی فوج کو بھی اپنے زیر کمان لے کر ان میں خصوصی اہلیت پیدا کر دی تھی؟" — مانک شا نے جواب دیا — "اگر مسلح افواج کو سیاسی مقاصد بالکل واضح کر کے انہیں احکامات دیئے جائیں تو ان کی کارکردگی اسی طرح بہتر ہو گی جس طرح ہماری تھی۔ ہمارے ذہن میں کوئی شک اور کوئی شبہ نہیں تھا۔ میں سب سے بڑا افسر تھا۔ مجھے وزیر اعظم کی طرف سے جو ہدایات ملتی تھیں وہ آئینے کی طرح صاف ہوتی تھیں.... ہم نے ان کے مطابق پاکستان سے جنگ سے بہت پہلے پلان بنا لیا تھا۔ ہم نے جو پلان بنایا تھا وہ معمولی اور غیر اہم سی تفصیلات تک مکمل تھا.... جہاں تک جنگی کارروائیوں کا تعلق تھا میرے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ اپنے سیاسی مقاصد اور خواہشات کے لیے ضروری تھا۔"

ان چند ایک اقتباسات سے جو ہم نے دشمن کے الفاظ میں پیش کیے ہیں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی شکست فوجی شکست نہیں تھی۔ فوج سیاست کا ہتھیار ہوتی ہے۔ اگر حریف ملک کے ساتھ سیاسی اور سفارتی سطح پر تنازعات طے نہ ہو سکیں تو فوج کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا یہ ہتھیار ہر لحاظ سے ضرب کاری لگانے کے قابل ہے یا اُس وقت تک اس کی دھار تیز رہے گی جب تک کہ ملک کے سیاسی مقاصد کے لیے ضروری ہے۔ مگر ہماری سیاست کی مثال اُس شکاری کی ہے جو بندوق اٹھاتے

شکار کھیلنے کے لیے جنگل میں گیا تو بھول ہی گیا کہ یہاں کیوں آیا تھا۔ جب اسے یہ یاد آیا کہ وہ شکار کھیلنے آیا ہے تو اُسے یہ بھی یاد آگیا کہ کارتوس تو وہ گھر بھول آیا ہے۔ اُس وقت وہ بندوق کو پتھروں پر مار مار کر غصہ ٹھنڈا کرنے لگا کہ سارا قصور بندوق کا ہے۔

قوم کو یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ اس المیے کا ذمہ دار کون تھا؟ ایک تو ہماری راولپنڈی کی ہائی کمان تھی جس میں یحییٰ خان، جنرل عبدالحمید خان، جنرل پیرزادہ (صدرِ مملکت کے پرنسپل آفیسر) جنرل گل حسن، جنرل غلام عمر (صدرِ مملکت کے مشیرِ خاص) اور جنرل ٹکا خان تھے۔ کیا شکست کی ذمہ داری ان جرنیلوں پر عائد ہوتی ہے؟ پھر جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان کے گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے اور ان کے مشیر برائے شہری امور جنرل فرمان علی تھے۔ کیا ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی؟ یا سارا الزام جنرل نیازی اور ان کے جرنیلوں پر عائد ہوتا ہے جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک لڑتے رہے؟ —— ان سوالوں کے جواب حمود الرحمٰن کمشن کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ قوم اپنی ہر حکومت سے بجا طور پر اس خلوص اور دیانتداری کی توقع رکھتی رہی ہے کہ حمود الرحمٰن کمشن کی تمام تر کارگزاری منظرِ عام پر لائی جائے۔ کسی کی حیثیت اور رتبے کا خیال نہ کیا جائے۔ اگر امریکہ کا صدر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو سکتا ہے تو اس مملکت میں تو زیادہ بہتر مثال قائم ہونی چاہیے جس کا ضابطہ حیات قرآن اور جس کا مذہب اسلام ہے۔

ان سوالوں کے بالکل صحیح اور غیر جانبدارانہ جواب کی ضرورت اس لیے شدید ہے کہ قوم کے دل میں جہاں اپنی افواج کے لیے محبت اور جذبہ ایثار تھا وہاں افواج کے خلاف وہم، وسوسے اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے تجربے کے بعد ہمارا دشمن اس کوشش میں مصروف ہو گیا تھا کہ پاکستانی قوم اور افواج کے اتحاد اور پیار کو ختم کر دیا جائے تو یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ٹوٹ سکتی ہے۔ ہمارے ہاں کی پردہ پوشیاں اس دیوار میں شگاف ڈال رہی ہیں۔ یہ ملک کے دفاع کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ قوم کو یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہماری فوج کس بے سروسامانی میں لڑی اور کتنا عرصہ کمک اور سپلائی کے بغیر لڑی۔

مشرقی پاکستان میں لڑنے اور ہتھیار ڈالنے والے جرنیلوں کے خلاف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ یحییٰ خان نے انہیں ہتھیار ڈالنے کا جو حکم بھیجا تھا، اسے وہ نہ مانتے، حکم عدولی کرتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر بھی فائر بندی کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی تعمیل کیوں کی گئی؟ اِدھر کے جرنیل شکر گڑھ اور راجستھان کا اتنا زیادہ علاقہ دشمن کو دے کر کیوں بیٹھ گئے تھے؟ کہنے کو تو تمام جرنیل کہتے ہیں کہ اِدھر فائر بندی نہیں ہونی چاہیے تھی، ہم جوابی حملے کے لیے تیار تھے مگر انہوں نے اپنے علاقے دشمن کو دے کر حکم کی تعمیل کی اور فائر بندی کر دی۔ ہمارا ایک بکتر بند ڈویژن، کچھ انفنٹری ڈویژن اور ایئر فورس کے چار لڑاکا بمبار سکواڈرن جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ اگر مشرقی محاذ پر حکم عدولی نہ کرنا الزام ہے تو یہ الزام مغربی محاذ کے جرنیلوں پر بھی عائد ہوتا ہے۔

میدانِ جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ کے آخری منظر سے وہ پردے اٹھانے سے پہلے جو ابھی تک نہیں اُٹھائے گئے، اس المیے کے سیاسی پہلو کے متعلق چند باتیں کہہ دینا ضروری ہے۔ مغربی پاکستان کی نسبت مشرقی پاکستان کو عالمی سیاست میں اہم اور بڑا ہی نازک مقام حاصل رہا ہے۔ بھارت نے نہ تو مغربی پاکستان کو تسلیم کیا تھا نہ مشرقی پاکستان کو۔ بھارتیوں نے آج تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا نہ کریں گے۔ پنڈت نہرو نے پاکستان کو بھارت میں مدغم کر لینے کے عزم کا اظہار واضح الفاظ میں کر دیا تھا۔ لہٰذا بھارت کی سیاسی اور جنگی پالیسی اسی عزم کے گرد گھومتی رہی۔ مشرقی پاکستان کے متعلق اس نے صاف الفاظ میں ہدایات جاری کر دی تھیں کہ اس خطے کو ثقافتی اور معاشرتی حملے سے فتح کیا جائے، چنانچہ ان ہدایات پر فوری طور پر عمل شروع کر دیا گیا۔ وہاں کی سرحدوں کا تعین ایسا ہوا کہ سرحدی دیہات اور کھیتیاں گڈمڈ ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اِدھر اُدھر میل جول عام رہنے کی وجہ سے یہ سرحد ذہنوں میں نقش نہ ہو سکی۔ سرحد کا تصور ہی پیدا نہ ہوا۔ اس سے نہ صرف اشیا کی سمگلنگ آسان

ہوگئی بلکہ ہندو کے سیاسی، مذہبی اور ثقافتی نظریات بھی ہمکنار ہوتے رہے۔

مغربی پاکستان سے تو ہندو ۱۹۴۷ء میں بھارت چلے گئے۔ مشرقی پاکستان سے وہاں کے ہندو باشندے نہ نکلے۔ تجارتی اور ثقافتی اداروں پر ان کا قبضہ قائم رہا۔ پھر وہ تعلیمی اداروں میں استادوں، لیکچراروں اور پروفیسروں کی حیثیت سے داخل ہونے لگے۔ انہیں بازو پھیلا کر گلے لگایا گیا۔ سکولوں کالجوں میں آکر انہوں نے بنگالی طلبا میں بنگالی قومیت کا جذبہ بیدار کرنا شروع کر دیا۔ اُدھر آل انڈیا ریڈیو کے کلکتہ سٹیشن کو اتنا طاقتور بنا دیا گیا کہ اس کی آواز مشرقی پاکستان کے دُور دراز گوشوں تک پہنچتی تھی۔ وہاں سے پاکستان کے خلاف اور ہندو مسلم بھائی چارے کا پروپیگنڈہ نشر ہونے لگا۔ سرحدی دیہات میں ہی نہیں بلکہ سرحدی ضلعوں میں بھارت کے اخبار صبح سویرے سویرے پہنچ جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے ہندو باشندوں کو خاص طور پر ہدایت دی گئی تھی کہ وہ بنگالی مسلمانوں کو سینے سے لگائے رکھیں اور انہیں پیار اور محبت کی زنجیروں میں باندھ لیں۔

یہ ایک یلغار تھی جسے روکنے کے لیے ہماری طرف کوئی مورچہ بندی نہیں تھی بلکہ ہمارا رویہ ایسا تھا جس نے بھارتی پروپیگنڈے کو ہی تقویت دی۔ بھارت سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں جا آباد ہوئے۔ ان میں اکثریت بہار کے مسلمانوں کی تھی۔ ان مسلمانوں نے اپنے آپ کو پاکستانی تو کہلایا مگر بنگالی ثقافت، معاشرت اور وہاں کے دیگر احوال و کوائف کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بنگالیوں سے دو ہاتھ دُور ہی رکھا اور ان پر اپنی برتری ٹھونستے چلے گئے۔ بنگالی مسلمان انگریزوں کے دَور سے محرومی اور کمتری کے احساس کا شکار چلا آرہا تھا۔ ان پر فوجی بھرتی کے دروازے بند تھے۔ شہری انتظامیہ میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ انہیں تیتو میر کے جذبۂ جہاد کی سزا دی جا رہی تھی۔ انہیں اُن اوّلین مجاہدوں کی حریت پسندی کی سزا دی جا رہی تھی جو بنگال سے صوبہ سرحد میں جا کر سید احمد شہیدؒ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر انگریزوں اور سکھوں کے خلاف لڑے تھے۔ بنگالی مسلمان فطرتاً جنگجو تھے لیکن انگریزوں نے انہیں غیر جنگجو قرار دے کر کسان اور ماہی گیر بنا دیا۔ کسان بھی ایسی کھیتیوں کا جو نشیب میں ہوں تو جھیلیں بن جاتی ہیں اور بلندی پر ہوں تو پانی سے محروم رہتی ہیں۔

مشرقی پاکستان ندیوں، نالوں، دریاؤں، دلدلی جنگلوں اور دشوار گزار علاقوں پر مشتمل خطہ ہے جہاں زندہ رہنے کے لیے جنگلی جانوروں کی طرح جدوجہد کرنی پڑتی ہے، جو کسر رہ جاتی ہے وہ دریائی سیلاب اور سمندری طوفان پوری کر دیتے ہیں۔ ان حالات اور ایسی دشوار زندگی نے بنگالی مسلمانوں کو محرومی اور کسمپرسی کا شکار بنا دیا۔ جن کے ہاتھ دولت یا حکومت آئی وہ شہروں میں آباد ہو گئے اور اپنی دنیا دیہاتی باشندوں سے الگ تھلگ بسالی۔ یہ تھی بادشاہوں کی دنیا۔ اصل قوم قدرت کی صعوبتیں جھیل رہی تھی۔ چنانچہ مشرقی پاکستان کا معاشرہ دو ایسے حصوں میں تقسیم ہو گیا جس کا تصوّر مغربی پاکستان والے ذہن میں لا ہی نہیں سکتے۔ مغربی پاکستان میں تو لوگ امیر ہیں یا غریب مگر مشرقی پاکستان میں اکثریت تباہ حال تھی اور اقلیت خوشحال۔ آزادی ملی بھی تو اکثریت کے معیارِ زندگی کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اکثریت بدحال ہی رہی اور اقلیت خوشحال تر ہونے لگی۔ جھگیاں اور ان کے مکین سیلابوں میں ڈوبتے اور طوفانوں میں تباہ ہوتے رہے اور ڈھاکہ میں نئی طرز کی عمارتیں اس غریب سرزمین سے اُبھرنے اور اُوپر ہی اُوپر اُٹھنے لگیں۔ اخباری بیان داغنے جانے لگے مگر وزیروں کے بیانوں سے نہ سیلابوں کے آگے بند بندھے نہ طوفانوں کا زور تھما۔ سیاسی بازیگروں نے وہاں کے عوام کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہمارے ساتھ اِدھر ہوتا ہے۔

بھارت سے جو مسلمان ہجرت کر کے وہاں گئے وہ شہروں میں آباد ہوئے۔ انہوں نے بنگالیوں کو اچھوت سمجھا۔ تجارتی میدان میں ہندوؤں کو نیچا دکھانے کی بجائے ہندوؤں سے اشتراک کیا اور پیسہ کمایا۔ پکے مکانوں کی بستیاں بسائیں اور بنگالیوں سے الگ تھلگ رہے۔ پاکستان کی راجدھانی پہلے کراچی میں تھی پھر اسلام آباد بنی۔ یہاں سے جب صدر اور وزیراعظم مشرقی پاکستان کے دورے

پر جاتے تھے تو وہ مہاراجوں اور نوابوں کی شان سے جاتے تھے۔ بڑے شہروں میں پولیس اور حاشیہ برداروں کے جلوس میں سجی سجائی سڑکوں سے گزرتے۔ پھر ایک دو بیان داغ کر اور دعوتیں اُڑا کر واپس آ جاتے تھے۔ وہاں کچھ کارخانے لگائے گئے مگر کسانوں اور ہر وقت سیلابوں کے خطرے میں رہنے والے دیہاتیوں کے لیے کچھ نہ کیا گیا، سوائے اس کے کہ ہر سیلاب کی تباہی کے بعد مرکز سے چند لاکھ روپے خیرات کے انداز سے بھیجے گئے مگر وہ بھی شہروں میں رہے۔ اس خیرات کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنایا گیا۔ قدرتی آفات سے بچاؤ کے لیے اور سمندری طوفان کو روکنے کے لیے ترقیاتی منصوبے موجود تھے۔ ان کے نام پر دوسرے ممالک سے قرضے بھی لیے گئے مگر کسی بھی منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔

بھارت وہاں کے عوام کی اس کیفیت اور حاکموں کی فرعونیت کو پروپیگنڈے میں استعمال کرتا رہا۔ آل انڈیا ریڈیو کے مقابلے میں ریڈیو پاکستان کا ڈھاکہ سٹیشن اپنی حکومت اور حکمرانوں کا ہی پروپیگنڈہ کرتا رہا۔ یہی حال اخباروں کا تھا۔ ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن اس قدر کمزور تھا کہ اس کی آواز ڈھاکہ کے مضافات میں بھی مشکل سے سُنی جاتی تھی۔ لوگ کلکتہ ریڈیو سنتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی صورت بالکل وہی تھی جو ہمیشہ ہمارے ہاں رہی ہے اور آج کل زیادہ ہے۔ یعنی قوم روز بروز تنگدست اور بدحال ہوتی چلی جا رہی ہے مگر ٹی وی، ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے خوشحالی کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف ملکی دفاع کے بلند بانگ دعوے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف دوسرے ملکوں سے ہتھیاروں کی بھیک مانگی جا رہی ہے اور ان سے وعدے لیے جا رہے ہیں کہ وہ ہمارے ملک کا دفاع کریں گے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو ملک ہمارے ملک کا دفاع کرے گا وہ ہم سے کچھ لے گا بھی اور یہ قیمت قوم کے وقار کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی۔ بالکل یہی عالم مشرقی پاکستان پر طاری رہا اور سیاسی لیڈر اقتدار کی جنگ میں مصروف رہے۔ وہاں کی اسمبلی غنڈہ گردی کا اکھاڑہ بن گئی۔ حد یہ کہ سپیکر کو اسمبلی ہال میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل کوئی جرائم پیشہ غنڈے نہیں، اسمبلی کے ممبر اور وزیر تھے۔

ہندو تعلیمی اداروں میں بنگالی نوجوانوں کو بنگالی قومیت اور ہندوازم کے سبق دیتا رہا۔ ہمارے مذہبی سربراہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مشرقی پاکستان میں مذہب کی گرفت زیادہ مضبوط رہی ہے۔ ڈھاکہ کو مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ وہاں مذہبی ادارے بھی تھے مگر یہ مذہب مُلّا کا تھا۔ یہ چندے جمع کرنے اور صرف نماز روزے کی تلقین کرنے والا مذہب تھا۔ مُلّائیت وہاں کی مخلوق کو زندہ و بیدار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ بیداری اس کی مذہبی اجارہ داری کو ختم کر دے گی۔ لہٰذا مذہب کے اِن ٹھیکیداروں نے بھی مسجدوں اور دیگر مذہبی اداروں سے نکل کر اور قومی سطح پر آ کر نہ دیکھا کہ ہندو کا زہر کس تیزی سے قوم کی جڑوں میں اُترتا جا رہا ہے۔ تعلیمی اداروں کی طرف بھی کسی نے توجہ نہ دی۔ نصابی کتابیں کلکتہ سے بھی چھپ کر آتی رہیں۔ اُردو کے ایک قاعدے میں اس قسم کے فقرے شامل تھے — "رام اچھا لڑکا ہے۔ رحیم بُرا لڑکا ہے" — اور اس طرح بظاہر بے ضرر اور محسوس نہ ہونے والے طریقوں سے مسلمان بچوں کی برین واشنگ ہوتی رہی۔

دفاع کی حالت بھی یہی تھی۔ ڈھاکہ میں صرف ایک ہوائی اڈہ بنایا گیا۔ فضائیہ کا وہاں صرف ایک سکواڈرن رکھا گیا۔ فوج بھی کم رکھی گئی اور بحریہ بھی برائے نام، حالانکہ وہ ہمارے ملک کا ایسا حصہ تھا جہاں ضرورت کے وقت افواج پہنچانا ناممکن ہو سکتا تھا اور ہُوا بھی۔ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان کی نسبت زیادہ مستحکم ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ تین اطراف سے دشمن کے نرغے میں تھا۔ جنگی امور کی ذرا سی بھی سُوجھ بوجھ رکھنے والا ذہن سمجھ سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جب بھی جنگ ہو گی محاصرے کی صُورت میں ہو گی۔ لہٰذا اس جنگی صورت کے مطابق وہاں راشن، ایمونیشن اسلحہ ہر وقت موجود رہنا چاہیئے تھا۔ پاکستان کی دفاعی پالیسی ابتدا سے یہ رہی ہے کہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صُورت میں مشرقی پاکستان میں صرف دفاعی جنگ لڑی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ دشمن کسی علاقے پر قبضہ نہ کر سکے۔ مغربی پاکستان سے زوردار حملہ کیا جائے گا تاکہ دشمن مشرقی پاکستان سے توجہ

ہٹالے اور کوشش یہ کی جائے گی کہ مغربی پاکستان کی طرف سے دشمن کے خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے جسے سودا بازی کے لیے استعمال کیا جائے مگر اس پالیسی کے مطابق مشرقی پاکستان میں لمبے عرصے کے محاصرے میں لڑنے کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔

مشرقی پاکستان کو سب سے بڑا خطرہ بھارت سے تھا جسے اچھی طرح جانتے ہوئے بھی ہم اسے نظر انداز کرتے رہے۔ دوسرا خطرہ امریکہ اور روس سے تھا جسے ہمارے بادشاہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ جب سے چین ایک عالمی طاقت بنا ہے، امریکہ اور روس اُس کے خلاف مورچہ بندی میں مصروف ہیں۔

امریکہ اور روس ایک دوسرے کے دشمن ہیں لیکن چین کے معاملے میں دونوں دوست بن جاتے ہیں کیونکہ وہ چین کو اپنا مشترک دشمن سمجھتے ہیں۔ چین کے خلاف مورچہ بندی کے لیے دونوں کو افغانستان سے انڈونیشیا تک کے ممالک کو اپنے زیرِ اثر رکھنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف اِن ممالک کو زیرِ اثر رکھیں۔ چنانچہ ایک لمبے عرصے سے دونوں میں ان ممالک کو اپنی گرفت میں لینے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ انڈونیشیا (احمد سوئیکارنو مرحوم کی صدارت میں) روس کے زیرِ اثر تھا۔ افغانستان بھی روس کے گھڑے کی مچھلی تھا۔ برما میں دونوں بازو متصادم تھے۔ پاکستان اور بھارت امریکہ کے قدموں میں بیٹھے ہُوئے تھے مگر ۱۹۶۲ء میں چین اور بھارت کی جنگ کے بعد پاکستان اور چین کی دوستی کے چرچے ہونے لگے۔ امریکہ چونکا۔ اُس نے غالباً یہ سوچ کر کہ پاکستان ہاتھ سے جا رہا ہے، مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

اُس وقت تک بھارت مشرقی پاکستان میں اپنی چالوں اور پروپیگنڈے سے اور ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں سے اپنا اثر و رسوخ پیدا کر چکا تھا لہٰذا امریکہ نے اس معاملے میں بھارت کی پُشت پناہی کی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ تک امریکہ، روس اور بھارت پاکستان کو کمزور ملک اور پاکستانی قوم کو سیاسی طور پر انتشار کا اور معاشی طور پر بدحالی کا مریض سمجھتے رہے مگر جنگِ ستمبر میں

پاکستانی قوم نے جس غیظ و غضب سے ملّی جذبے کا اظہار کیا وہ صرف پاکستان کے دشمنوں کے لیے ہی نہیں خود پاکستانیوں کے لیے حیران کُن انکشاف تھا۔ پاک فوج نے جب چھمب سیکٹر پر حملہ کیا تو امریکہ اور روس نے حکومتِ پاکستان کو یقین دلایا تھا کہ بھارت بین الاقوامی سرحد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یعنی وہ پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ اُس وقت کی حکومت نے بھی پورے وثوق اور اعتماد سے جنرل سرفراز خان سے کہا تھا کہ لاہور کی سرحد کو کوئی خطرہ نہیں کیونکہ امریکہ اور روس نے ضمانت دی ہے۔ جنرل سرفراز خان جو لاہور کے دفاعی ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ تھے یہاں تک کہتے ہیں کہ انہیں حکومت کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ اپنے ڈویژن کو بارکوں میں رکھیں۔ پیش بندی کے طور پر سرحد پر مورچہ بند کرنے کی ضرورت نہیں۔

بھارت نے ۶ ستمبر کی صبح پاکستان پر حملہ کر دیا۔ سابق صدر ایوب خان مرحوم نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ امریکہ نے ایک طرف تو یہ یقین دلایا تھا کہ بھارت سرحد کا احترام کرے گا مگر دوسری طرف حملہ ہوتے ہی کراچی سے امریکی سفیر نے ایوب خان سے ٹیلیفون پر کہا —— ”اب تم لوگ کیا کرو گے؟ بھارت تو طاقتور ملک ہے“ —— سفیر کے لہجے میں طنز اور چیلنج تھا۔ ایوب نے کہا —— ”مجھے امید ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود ہی بچا لیں گے“ —— تب یہ انکشاف ہُوا کہ اس جنگ میں امریکہ بھارت کے ساتھ تھا۔ امریکہ نے بظاہر دونوں ملکوں کی فوجی اور دیگر امداد بند کر دی تھی مگر کھیم کرن سے بھارتی فوج جو اسلحہ بارود چھوڑ کر بھاگی، اس میں ایمونیشن کے بہت سے ایسے بھرے ہُوئے بکس ملے جن پر لکھا تھا۔ SHIP TO PAKISTAN ”پاکستان کو بھیجے جائیں“ —— یعنی یہ بکس پاکستان کو بھیجنے کے لیے امریکہ میں رکھے تھے مگر جنگ شروع ہو گئی تو یہی بکس اس عجلت میں بھارت کو بھیج دیئے گئے کہ ان پر پاکستان کی جگہ انڈیا بھی نہ لکھا گیا۔ ایسی کئی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں پاکستان میں مقیم امریکیوں نے بھارتی طیاروں کی راہنمائی کی اور بھارتی انٹیلی جنس کو مدد دی۔

امریکہ کے اخبار رسالوں نے پاکستان کو شکست خوردہ کہا اور بھارتیوں

کے مورال کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ وہاں کے دو بین الاقوامی طور پر پڑھے جانے والے جریدوں "ٹائم" اور "نیوز ویک" نے بڑی کاوش اور ڈھٹائی سے بھارت نوازی کی اور پاکستان کو رسوا کیا۔ سیالکوٹ کی ایک عمارت کی تصویر جو بھارتی بمباری سے تباہ ہوئی تھی، اپنے پرچوں میں چھاپ کر نیچے لکھا کہ یہ بھارت کا ایک ہسپتال ہے جس پر پاکستانی طیاروں نے بمباری کی ہے۔ دریائے توی میں پڑے ہوئے بھارتی فوج کے دو ٹینکوں اور دو ٹرکوں کی تصویر چھاپ کر لکھا کہ یہ پاکستانی آرمی بھاگتے ہوئے پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

بھارت نے مشرقی پاکستان پر صرف ایک ہوائی حملہ کیا۔ ہمارے شاہبازوں نے جوابی حملہ کر کے ایک ہی بار بھارت کے تیرہ لڑاکا بمبار طیارے تباہ کر کے اپنی برتری ثابت کر دی۔ ہر لمحہ توقع تھی کہ بھارت مشرقی پاکستان پر بری فوج سے بھی حملہ کرے گا مگر اس نے کوئی حملہ نہ کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چین بھارت کے سر پر گرج رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پاک افواج نے مغربی پاکستان کے فرنٹ پر اپنی اسی دفاعی پالیسی پر عمل کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں صرف دفاع اور مغربی پاکستان سے شدید جارحیت۔ اس پالیسی کے تحت کشمیر میں بہت سا علاقہ لے لیا گیا۔ کھیم کرن سیکٹر میں اور راجستھان سیکٹر میں بے شمار علاقہ لے لیا گیا۔ چونڈہ میں بھارت کے آہنی غرور کے پرخچے اڑا دیئے گئے اور وہاں سے ایک وسیع پیمانے کے جوابی حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ فائر بندی ہو گئی۔ تیسری وجہ یہ بھی تھی کہ بھارت نے بڑی محنت اور لگن سے مشرقی پاکستان کے عوام میں اپنی محبت پیدا کی تھی۔ بھارت وہاں فوج کشی کر کے وہ چھری اپنی بغل میں ہی چھپائے رکھنا چاہتا تھا جو اس نے "رام رام" کا جاپ کرتے ١٩٧١ء میں نکالی اور مشرقی پاکستان کے گلے پر پھیر دی۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ پاکستان کی افواج اور قوم نے امریکہ اور روس پر ثابت کر دیا ـــــ آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا ـــــ چنانچہ امریکہ نے اپنا طریقہ واردات بدلا اور مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف منافرت پھیلانے لگا۔ جنگ ستمبر کے فوراً بعد اس کے جریدے "ٹائم" نے ایک طویل رپورٹ شائع کی جس میں بے بنیاد اعداد و شمار کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان دو متضاد خطے ہیں۔ دونوں کی زبان الگ، کلچر الگ، عادات الگ اور نظریات الگ ہیں۔ حد یہ کہ دونوں کا مذہب ایک ہے مگر یہ مذہب صرف مشرقی پاکستان میں ہے، مغربی پاکستان تو مذہب بھی ترک کر چکا ہے۔ "ٹائم" نے یہاں تک لکھا کہ جنگ میں مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کا کوئی دفاع نہیں کیا اور اسے بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یہ بھارت کی کشادہ ظرفی اور کرم نوازی ہے کہ اس نے مشرقی پاکستانیوں کو پریشان نہیں کیا۔

مختصر یہ کہ امریکہ نے "ٹائم" کی زبانی مشرقی پاکستان کے متعلق اپنی ذہنیت واضح کر دی اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسے بنگالی مسلمان کو آلہ کار بنایا جس کا کوئی دین اور کوئی مذہب نہیں تھا اور جو نوجوان طبقے میں جوشیلی تقریروں کی وجہ سے مقبول تھا۔ یہ تھا شیخ مجیب الرحمٰن ـــــ امریکہ نے بھارت کو شہ دی اور مجیب کو بھارت کا کٹھ پتلی بنا دیا۔ اس نے بنگالی قومیت کو ہوا دی اور نوجوان طبقے کی فطری خودسری اور سرکشی کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ مجیب نے بھارت کے ساتھ سودا بازی کر لی۔ ادھر اس کے گروہ نے جو راولپنڈی میں وزارت دفاع میں ملازم تھا، کچھ انتہائی خفیہ فائلیں چرائیں۔ نیشنل پارک میں یہ فائلیں بھارت کے ایک سفارتی نمائندے کے حوالے کرتے ہوئے دو تین بنگالی مسلمان پکڑے گئے۔ ادھر مجیب الرحمٰن اگرتلا میں ملک کے خلاف سازش میں پکڑا گیا۔ اس کے راولپنڈی والے گروہ کے خلاف ٢٦٩ گواہ گزرے اور انہیں لمبی قید کی سزائیں دی گئیں۔ انہی شہادتوں نے مجیب الرحمٰن کا جرم بھی ثابت کر دیا مگر اس کے مقدمے کی سماعت الگ ہو رہی تھی۔

اس دوران ایوب خان کی حکومت کا زوال اس قدر تیزی سے شروع ہوا کہ ایوب خان جیسا جابر حکمران بھی بوکھلا گیا۔ اس نے اسلام آباد میں گول میز کانفرنس بلائی جس میں تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو مدعو کیا گیا۔ ان میں مضبوط پارٹیاں [illegible] امریکہ کی پروردہ تھیں۔ ان کے [illegible]

رہا کر کے کانفرنس میں شریک کیا جائے بلکہ اُس کے خلاف سازش کا جو الزام ہے
وہ واپس لے کر اُسے بری قرار دیا جائے — کہا جاتا ہے کہ مجیب کو امریکہ کے
دباؤ سے چھوڑا گیا تھا مگر یہ دباؤ ڈالنے والے ہمارے اپنے سیاسی لیڈر تھے۔
اُن کے پیشِ نظر سیاسی مفاد پرستی تھی۔ انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ مجیب کے
چھ نکات علیحدگی کی تحریک کے منشور کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کی حمایت اور وکالت
ایسی شدت سے کی کہ ایوب خان نے مجیب کو رہا کر کے کانفرنس میں بلا لیا۔ یہ ایک
بے حد خطرناک سیاسی لغزش تھی۔ ہمارے سیاسی لیڈر اقتدار میں ہوں یا حزبِ
اختلاف میں، اُن کا کردار ملک کے لیے ہمیشہ خطرناک رہا ہے۔ گول میز کانفرنس
میں ہر پارٹی کی یہی ایک خواہش تھی کہ ایوب خان اقتدار اُس کے حوالے کر جائے۔
وہ مشرقی پاکستان کو اقتدار کی قیمت کے طور پر دینے کو تیار تھے۔

مجیب اپنے ساتھ علیحدگی کی دستاویز لے کر آیا اور کچھ اس قسم کا مطالبہ
پیش کیا کہ مشرقی پاکستان اُس کے حوالے کر دیا جائے، مغربی پاکستان میں جو چاہو
سو کرو۔ ایوب خان یہ کہہ کر کہ میں اُس کانفرنس کی صدارت نہیں کر سکتا جس میں
ملک کے ٹکڑے کرنے کی تجاویز پیش ہو رہی ہوں، کانفرنس روم سے باہر
نکل گیا۔ پھر ملک میں ایک اور سیاسی لغزش کا ارتکاب ہُوا۔ ایوب خان اقتدار
یحییٰ خان کو سونپ کر اور ملک فوج کے حوالے کر کے الگ ہو گیا۔ یحییٰ خان سے
کسی بھلے کی نہیں بلکہ ہر برائی کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اُس نے امریکہ کے ہاتھوں
میں کھیلتے ہوئے ملک کو اس انداز سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا کہ ون یونٹ توڑ کر
صوبے بحال کر دیئے۔ امریکہ کو پاکستان کا ایسا بدکردار اور جاہل حکمران کبھی نہیں
مِلا تھا۔ اُس نے اسے اپنے منصوبے میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔

روس کہاں برداشت کر سکتا تھا کہ اس خطے میں امریکہ کا عمل دخل ہو۔
وہ کچھ عرصے سے "عظیم بنگال" GREATER BENGAL کے منصوبے پر عمل پیرا
تھا۔ اُس کے منصوبے میں "عظیم بنگال" یا وسیع تر بنگال میں مشرقی اور مغربی
بنگال، آسام اور برما کے مسلم اکثریت کے علاقے اکیاب اور اراکان وغیرہ شامل
تھے۔ مغربی بنگال میں اُس کے کرائے کے کمیونسٹ دہشت گردی اور بدنظمی

پھیلانے میں مصروف تھے۔ اِن مسلم علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے وہ مسلمان
ایجنٹوں کے ذریعے اسلامی نظریات کو حربے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔
بھارت نے مشرقی پاکستان میں اپنے عزائم کے لیے زمین ہموار کر رکھی تھی۔ اُس
نے ہماری سیاسی لغزشوں اور عوام کے ساتھ ہمارے حکمرانوں کے بُرے سلوک اور
بے رُخی کو کھاد کے طور پر استعمال کیا۔ ہم نے مشرقی پاکستان کو غیر ملکی سازشوں اور
علیحدگی پسندی کی تحریک کے لیے زرخیز زمین بنا رکھا تھا۔ ملک کے حکمران اسلام آباد
میں عیش وعشرت میں مصروف رہے اور مشرقی پاکستان کے حاکم ڈھاکہ میں مست
رہے۔ قوم کی نبض پر کسی نے بھی ہاتھ نہ رکھا۔ قوم کے قریب کوئی گیا ہی نہیں۔
شیخ مجیب الرحمٰن کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ ہماری طرف سے کوئی اچھی یا بُری
انسدادی کارروائی نہ ہُوئی۔

ہر قوم اور ملک کا ایک مرکزی نظریہ ہوتا ہے۔ اُس کی سیاست، مذہب
اور معاشرت اسی پر مرکوز رہتی ہے۔ اِس مرکزی نظریئے کو آپ
CENTRE OF GRAVITY کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً جنگِ عظیم دوم والے جرمنی میں
ہٹلر مرکزی نقطہ اور نظریہ تھا۔ پاکستان میں اسلام، بھارت میں گاندھی اور
مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت غالب آگئی تھی۔ عوام جو سیلابوں میں ڈوبتے
اور بھوک سے بلبلاتے رہتے تھے، وہ صرف روٹی اور چاول کو بنگالی قومیت سمجھتے
تھے۔ شہروں میں رہنے والے بنگالی غیر بنگالیوں سے نفرت کو بنگالی قومیت کہتے
تھے۔ اور ان کے لیڈروں کے ہاں بنگالی قومیت کا نعرہ سیاسی مفاد پرستی کا ایک حربہ
تھا۔ بہرحال بھارت، امریکہ اور روس اپنے اپنے مفادات کی خاطر وہاں بنگالی قومیت
کا پودا سینچ رہے تھے جو تیزی سے تناور درخت بنتا جا رہا تھا۔ مجیب رہا ہو چکا
تھا۔ سازش کا جُرم بخش دیا گیا تھا۔ بھارت نے کھُلم کھُلا اُس کی پشت پناہی شروع
کر دی۔ مجیب نے واضح الفاظ میں علیحدگی بلکہ آزادی کی باتیں شروع کر دیں۔

بھارت کے متعلق یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ ہندو کبھی بھی
مسلمان کو کسی میدان میں شکست نہیں دے سکا۔ مسلمان نے اُسے
ہمیشہ اپنے قدموں میں بٹھائے رکھا ہے۔ ہندو نے مسلمان کو جب

بھی نقصان پہنچایا عیاری اور مکاری سے پہنچایا۔ مسلمان کو شکست دینے کے لیے ہندو آسان ترکیبیں سوچتا رہا ہے۔ وہ آسان فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پاکستانی لیڈروں نے اُسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ بنگالی مسلمانوں کے ساتھ ہندو کو ذرہ بھر ہمدردی نہیں تھی۔ وہ انہیں آسان فتح کے لیے آلۂ کار بنا رہا تھا۔

یحییٰ خان نے مارشل لا کی سنگینوں کے سائے میں جمہوریت کا نعرہ لگایا۔ ایئر مارشل اصغر خان اور بھٹو نے قوم میں مقبولیت حاصل کر لی لیکن یہ اتحاد دو متضاد کیمپوں میں تقسیم ہو گیا۔ بھٹو سوشلزم کا جھنڈا اور روٹی کپڑے کا نعرہ لے کر نکلا اور اصغر خان دائیں بازو میں مورچہ بند ہو گیا۔ یحییٰ خان نے جب انتخابات کا اعلان کیا تو کسی کو توقع نہیں تھی کہ انتخابات دیانتداری سے کرائے جائیں گے۔ پیپلز پارٹی کی حریف پارٹیوں کے لیڈر یحییٰ خان کے دربار میں سجدے کرنے لگے۔ وہ اقتدار کے خواہاں تھے۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یحییٰ خان گدی کسی کے حوالے کر کے تارک الدنیا ہو رہا ہے۔ مگر اُس نے ایسے غیر جانبدار انتخابات کرائے جو اس ملک کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ مغربی پاکستان کے محرومیوں، مفلسی اور بے انصافی کے شکار عوام نے پیپلز پارٹی کے نعرے میں زیادہ کشش دیکھی۔ ان میں اُن لوگوں کی کمی نہیں تھی جنہیں بھٹو کا یہی ایک وعدہ بھا گیا کہ وہ فیکٹریوں کے مالک ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پھر وہ محنت اور مشقت نہیں کیا کریں گے۔

مشرقی پاکستان میں مجیب نے مغربی پاکستان سے اپنا پورا حق لینے یا دوسری صورت میں آزادی کا نعرہ لگایا۔ اُس وقت اُردو اور غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت دلوں کی گہرائیوں تک اُتار دی گئی تھی۔ مغربی پاکستان سے اگر کچھ محبت رہ گئی تھی تو وہ نومبر ۱۹۷۰ء کے سمندری طوفان میں غرق ہو گئی جس نے بیس لاکھ بنگالیوں کو بیوی بچوں اور گھروندوں سمیت ہڑپ کر لیا۔ خلیج بنگال میں لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ خشکی پر میل ہا میل کی وسعت میں لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بیس لاکھ مشرقی پاکستانی لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ دو ہی سال پہلے ایوب خان مرحوم نے دس سالہ ترقی کا جشن منایا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ڈھاکہ گیا تو صرف ڈھاکہ میں برقی چراغاں کا جو انتظام کیا گیا تھا اس پر تیس لاکھ روپیہ خرچ آیا تھا۔ دیگر اخراجات کروڑوں روپوں تک پہنچے۔

اس حادثے کے فوراً بعد وہاں انتخابات ہوئے۔ بنگالیوں نے طوفان میں مرنے والوں کی لاشوں پر انتخابات لڑے۔ لاشیں جو خلیج بنگال میں چلی گئی تھیں انہیں بھی سمندر نے خشکی پر اُگل دیا۔ وہاں لوگ لاشیں گڑھوں میں اور پرچیاں بیلٹ بکسوں میں ڈال رہے تھے۔ مجیب نے ان لاشوں کو انتخابات میں استعمال کیا۔ اُس وقت تک وہ طلبا اور انتہا پسند بنگالیوں کے دلوں میں علیحدگی کا زہر پیدا کر چکا تھا۔ اب اُس نے لوگوں کو لاشیں دکھا دکھا کر اور چیخ چیخ کر کہا کہ یہ دیکھو، ہم ڈوب ڈوب کر مر رہے ہیں اور عیش مغربی پاکستان میں ہو رہی ہے۔ ہماری دولت سے وہاں منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم بن رہے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی آمدنی ہمارے پاس رہے تو ہم دریاؤں اور سمندروں کے منہ بند کر سکتے ہیں۔ مجیب اکثریت کا لیڈر اور ہیرو بن گیا۔ وہاں کے عوام پولنگ سٹیشنوں پر گئے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پچیس برسوں سے ڈوب ڈوب کر مر رہے تھے۔ مجیب نے حل پیش کر دیا اور نجات کا راستہ دکھا دیا۔ مجیب کی عوامی لیگ ایسی غالب اکثریت سے کامیاب ہوئی کہ مجیب کا یہ حق تھا کہ ملک (مغربی اور مشرقی پاکستان) کی وزارتِ عظمیٰ اُسے دے دی جائے۔

یحییٰ خان نے انتخابات تو دیانتداری سے کرائے تھے لیکن ایوب خان اُسے جس کرسی پر بٹھا گیا تھا اسے وہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ ملک کی بادشاہی بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مسلح افواج کی سپریم کمانڈ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور وہ شراب اور بدکاری بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے گرد ایسے جرنیلوں کا حصار کھینچ لیا تھا جو میدانِ جنگ کے نہیں حرم کے جرنیل تھے۔ ایک گروہ سِول اعلیٰ حکام کا بھی تھا جو اُس کے حاشیہ بردار تھے۔ سیدھی سی بات تھی کہ اقتدار اکثریت سے جیتنے والی پارٹی کو سونپ دیا جاتا۔ مگر اس طرح پیپلز پارٹی اقتدار سے محروم ہو جاتی۔ کچھ اس قسم کے دلائل دیئے گئے کہ اُدھر مجیب کو اکثریت حاصل ہوئی ہے لہٰذا وہ اُدھر ہی حکومت کرے۔ آج تک سنجیدہ اور غیر جانبدار سیاسی مبصر کہہ رہے ہیں کہ اگر مجیب کو پاکستان کا وزیرِ اعظم بنا دیا جاتا تو یہ بھیانک صورت پیدا نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔

اس صورت میں مشرقی پاکستان اتنی آسانی سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر اسے الگ ہونا ہی تھا تو لاکھوں بے گناہوں کے قتلِ عام، آتش زنی اور لوٹ مار کے بغیر ہو جاتا۔ ہم اور ہماری فوج اتنی زیادہ ذلت و رسوائی سے بچ جاتی۔ عالمی برادری میں ہمارا وقار قائم رہتا۔

مگر یحییٰ خان اسمبلیوں کے پہلے اجلاس کا اعلان کر کے پھر گیا۔ اقتدار منتقل کرنے میں وہ پس و پیش کر رہا تھا۔ بنگالی بھانپ گئے۔ وہ اب فیصلہ کُن معرکہ لڑنے کے لیے تیار تھے۔ یحییٰ خان نے اقتدار منتقل کرنے کی بجائے مذاکرات شروع کر دیئے۔ یہ فیصلہ یحییٰ خان کو خود کرنا چاہیئے تھا کہ اقتدار کا جو حق دار ہے اقتدار اُسے دیا جائے۔ ان مذاکرات میں بند دروازوں کے پیچھے کیا ہُوا؟ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں، مگر اصل حقیقت پر پردے پڑے رہے۔ البتہ بہت سے لوگ آج بھی پیپلز پارٹی کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مشرقی پاکستان کو پچیس برسوں کی سیاسی لغزشوں اور حکمرانوں کی شہنشاہیت نے آتش فشاں پہاڑ بنا دیا اور بھارت اس میں لاوا اور بارُود بھرتا رہا لیکن اس کا دہانہ جو بند کیا جا سکتا تھا اقتدار کے بُھوکوں نے اپنے ہاتھوں کھول دیا۔

انتخابات کے بعد مشرق اور مغرب میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی تھی مغربی پاکستان کی بندوق یحییٰ خان کے کندھے پر رکھ کر فائر کی جا رہی تھی۔ یحییٰ خان کے کانوں میں یہ ڈالا جا رہا تھا کہ مجیب سارے ملک کا وزیرِ اعظم یا صدر بن گیا تو وہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے فوراً الگ کر دے گا۔ اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو کرنسی اور دفاع تو ضرور ہی الگ کر دے گا اور وہاں بھارت کا غلبہ ہو جائے گا۔

اقتدار کے لیے ایک اور میدانِ جنگ بھی تھا جس میں مغربی پاکستان کے ہارے ہوئے لیڈر کیل کانٹے سے لیس ہو کر اُتر آئے تھے۔ تمام ہاری ہوئی پارٹیوں کے لیڈر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ اقتدار بھٹو کو نہ ملے۔ وہ مجیب کو مُہرہ بنانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک بڑا لیڈر چوری چھُپے مجیب کے پاس گیا اور اپنی وفاداری پیش کی۔ اُس کے پاؤں میں بیٹھے۔ اُسے شہ دی اور یحییٰ خان کو مجبور کرنے کے لیے اُسے تشدد پر اُکسایا۔ اس وفاداری کے عوض وہ وزارتوں

کے لیے سودا کر رہے تھے۔ بھٹو کو وہ اپوزیشن میں بٹھانا چاہتے تھے۔ بھٹو بچّہ نہیں تھا۔ وہ انتخابات میں حاصل کی ہوئی فتح سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ اُس نے شکست خوردہ لیڈروں کے خلاف محاذ بنا لیا۔ چنانچہ یہ درپردہ معرکہ لڑنے والوں نے سوچا تک نہیں کہ یہ سیاسی خانہ جنگی ہے اور بھارت ہمیں اسی طرح دست و گریبان دیکھنا چاہتا ہے۔ اس صورتِ حال سے اُس نے خوب فائدہ اُٹھایا اور بنگالی طلبا کو ٹائم بم بنا دیا۔ ہمارے ہارے ہوئے لیڈروں نے بھی اور جیتے ہُوئے لیڈروں نے بھی نتائج سے بے خبر اقتدار کی جنگ جاری رکھی۔ انہوں نے مجیب اور بھارت کے عزائم کو نظر انداز کر دیا۔ اگر یہ لوگ محبِ وطن ہوتے تو لڑائی جھگڑے کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔ متحد ہو جاتے اور مجیب کو اقتدار کی کُرسی پر بیٹھ جانے دیتے۔ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے عوامی لیگ نے پیپلز پارٹی سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر اُس وقت یہ جواز پیش کیا گیا کہ مجیب تو مشرقی پاکستان میں کامیاب ہُوا ہے، ہم مغربی پاکستان کی بات کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان تو الگ تھلگ خطہ ہے، یعنی مشرقی پاکستان کو الگ کر دیا گیا۔

یحییٰ خان کہاں کا نیک نیت آدمی تھا۔ وہ تو کُرسی چھوڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ اقتدار اُسے دُوں گا جو میرے نیچے بیٹھے گا۔ اُس نے اسمبلی سیشن کا اعلان کر کے منسوخ کر دیا اور مشرقی پاکستان کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ یحییٰ خان کو اُس کے بنائے ہوئے جرنیلوں اور مشیروں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ ان مشیروں نے یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان کی صورتِ حال سے بے خبر رکھا۔ یحییٰ خان جیسے حکمران جو شراب اور عورت کے دلدادہ ہوتے ہیں ملکی حالات سے بے خبر رہنے میں ہی خوش رہتے ہیں۔ اُسے یہ خوشی بہم پہنچائی جا رہی تھی۔ اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ یہ جرنیل اور مشیر کس کس ملک اور کون کون سی سیاسی پارٹی کے آلۂ کار تھے اور کتنے محض عیش و عشرت کے لیے یحییٰ کے دربار میں آن بیٹھے تھے۔ مشرقی پاکستان میں سکولوں، کالجوں اور بسوں وغیرہ کی ہڑتالیں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں اِدھر ملک کی باگ ڈور اعلیٰ سِول حکام کے ہاتھ میں تھی۔ مارشل لا کی موجودگی میں حکومت میں فوج کا کوئی عمل دخل

نہ تھا۔ فوج محض بدنام ہو رہی تھی۔ قوم اسے فوجی حکومت سمجھتی تھی جب کہ یہ خوشامدی اور عیاش سول حکام اور یحییٰ خان کے اپنے بنائے ہوئے دو تین جرنیلوں کی حکومت تھی۔

یہ سول حکام ہفتے میں ایک بار یحییٰ خان کے دربار میں ایک اجلاس کی صورت میں جمع ہوتے اور بالکل غیر اہم اور غیر متعلق امور پر بات چیت کر کے منتشر ہو جاتے۔ میجر جنرل فضل مقیم خان (حال سیکرٹری ڈیفنس) کے بیان کے مطابق ایک اجلاس میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ جن افسروں کو سول اعزاز کے تمغے دیے گئے ہیں وہ شکایت کرتے ہیں کہ تمغے ستاروں کی شکل کے ہیں۔ ان کے کونے اس قدر نوکیلے اور تیز ہیں کہ وہ جب خواتین کے ساتھ سینہ بہ سینہ رقص کرتے ہیں تو تمغوں کے یہ کونے خواتین کی چھاتیوں کو مجروح کرتے ہیں — اور اس طرح کے بیہودہ مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا جب کہ مشرقی پاکستان میں صورت خانہ جنگی کی پیدا ہو رہی تھی اور بھارت دھڑا دھڑ اسلحہ پہنچا رہا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس کی رپورٹوں کو بھی غور سے نہیں پڑھا جاتا تھا۔ ایک بار یحییٰ خان سے یہ بھی کہا گیا کہ حکومتی حلقوں میں عورتوں کا عمل دخل اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ ان کے اثر و رسوخ سے اعلیٰ حکام لوگوں میں زمینیں اور دولت بخش رہے ہیں مگر یحییٰ خان نے کوئی توجہ نہ دی۔ معلوم ہوا کہ یحییٰ خان پہلے سے ہی جانتا تھا کہ حکومتِ پاکستان بدکار عورتوں کے جال میں پھنس کے رہ گئی ہے اور پاکستان کے حکام الف لیلیٰ کے کردار بنتے جا رہے ہیں۔ مگر یحییٰ خان کی بادشاہی انہی عورتوں اور ان کے تماش بین افسروں کے دم سے قائم تھی۔ اس نے ہنس کر ٹال دیا۔

یحییٰ خان صدرِ مملکت تھا مگر اس نے افواج کی کمان نہ چھوڑی۔ جنرل عبدالحمید خان عملاً کمانڈر انچیف تھے مگر انہیں اختیارات حاصل نہیں تھے۔ ان میں قوتِ فیصلہ بھی نہیں تھی اخلاقی جرأت بھی نہیں تھی۔ وہ ضروری فائلیں شام کے بعد قصرِ صدارت میں یحییٰ خان کے حضور پیش کرتے تھے۔ وہ وقت عیش و طرب، ساقی اور جام کا ہوتا تھا۔ صدرِ مملکت جھومتے ڈولتے کوئی فائل دیکھتا کوئی نہ دیکھتا اور جنرل حمید سرِ تسلیم خم کیے رکھتا۔ ایک اور جرنیل جو یحییٰ خان کے اعصاب پر غالب آ گیا، وہ ایس۔ ایم۔ جی پیرزادہ تھا۔ وہ ایوب خان کا ملٹری سیکرٹری رہ چکا تھا۔ وہ بریگیڈیئر تھا۔ دل کے عارضہ کی وجہ سے اسے سیکرٹری کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ذہین آدمی تھا۔ اسے اب ترقی نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ طبی نقطۂ نگاہ سے اسے قابل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے دورِ شہنشاہی میں پیرزادہ کو میجر جنرل بنا کر ایجوٹنٹ جنرل بنا دیا پھر اسے اپنا پرنسپل افسر بنا لیا۔ یہ جرنیل افواج میں بھی غیر مقبول تھا اور سول حکام میں بھی مگر یحییٰ خان کا منظورِ نظر تھا۔ اس کے قصرِ صدارت میں آنے سے اس میں اور جنرل حمید میں یہ مقابلہ شروع ہو گیا کہ یحییٰ خان کا منظورِ نظر کون ہے۔

صدر کے شاہی محل میں جو دھاندلیاں، عیاشیاں، خویش پروریاں اور سازشیں ہوتی رہیں وہ پرانے دور کے شاہی محلات اور اس صدی کے مہاراجوں اور نوابوں کے اندرونِ خانہ حالات سے کسی طور کم نہ تھیں۔ یحییٰ خان کے دربار میں درباری مسخرے بھی تھے، پیشہ ور خوشامدی بھی، من مانیاں کرنے والے ذہین اور عیار لوگ بھی اور وہاں حسین و جمیل عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ ایک ٹولہ تھا جس نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ لندن کے مشہور اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" نے یکم نومبر ۱۹۷۱ کی اشاعت میں پاکستان کے قصرِ صدارت کی اس وقت کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی تھی — "ایسے آثار صاف طور پر نظر آ رہے تھے کہ مملکت کے امور سے صدرِ مملکت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ قوم جنگ کے دہانے پر پہنچ رہی تھی اور سیاسی مسائل الجھتے جا رہے تھے۔ ملک کی اقتصادی حالت تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں یہاں اہم امور پر فیصلے دینے سے گریز کیا جاتا ہے یا فیصلے غیر عقلی ہوتے ہیں جو ٹکڑوں میں دیے جاتے ہیں۔"

پاکستان کے اس شاہی محل کی سازشیں اور طلسماتی باتیں بہت ہی طویل اور تلخ ہیں۔ پاکستان تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہو چکا تھا۔ سول انتظامیہ پر اس کے جو اثرات پڑے وہ قوم نے دیکھ ہی لیے تھے۔ کوئی کل سیدھی نہیں رہ گئی تھی۔ سب سے زیادہ برا اثر افواج پر پڑا۔ لڑاکا ٹروپس کے نوجوان افسر جنہیں آنے والے حالات کے لیے ٹریننگ اور جنگی مشقوں میں مصروف ہونا چاہیے تھا شہروں میں سجے سجائے دفتروں میں ڈپٹی کمشنر، تحصیلدار اور تھانیدار

بنے بیٹھے تھے۔ اُن کا رابطہ براہِ راست اُن سِول حکام اور کارندوں سے تھا جو رشوت کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔ ایک تو وہ ٹریننگ سے محروم رہے، دوسرے اُن میں شہری افسروں والی رعونت پیدا ہو گئی جس نے اُن کی عسکری سُوجھ بُوجھ کو مجروح کیا۔ عجیب صورت یہ پیدا کی گئی کہ فوج شہروں میں اور شہری انتظامیہ میں موجود تھی لیکن اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یعنی حکومت فوج کی نہیں تھی۔ پھر بھی کوئی گڑبڑ اور بدنظمی ہوتی تھی تو قوم اس کا الزام فوج کے سر تھوپ دیتی تھی۔ اس طرح فوج بدنام ہو گئی اور فوج کے خلاف یہ تاثر عام ہو گیا کہ فوج کو حکومت کرنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ نتیجۃً فوج عسکری صلاحیتوں سے بھی محروم ہوئی، سول انتظامیہ بھی نہ چلا سکی اور بدنام بھی ہوئی۔ آگے چل کر اس کے اثرات میدانِ جنگ میں نظر آئے۔

مشرقی پاکستان میں احتجاجی مظاہرے مغربی پاکستان اور فوج کے خلاف نفرت کے اظہار کے مظاہرے بن گئے۔ مغربی پاکستانیوں پر جو مشرقی پاکستان میں مقیم تھے حملے شروع ہو گئے۔ پولیس کی جوابی کارروائیاں ڈھیلی ڈھیلی سی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں کی پولیس مظاہرین کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتی ہی نہیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا مگر فوج کو شہریوں کے غیر قانونی مظاہروں کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مارچ ۱۹۷۱ء کے وسط تک وہاں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ لُوٹ مار اور آتش زنی عام ہو گئی۔ فوج کا وہاں صرف ایک ڈویژن تھا جو بارکوں میں بند تھا۔ بعض افسر اور جوان راشن وغیرہ لینے کے لیے باہر جاتے تھے انہیں بنگالی گالیاں دیتے تھے، پتھر مارتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ بازار سے وہ کوئی چیز حاصل نہ کر سکیں۔ ایک لیفٹیننٹ کو گھیر کر قتل کیا گیا اور اس کی لاش کے ٹکڑوں کی نمائش بازاروں اور گلیوں میں کی گئی۔ ایک میجر اپنی بیوی اور بچوں کو جیپ میں کہیں لے جا رہا تھا۔ ڈرائیور بنگالی تھا۔ راستے میں میجر نے جیپ رکوائی اور کسی کام سے پرے چلا گیا۔ واپس آیا تو جیپ اُس کی بیوی اور ننھے بچوں سمیت غائب تھی۔ تلاش بسیار کے بعد بھی جیپ نہ ملی تو میجر دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اس قسم کے بے شمار حادثے ہوئے۔ اُن بنگالیوں کو بھی بنگالیوں نے قتل کر دیا جو فوج کو راشن وغیرہ سپلائی کرتے تھے۔

تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس مضمون کا دامن بھی اتنا وسیع نہیں کہ ہر واقعہ اور حادثہ بیان کیا جائے۔ مختصراً یہ کہ غیر بنگالیوں کا قتلِ عام، آبروریزی، اغواء، لُوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتیں اس قدر زیادہ ہوتی گئیں کہ فوج اور مارشل لاء کی موجودگی میں وہاں کوئی قانون، اخلاق، مذہب اور امن نہ رہا۔ اسلام آباد کے شاہی محل میں سازشیں، من مانیاں اور عیش و عشرت بدستور جاری رہی۔ یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان کے متعلق "سب اچھا" کی رپورٹیں ملتی رہیں اور یہ رپورٹیں بھی کہ مشرقی پاکستان کی پولیس، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کے افراد اسلحہ ایمونیشن سمیت بھگوڑے ہو رہے تھے۔ ایک بھارتی سکیم کے تحت مشرقی پاکستان کے ہندو باشندے بھارت جانے لگے جسے بھارتی حکومت نے "پناہ گزین" کہنا شروع کر دیا اور اپنے سفارتی ذرائع سے، ریڈیو اور اخباروں سے تمام دنیا میں یہ واویلا بپا کر دیا کہ مشرقی پاکستان جو ایک الگ تھلگ ملک ہے، مغربی پاکستان کی جبری غلامی سے آزاد ہونے کو تڑپ رہا ہے مگر مغربی پاکستان کی فوج وہاں ظلم و تشدد کر رہی ہے۔

عالمی برادری میں پاکستان یعنی مغربی پاکستان رُسوا ہوتا چلا گیا۔ ہمارے حکمران شراب میں ڈوبے رہے اور ہمارے سیاسی لیڈر اقتدار کے حصول کے لیے درپردہ کوششوں اور معرکوں میں مصروف رہے۔ اگر یہ لیڈر محبِ وطن ہوتے تو انتخابات کی ہار جیت کو فراموش کر کے یحییٰ خان کا گھیراؤ کرتے۔ رائے عامہ کو اُس کے خلاف کرتے۔ مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے کچھ کرتے، مگر اُن کی نگاہیں اقتدار پر لگی ہوئی تھیں۔ پیپلز پارٹی کے لیڈر مغربی پاکستان میں جلد از جلد اقتدار پر قبضہ کرنے کی سوچ رہے تھے اور ہارے ہوئے لیڈر مجیب سے چوری چھپے ملاقاتیں کر رہے تھے اور اس کوشش میں مصروف تھے کہ اقتدار مجیب کو ملے اور انہیں وزارتیں مل جائیں۔ فوج بے بس تھی اور مشرقی پاکستان غیر بنگالیوں کے خُون میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ لڑکیاں اغوا ہو کر کلکتے کے بازاروں میں پہنچ رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی مسجدوں میں لڑکیوں کی آبروریزی کر کے انہیں وہاں قتل کیا جا رہا تھا۔

اسلام آباد کے قصرِ صدارت نے اتنی سی حرکت کی کہ یہ حکم دیا کہ مشرقی پاکستان میں پولیس، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ سے ہتھیار لے لیے جائیں اور انہیں بارکوں میں نظربند کیا جائے، مگر اب یہ کام آسان نہیں رہا تھا بھارت کا بے شمار اسلحہ اندر آ چکا تھا۔ اسرائیل سے گوریلا اور کمانڈو ٹریننگ دینے اور مشرقی پاکستان میں گوریلا جنگ لڑانے کے لیے ایک یہودی جنرل جیکب بھارت کی ایسٹرن کمانڈ میں شامل ہو کر اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ بنگالیوں کے مظاہرے اُس بغاوت اور خانہ جنگی کا پیش خیمہ تھے جو بھارت نے پلان کی تھی۔ بھارت بیدار تھا۔ اس نے اپنی فوج اور انٹیلی جنس کو واضح مقصد دے دیا تھا۔ اس کی رپورٹیں ہماری انٹیلی جنس کو بھی مل رہی تھیں مگر اسلام آباد میں جا کر ان رپورٹوں کی سنگینی اور اہمیت ختم ہو جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے ملٹری گورنر ایڈمرل احسن تھے۔ انہیں واپس بلا کر جنرل یعقوب کو ملٹری گورنر بنایا گیا اور انہیں یہ کام سونپا گیا کہ وہ ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ اور بنگالی پولیس کو نہتہ کریں۔ ایڈمرل احسن کی جگہ جنرل یعقوب کو اس لیے یہ کام سونپا گیا تھا کہ یہ کام فوج ہی کر سکتی تھی۔

جنرل یعقوب کے لیے یہ کام دیگر وجوہات کے علاوہ اس لیے بھی مشکل تھا کہ وہ بنگالیوں کو اپنے ایسے بھائی سمجھتے تھے جو محرومیوں اور تلخیوں کا شکار تھے۔ وہ اب تشدد اور چھینا جھپٹی پر اُتر آئے تھے۔ انہیں تشدد کا جواب تشدد سے دینا دانشمندی نہیں تھی۔ یہاں تدبّر کی ضرورت تھی۔ جنرل یعقوب یحییٰ خان سے پوچھتے تھے کہ وہ نرمی سے بنگالیوں کو قائل کریں یا تشدد سے۔ یحییٰ خان انہیں کوئی واضح پالیسی نہیں دیتا تھا۔ بات گول سی کر کے ٹال دیتا تھا۔ جنرل یعقوب تشدد کے قائل نہیں تھے۔ وہ مجیب سے مل کر کوئی پُرامن سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے، مگر وہ یحییٰ خان کے حکم کے پابند تھے۔ اپنی کرنے کا انہیں اختیار نہیں تھا۔ مجیب سے پہلے تو یحییٰ خان کو قائل کرنا لازمی تھا جو اس وجہ سے ممکن نہیں تھا کہ جنرل یعقوب یحییٰ خان سے بات کرنا چاہتے تھے تو جنرل پیرزادہ بولتا تھا اور ٹال دیتا تھا کہ پریذیڈنٹ بہت مصروف ہیں وغیرہ۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت کا آتش فشاں

پھٹ پڑا تھا مگر وہاں فوج میں بھی اضافہ نہیں کیا جا رہا تھا۔

مارچ کے اوائل میں جب غیر بنگالیوں کا قتلِ عام اور آبروریزی عروج پر پہنچ چکی تھی اور غیر بنگالی وہاں سے بھاگ کر مغربی پاکستان آ رہے تھے، یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا ہونے والا پہلا اجلاس منسوخ کر دیا۔ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ میں جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ یہ خیال عام تھا کہ مجیب آزادی کا اعلان کر دے گا۔ جنرل یعقوب نے اس احساس کے پیشِ نظر کہ مغربی پاکستان کے لوگ اصل صورتِ حال سے آگاہ نہیں اور حکمران اسلام آباد میں بے پرواہ بیٹھے ہیں تاریخ کے اتنے خطرناک مرحلے پر انہیں خود ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ انہوں نے مجیب کو ٹیلی فون پر کہا کہ اگر اُس نے پاکستان کی سالمیت کے خلاف کوئی بات کہی، تو اُس کے لیے اور اُس کی عوامی لیگ کے لیے نتائج بہت بُرے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے فوج کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

جلسہ ہُوا۔ یہ مشرقی پاکستان کا ایک تاریخی جلسہ تھا جس میں لاکھوں بنگالی شریک تھے۔ مجیب نے اس بے پناہ اور مشتعل ہجوم سے خطاب شروع کیا۔ اس کی تقریر ٹیپ ہو کر پھر ٹائپ ہو کر ورق ورق جنرل یعقوب کے سامنے آ رہی تھی۔ اُن کے ہیڈکوارٹر کی فضا میں اور ان کے اعصاب پر کھچاؤ تھا۔ مجیب ہجوم کو سول نافرمانی کا پروگرام بتا رہا تھا۔ اس نے آزادی کی کوئی بات نہ کی۔ یہ اعلان ضرور کیا کہ اگر اسمبلی کا اجلاس بُلا کر اقتدار کی منتقلی عمل میں نہ لائی گئی تو سول نافرمانی کی شدید تحریک چلائی جائے گی۔ جنرل یعقوب نے یہ مرحلہ تو بخیر و خوبی ٹال دیا مگر نوشتۂ دیوار کو ٹالنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ بھارت کا پروپیگنڈہ تیز تر اور بلند تر ہو گیا تھا اور ہمارے حکمران اور اس کے حاشیہ برداروں کی بے نیازیاں بھی عروج پر تھیں۔ ہمارے اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی کے مطابق مشرقی پاکستان کے حالات نارمل تھے۔ جنرل یعقوب ڈھاکہ سے چیخ اور چلّا رہے تھے کہ یحییٰ خان ڈھاکہ آئے اور کوئی تصفیہ کرے۔

جب جنرل یعقوب نے آخری بار یحییٰ خان سے رابطہ قائم کیا اور جنرل پیرزادہ بولا تو جنرل یعقوب نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا کہ پریذیڈنٹ سے جلدی

ملاؤ۔ جنرل پیرزادہ نے پس و پیش کی پھر پریذیڈنٹ سے ملانے سے انکار کر
دیا۔ جنرل یعقوب نے کہا — "پریذیڈنٹ سے صرف یہ کہہ دو کہ میں استعفیٰ دے
رہا ہوں اور فوراً چارج دینا چاہتا ہوں" — انہیں اس کا بھی کوئی جواب نہ
دیا گیا۔ اُن کے افسروں نے اُنہیں کہا کہ وہ استعفیٰ نہ دیں۔ اپنے طور پر بنگالی
لیڈروں سے بات چیت جاری رکھیں تاکہ ملک خانہ جنگی سے بچ جائے، اگر
جنرل یعقوب کو اپنے طور پر ایسی کارروائی کے اختیارات حاصل نہیں تھے۔
اس سوال کا جواب جنرل پیرزادہ کے سوا کوئی بھی نہیں دے سکتا کہ جب مشرقی
پاکستان جل رہا تھا، بھارت کی کمانڈو فورس بنگالی مسلمانوں کے بھروپ میں مشرقی
پاکستان میں داخل ہو رہی تھی اور مشرقی پاکستان مرکز سے عملاً آزاد ہو چکا تھا، پریذیڈنٹ
کو کیوں اندھیرے میں رکھا گیا؟ جواب جو قابلِ فہم نظر آتا ہے، یہی ہو سکتا ہے کہ
پریذیڈنٹ اندھیرے میں ہی رہنا چاہتا تھا اور اُس کے درباریوں کے لیے بھی
یہی کیفیت سُود مند تھی کہ وہ اُسے بیدار نہ کریں۔

جنرل یعقوب کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا، ۷ مارچ ۱۹۷۱ کے روز جنرل ٹکا خان
ڈھاکہ پہنچے اور ۸ مارچ جنرل یعقوب مغربی پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ اُسی
روز وہاں سِول نافرمانی کی تحریک کا عروج شروع ہو گیا۔ یہ تحریک مکمل طور پر کامیاب تھی۔
یہاں تک کہ جنرل ٹکا خان سے گورنری کا حلف لینے کے لیے چیف جسٹس کو بلایا گیا
تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہاں کی ہائی کورٹ کے کسی بھی جسٹس نے حلف نہ لیا۔
جہاں جسٹس سِول نافرمانی پر اُتر آئیں وہاں دوسرے سرکاری اہلکاروں کے رویّے
کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مغربی پاکستان کے جن لوگوں کا روپیہ بنکوں میں تھا انہیں
بنکوں نے پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔ مختصر یہ کہ تمام تر انتظامیہ پر بنگالیوں نے
قبضہ کر لیا اور سرکاری مشینری جام کر دی۔ اخباروں میں اس قسم کی شاہ سُرخیاں
چھپنے لگیں — "غیر ملکی ظالم فوجیو یہاں سے نکل جاؤ" — اخباروں میں کُھلے
الفاظ میں "بنگلہ دیش فوج" کی ترتیب اور تنظیم شائع ہونے لگی۔ اغوا، آبروریزی اور
قتل و غارت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اپنی فوج یہ درندگی دیکھ رہی تھی لیکن اسے باہر
نکلنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے فوج پر ظلم اور درندگی کے الزامات محض بے بنیاد

تھے۔ بھارت نے پاکستان اور پاکستان آرمی کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ پہلے
سے زیادہ کر دیا۔

اب جنرل ٹکا خان میدان میں آئے۔ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ حکومت کا وقار
بحال کرو۔ جنرل ٹکا خان کی شخصیت کے متعلق چند باتیں واضح کر دینا ضروری ہیں
کیونکہ حاکم یا سالار کے ذاتی اوصاف فتح و شکست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ
سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ توپوں اور ٹینکوں سے زمین پر قبضہ کیا جا سکتا ہے انسانوں
کے دلوں پر نہیں۔ مارچ ۱۹۷۱ کا مہینہ تاریخِ پاکستان کا اہم ترین مہینہ تھا۔ مشرقی
پاکستان کے حالات چیلنج بن گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اس چیلنج کو قبول کرنا تھا یا چیلنج
کرنے والوں کو گلے لگانا تھا؟ تاریخ کے ایسے موڑ پر جہاں ایک ٹائم بم رکھا تھا، ہمارا
رویّہ کیا ہونا چاہیئے تھا؟ اس موقع پر تدبّر کی ضرورت تھی اور ایسے مدبّر حاکم یا
اُس کے نمائندے کی ضرورت تھی جو زمین پر قبضہ برقرار رکھنے کی بجائے دلوں پر
قبضہ کرنے کی کوشش کرتا۔ بھڑکے ہُوئے لوگوں کی گالیاں ٹھنڈے دل سے سُنتا۔
مگر ٹکا خان سپاہی قسم کے جرنیل ہیں۔ نیک اور خدا ترس ہیں۔ سیاسی شعبدہ بازیوں
سے دُور بھاگتے ہیں۔ حکم کی پابندی پُوری شدّت سے کرتے ہیں۔ جرنیل کو سیاست باز
نہیں ہونا چاہیئے لیکن جرنیل کے لیے ضروری ہے کہ سیاست کو سمجھنے کی اہلیت
رکھتا ہو تا کہ وہ ملک کے سود و زیاں سے باخبر رہے۔ جنرل ٹکا خان نے سیاسی
حالات کو سمجھنے کی بجائے ایک برخود غلط اور ملک کے لیے انتہائی خطرناک صدر
کا ایک ایسا حکم ماننا بہتر سمجھا جس کے نتائج قوم آج بُھگت رہی ہے۔ جنرل ٹکا
خاں وہاں سپاہی کی حیثیت سے گئے اور اس آتش فشاں مسئلے کا حل
سپاہ گری میں ہی ڈھونڈا۔

اُس وقت مشرقی پاکستان کے اندر سے اور سرحد پار سے اپنی انٹیلی جنس
جو رپورٹیں لا رہی تھی ان سے تمام شکوک رفع ہو جاتے تھے۔ پاک فوج کے چند
بنگالی افسر بھاگ گئے تھے اور مکتی باہنی کے نام کی فوج تیار کر رہے تھے۔ وہاں کے
اخباروں میں اس قسم کے اعلان بھی چھپنے لگے کہ ہمارے خلاف فوج استعمال کی
گئی تو ہم جنگی پیمانے پر مقابلہ کریں گے۔ سرحد پار سے آئی ہوئی رپورٹیں بتا رہی تھیں

کہ بھارت مشرقی پاکستان پر فوج کشی کرنے کی تیاریاں زور و شور سے کر رہا ہے اور حملے کا جواز ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنوں کے رویّے سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں ان رپورٹوں نے ذرّہ بھر پریشان نہیں کیا۔

۱۵ مارچ یحییٰ خان اپنے سول اور ملٹری حاشیہ برداروں کے ساتھ ڈھاکہ پہنچا اور اس شام اس نے جرنیلوں کی کانفرنس بُلائی جس میں وہاں کے حالات کا جائزہ لینا اور آئندہ لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

جنرل ٹکا خان : گورنر و مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر

جنرل خادم راجہ : اُس واحد ڈویژن (۱۴) کے کمانڈر جو مشرقی پاکستان میں تھا۔

جنرل غلام عمر : صدرِ مملکت کے مشیرِ خاص

جنرل فرمان علی : شہری امور۔ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر

جنرل ایم اکبر خان : ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس

جنرل مٹھا : کوارٹر ماسٹر جنرل

جنرل پیرزادہ : پی۔ ایس۔ او۔ صدرِ مملکت

جنرل عبدالحمید خان : چیف آف سٹاف

ایئر کموڈور ایم۔ ذید مسعود : پاک فضائیہ کی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر

کموڈور ممتاز : پاک بحریہ

یہ تاریخی نوعیت کی کانفرنس تھی جس میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہو۔ پاکستان کے مستقبل کا دارومدار اسی کانفرنس پر تھا۔ مارچ ۱۹۷۱ء کی یہ کانفرنس مارچ ۱۹۴۰ء کے اُس جلسے جتنی اہم تھی جس میں برِّ صغیر کے مسلمانوں نے اپنی منزل کا تعین کیا اور جنگِ آزادی کا پلان بنایا تھا۔ اب ایک اور مارچ ہماری تاریخ پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ تاریخ دم بخود تھی۔ قوم کی نظریں اس کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں۔ دشمن کی نگاہیں اس کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں — انٹیلی جنس رپورٹیں کانفرنس کے سامنے پڑی ہوئی تھیں جو یحییٰ خان نے بھی دیکھیں، جنرل پیرزادہ اور جنرل عبدالحمید خان نے بھی دیکھیں اور جو جنرل ٹکا

خان نے بھی دیکھیں۔

ایئر کموڈور مسعود نے اِن رپورٹوں کا حوالہ دے کر کانفرنس سے خطاب کیا اور تفصیل سے بتایا کہ اس کا ذمہ دار خواہ کوئی بھی تھا، ہمارے سامنے صورتِ حال یہ ہے کہ بنگالی اب آزادی چاہتے ہیں۔ وہ مغربی پاکستان کے حکمرانوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔ بھارت ان کی پشت پناہی پروپیگنڈے سے بھی کر رہا ہے اور اسلحہ وغیرہ سے بھی۔ ہمارے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے حکمرانوں کی اور موجودہ حکومت کی لغزشوں کی سزا بھگتیں اور یہاں سے باعزت طریقے سے نکل جائیں یا بنگالیوں کو سزا دیں اور ظالم اور سفّاک کہلائیں لیکن اِس کانفرنس کو اِن کے درمیان ایک تیسری صورت نکالنی ہے اور یہ صرف پُرامن تصفیہ ہی ہو سکتا ہے مگر اب بنگالی جنگی تیاریاں اُس مرحلے تک پہنچا چکے ہیں جہاں اگر وہ تصفیے پر آمادہ ہو بھی گئے تو دیں گے کم، لیں گے زیادہ۔ ہمیں ان کے عزائم اور اُن کے حقوق کے درمیان میں سے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بخیر و خوبی گذارنا ہے۔

یحییٰ خان توجہ سے سُن رہا تھا۔ جنرل فرمان علی اور جنرل اکبر خان پُرامن گفت و شنید اور تصفیے کے حق میں تھے۔ جنرل اکبر خان کے دلائل زیادہ وزنی تھے کیونکہ وہ انٹیلی جنس کے جنرل تھے۔ وہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے کہ مشرقی پاکستان میں اپنی جنگی قوت کتنی کچھ ہے اور جنگ کی صورت میں بھارت یقیناً جنگ میں شریک ہو گا، پھر کمک اور سپلائی کے تمام راستے بند ہو جائیں گے، مگر یحییٰ خان کے درباری جنرل عبدالحمید خان اور جنرل پیرزادہ بار بار یحییٰ خان کے منہ کی طرف دیکھتے تھے۔ وہ اُسی کی ہاں میں ہاں ملانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ ایسے اشارے دیئے جیسے وہ پُرامن تصفیے کے قائل نہیں۔ یحییٰ خان کو جنرل اکبر خان نے انٹیلی جنس رپورٹیں دکھا کر بتایا کہ اگر آپ بنگالیوں کو دبانے کے لیے فوج کو استعمال کرنے کی سوچ رہے ہیں تو آپ کو یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ آپ کو بھارت سے جنگ لڑنی پڑے گی۔ مشرقی پاکستان کے اندر نہایت منظم طریقے سے جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ ڈھاکہ میں انہوں نے باقاعدہ ڈیفنس ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے جہاں بنگال کے سابق فوجی افسر، فوج اور پولیس سے بھاگے ہوئے افسر، اور دیگر عہدوں کے لوگ بالکل اس

طرح کام کر رہے ہیں جس طرح فوجی ہیڈ کوارٹر میں جنگ شروع ہونے سے پہلے کام ہوتا ہے۔ یحییٰ خان کو بتایا گیا کہ ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ بحریہ اور فضائیہ کے بنگالی افراد بغاوت کے حکم کے منتظر ہیں۔ بھارت کی کمانڈو فورس اندر آچکی ہے۔ کمانڈو اپریشن کے لیے اسلحہ اور ایمونیشن اندر آچکا ہے۔ ہم دن اور ہفتے ضائع کر رہے ہیں اور ملک میں لمحہ بہ لمحہ باغی نفری اور جنگی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یحییٰ خان کو یہ بھی بتایا گیا کہ بنگلہ دیش کا جھنڈا تیار ہو چکا ہے اور ڈھاکہ کی متعدد عمارتوں پر چڑھایا جا چکا ہے، پاکستان کا جھنڈا اب سرکاری عمارتوں پر بھی نظر نہیں آتا۔ قائدِاعظم کی تصویریں جگہ جگہ جلائی جا رہی ہیں۔ جھنڈے کی توہین کی جا رہی ہے۔ ان حالات میں فوجی کارروائی بڑے ہی خطرناک نتائج کی حامل ہوگی۔ اسے اب امن و امان بحال کرنے کی کوشش نہیں بلکہ "بنگلہ دیش" کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا۔ ایئر کموڈور ایم۔ زیڈ مسعود نے کانفرنس کو بتایا کہ جسے پاکستان ایئر فورس کی ایسٹرن کمانڈ کہا جاتا ہے وہ صرف سولہ سیبر طیارے ہیں اور ان کے لیے صرف ایک ہوائی اڈہ جسے دشمن ایک ہی دن میں بیکار کر دے گا۔ دشمن کی فضائی طاقت کے متعلق یحییٰ خان کو بتایا گیا کہ کم و بیش دس سکواڈرن مغربی بنگال اور آسام میں موجود ہیں جن میں روس کے ایس۔ یو۔ سیون اور مگ ۲۱ طیاروں کے علاوہ دیگر جدید لڑاکا بمبار طیارے بھی ہیں۔ اس حالت میں بھارت کے ساتھ مشرقی پاکستان میں جنگ کا خطرہ مول لینا دانشمندی نہیں تھی خصوصاً ایسے حالات میں جب مشرقی پاکستان کے کروڑوں لوگ پاک افواج کے خلاف لڑنے کے لیے تیار تھے۔ نیوی کی حالت اور زیادہ کمزور تھی۔ چٹاگانگ ہی ایک بندرگاہ تھی جہاں کچھ گن بوٹیں تھیں۔ ان کے مقابلے میں بھارت کی طاقتور نیوی تھی جس میں طیارہ بردار بحری جہاز "وکرانت" بھی تھا۔

جنرل ٹکا خان اس عزم اور امید کا اظہار کر رہے تھے کہ فوج بغاوت کو دبا لے گی اور یہ کام ایک ہفتے میں ہو جائے گا۔ یحییٰ خان کے موڈ سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فوجی کارروائی کا قائل نہیں۔ اس نے اسی موڈ میں کانفرنس برخاست کر دی

اور مجیب کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان دونوں کی تنہا ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام اور تیز ہو گیا۔ بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے عالمی برادری میں پاکستان کو خوب رسوا کیا۔ ہمارا ریڈیو اور ٹی وی اپنے حکمرانوں کے گیت گاتا رہا اور اخباروں میں ایسے جلوسوں کی تصویریں چھپتی رہیں جن کے متعلق بتایا گیا کہ ڈھاکہ میں محبِ وطن پاکستانیوں کے جلوس ہیں۔ مغربی پاکستان والوں کو بتایا ہی نہ گیا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ اُدھر سے بھاگ کر جو لوگ اِدھر آتے تھے ان کی زبان سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی وہ تاریک رات آگئی جب پاک فوج کے ایک ٹینک کے پہلے گولے نے دوست اور دشمن کی تمیز ختم کر دی۔ یہ حکم جنرل یحییٰ خان نے دیا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یحییٰ خان نے یہ ہدایت بھی جاری کی تھی کہ اس کا طیارہ کراچی ایئرپورٹ پر اُتر جائے تو ملٹری ایکشن شروع کیا جائے۔ اس نے اپنی واپسی خفیہ رکھی تھی۔ رات کے وقت وہ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پہنچا۔ اس کے ساتھ جنرل عبدالحمید خان اور جنرل پیرزادہ تھے۔ وہاں اسے بنگالی افسروں نے دیکھ لیا۔ اس نے وہاں کچھ ایسی باتیں کیں جو کسی بنگالی افسر نے سن لیں۔ اس نے فوراً مجیب کو اطلاع کر دی۔ مجیب باغی حکومت قائم کر چکا تھا۔ یکم مارچ ۱۹۷۱ء سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک مجیب کی متوازی حکومت قائم رہی اور اس کا جنگی ہیڈ کوارٹر کام کرتا رہا۔ وہ جب یحییٰ خان کے ساتھ مذاکرات کے لیے جاتا تھا تو اس کی گاڑی پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا ہوتا تھا۔

اُسے ملٹری ایکشن سے پہلے ہی خبر مل گئی کہ جنرل یحییٰ خان کے متعلق یہ جو بتایا جا رہا ہے کہ وہ ڈھاکہ میں ہے اور ابھی یہیں رہے گا، یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تو فوج کو سخت کارروائی کا حکم دے کر واپس چلا گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی مجیب نے اپنی حکومت اور جنگی ہیڈ کوارٹر کے سرکردہ افراد کو جو اعصابی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے، روپوش کر دیا یا سرحد پار بھیج دیا۔ ملٹری ایکشن کے لیے ضروری یہ تھا کہ سب سے پہلے سرحدوں کی ناکہ بندی کی جاتی تاکہ لیڈروں کو گرفتار کیا جاسکتا۔

ایک تو ملٹری ایکشن غیر ضروری تھا اور اگر یہ ضروری ہی تھا تو یہ بہت تاخیر سے
کیا گیا۔ اس کا موزوں وقت گزر چکا تھا۔ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا مگر اس کے دوسرے
لیڈر قبل از وقت خبر مل جانے سے اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجیب
کی غیر حاضری کو ذرّہ بھر محسوس نہ کیا۔ وہ اپنے منصوبوں پر پلاننگ کے مطابق عمل
کرتے رہے۔ لہٰذا ملٹری ایکشن ہُوا بھی تو بے اثر رہا بلکہ اس کا اثر اُلٹا ہُوا۔
دوست بھی دشمن ہو گئے اور فوج بھی بدنام ہو گئی۔ یہ ناقص پلاننگ کا نتیجہ تھا۔

۲۵/۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات ایک بجے پاک فوج کے چودھویں
ڈویژن نے پہلا گولہ فائر کیا اور اس گولے کے ساتھ ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔
ایسٹ بنگال رجمنٹ کی پانچ پلٹنیں تھیں۔ پانچوں باغی ہو گئیں۔ فوج نے احکام
کے تحت فوجی کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ بعض مقامات پر باغیوں نے جم کر
مقابلہ کیا۔ بعض جگہوں پر ایسی پلٹنیں تھیں جن میں بنگالی اور غیر بنگالی بھی تھے۔
بنگالیوں نے غیر بنگالی افسروں کو قتل کر دیا۔ کئی جگہوں پر جہاں پاک فوج کی نفری کم تھی
غیر بنگالی عورتوں اور بچّوں کو بنگالیوں نے بڑی ہی بے رحمی سے قتل کیا۔ فوج کی
کارروائی بڑی ہی تیز رفتار اور شدید تھی۔ اسی مرحلے میں آکر ہماری فوج بدنام
ہُوئی۔ بھارت نے ہمارے افسروں اور جوانوں پر قتلِ عام اور آبروریزی کے
الزامات عائد کیے اور اپنی پروپیگنڈہ مشینری انہی الزامات کی تشہیر پر مرکوز کر دی۔
یہ پروپیگنڈہ اس قدر اشتعال انگیز ثابت ہُوا کہ مغربی پاکستان میں آج بھی ایک گروہ
اپنی فوج کو قاتل اور بدکار کہہ رہا ہے۔ یہاں اِن الزامات کی وضاحت ضروری
معلوم ہوتی ہے۔

جس وقت فوجی کارروائی کا حکم ملا وہاں ہمارا صرف ایک ڈویژن تھا تفصیل
سے بتایا جا چکا ہے کہ اس ڈویژن کے افسروں اور جوانوں کو گالیاں دی گئیں۔
وہ باہر نکلتے تھے تو انہیں پتھر مارے جاتے تھے۔ کوئی اکیلا دکیلا فوجی بنگالیوں کے
ہتھے چڑھ جاتا تو اُسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ اُن کی موجودگی میں غیر بنگالی عورتوں اور نوجوان
لڑکیوں کی آبروریزی ہوتی رہی۔ گھر جلائے جاتے رہے۔ معصوم بچے قتل ہوتے
رہے مگر فوج کو جوابی کارروائی یا اِن بے گناہوں کی حفاظت کی اجازت نہیں تھی۔

فوج کو جب کارروائی کا حکم ملا اور فوج چھاؤنیوں سے باہر آئی تو افسروں اور جوانوں
نے ایسے مناظر دیکھے جو پتھر کو بھی رُلا دیتے تھے۔ مثلاً بعض فوجیوں نے بتایا کہ وہ
مسجدوں میں گئے تو وہاں لڑکیوں کی برہنہ لاشوں کے انبار پڑے تھے۔ انہیں
مسجدوں میں بے آبرو کر کے انہیں بکروں کی طرح ذبح کیا گیا تھا۔ خون اتنا زیادہ
تھا کہ پاؤں خون میں دھنستے اور پھسلتے تھے۔ قرآن کے پھٹے ہوئے نسخے خون
میں ڈوبے پڑے تھے۔

باہر درختوں کے ساتھ دُودھ پیتے بچّوں کی لاشیں اس طرح لٹکی ہوئی تھیں
کہ زندہ بچّوں کے سینوں میں لمبے لمبے کیل گاڑے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی ہال لاشوں
سے اٹا ہُوا تھا۔ یہ وہ بدقسمت غیر بنگالی تھے جنہیں بنگالی یہ کہہ کر گھروں سے نکال لے
گئے تھے کہ یونیورسٹی ہال میں وہ محفوظ رہیں گے۔ ہال میں تِل دھرنے کو بھی جگہ
نہ رہی تو ہر طرف سے مشین گنوں کی بوچھاڑیں فائر ہونے لگیں۔ فوجیوں نے یہ
لاشیں اُٹھائیں تو نیچے سے نو سال کی عمر کی ایک زندہ بچّی برآمد ہُوئی۔ اُس کے
خاندان کے تمام افراد مارے جا چکے تھے۔ یہ بچی ہوش میں آئی تو دہشت سے پاگل
ہو چکی تھی — اور ایسے بے شمار مناظر تھے جنہیں دیکھ کر فولادی اعصاب کا آدمی
بھی پاگل ہو جائے۔ ہمارے فوجی آخر انسان تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کی
آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ذرا اپنے آپ کو ان فوجیوں کی جگہ لائیے۔ پھر سوچیے
کہ اپنے آپ پر قابو پانا کس قدر دشوار ہو گا۔ ہمارے کئی افسر اور سپاہی فوجی ڈسپلن
اور صبر و تحمل اور عقل کھو بیٹھے۔ جذبۂ انتقام غالب آ گیا اور انہوں نے انتقام لیا۔
لیکن مجموعی طور پر فوج پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے صرف انتقامی
کارروائی کی۔ البتہ اس نے جو بھی کارروائی کی وہ بڑی ہی شدید تھی۔ پھر بھی اتنا
جانی نقصان نہیں کیا گیا جو مجیب بتا رہا ہے۔ یہ پیشِ نظر رکھیے کہ ملٹری ایکشن میں
صرف ایک ڈویژن تھا۔ ایک ڈویژن سارے ملک میں نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اس
نے جو کچھ کیا شہروں میں کیا۔ اس کی نفری اتنی تھوڑی تھی جو ہر جگہ نہیں جا سکتی تھی۔
لہٰذا اس کا دائرہ عمل بھی بہت محدود تھا۔

اس کارروائی میں جہاں کامیابیاں حاصل کی گئیں وہاں احمقانہ حرکتیں بھی

کی گئیں۔ مثلاً غیر ملکی اخباری رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی بے عزتی کی گئی اور ان کے
کیمروں سے فلمیں نکال کر ضائع کر دی گئیں۔ ضرورت یہ تھی کہ عالمی رائے کو اپنے
حق میں کرنے کے لیے ان غیر ملکیوں کو باعزت طریقے سے اپنے ساتھ رکھا جاتا
اور انہیں غیر بنگالیوں کی لاشیں خون میں ڈوبی ہوئی اور برہنہ لاشوں سے اٹی ہوئی
مسجدیں اور دیگر قتل گاہیں اور درختوں سے لٹکی ہوئی بچوں کی لاشیں دکھائی
جاتیں اور انہیں مکتی باہنی کے وہ قیدی دکھائے جاتے جو دراصل انڈین آرمی
کے کمانڈو تھے مگر انہیں ذلیل کر کے ملک سے نکال دیا گیا۔ وہ بھارت چلے گئے
جہاں انہوں نے خوب انتقام لیا۔ وہ بھارت سے مشرقی پاکستان کی بے بنیاد
خبریں لے کر اپنے ملکوں کو بھیجتے رہے۔ انہوں نے یحییٰ خان کو چنگیز خان اور
جنرل ٹکا خان کو قصاب اور ہماری فوج کو قاتل، زانی اور ڈاکو لکھا۔

فوجی کارروائی بظاہر کامیاب ہو گئی۔ مکتی باہنی کو توقع نہیں تھی کہ فوج اتنی تیزی
سے اتنی کاری ضرب لگائے گی۔ مکتی باہنی آسام اور مغربی بنگال بھاگ گئی جہاں بھارت
نے انہیں ٹریننگ دینے کے لیے کیمپ کھول رکھے تھے، مگر فوجی کارروائی کا ایک
نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ وہاں کے عوام جن میں دیہاتی علاقوں کے لوگ خاص طور پر
قابلِ ذکر ہیں پاکستان کے خلاف نہیں تھے، وہ بھی فوجی کارروائی کی زد میں آ گئے۔
مثلاً بعض پل مکتی باہنی نے اڑائے تھے۔ ان کی سزا قریب کے دیہات کو دی
گئی۔ وہ بے گناہ تھے مگر بنگالی ہونے کی وجہ سے انہیں قابلِ اعتماد نہ سمجھا گیا۔ اُس کا
اثر یہ ہوا کہ وہ مکتی باہنی کی پناہیں ڈھونڈنے لگے اور مکتی باہنی کے آدمیوں کو پناہیں
دینے لگے۔ اس طرح دوست بھی دشمن ہو گئے اور دیہاتی علاقے مکتی باہنی کے مورچے
اور اڈے بن گئے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ایک ڈویژن فوج نفری کی کمی سے دیہات میں جا ہی
نہیں سکتی تھی اس لیے دیہاتی عوام فوج کے خلاف ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ کام
بھارت کی بارڈر سکیورٹی فورس نے کیا۔ بھارت کی اس فورس کی وردی ہماری فوج
کی طرح خاکی ہے۔ ان بھارتیوں نے سرحدی دیہات میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد
کیا اور ظاہر کیا کہ یہ پاکستان کی فوج ہے۔ اس سے بھارت نے دو فائدے

حاصل کیے۔ ایک یہ کہ دیہاتیوں کو پاک فوج کے خلاف متنفر کر دیا اور دوسرے
یہ کہ ان دیہاتیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ بھاگ کر بھارت چلے جائیں تاکہ دنیا کے
سامنے "پناہ گزینوں" کا سٹنٹ کھڑا کیا جا سکے۔

شہروں میں بغاوت پر قابو پا لیا گیا۔ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان
بھیج دیا گیا تھا۔ اب ضرورت یہ تھی کہ وہاں کے عوام میں اپنا اعتماد پیدا کیا جاتا۔
ان کے مسائل کی طرف توجہ دی جاتی۔ ان کی مشکلیں آسان کی جاتیں مگر اس طرف
کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اسی پر اکتفا کیا گیا کہ شہروں میں حالات معمول پر آ گئے ہیں۔ فوج
یہی کچھ کر سکتی تھی۔ اس دوران مغربی پاکستان سے دو اور ڈویژن مشرقی پاکستان
بھیج دیئے گئے۔ انہوں نے چونکہ وہ مناظر نہیں دیکھے تھے جو پہلا ڈویژن دیکھ کر
عقل و ہوش کھو بیٹھا تھا اس لیے ان ڈویژنوں کا رویہ شہریوں کے ساتھ برادرانہ
رہا۔ ایسی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں بنگالیوں نے فوج کی مدد کی۔ بعض
جگہوں پر ایک بھی گولی چلائے بغیر بدنظمی پر قابو پا لیا گیا۔ مگر یہ کافی نہیں تھا۔ قابو حالات
پر پایا گیا تھا جبکہ ضرورت یہ تھی کہ وہاں کے عوام کے دلوں پر قابو پایا جاتا جو صرف
اس طرح ممکن تھا کہ ان کا معیارِ زندگی بہتر بنایا جاتا۔ اُن کے لیے جو ترقیاتی منصوبے
تیار ہوئے تھے انہیں عملی جامہ پہنایا جاتا۔ یہ بڑا ہی کارآمد موقع تھا جو ضائع کر
دیا گیا۔

* جس رات ملٹری ایکشن شروع کیا گیا سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو،
مصطفےٰ کھر اور جے اے رحیم کے ساتھ ڈھاکہ میں تھے۔ بھٹو نے اپنی کتاب "عظیم المیہ"
میں ملٹری ایکشن کے متعلق لکھا ہے:

"ساڑھے دس بجے رات عشائیہ سے فارغ ہو کر ہم اپنے اپنے کمروں
میں چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد توپوں کی گھن گرج سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ میرے
دوستوں کی خاصی تعداد میرے کمرے میں جمع ہو گئی اور ہم نے دیکھا کہ فوج نے
کارروائی شروع کر دی ہے۔ ہم نے تین گھنٹے ہوٹل کے کمرے سے اپنی آنکھوں
سے ملٹری ایکشن دیکھا۔ کئی مقامات پر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ہماری نظروں
کے سامنے مقامی انگریزی روزنامے 'دی پیپل' کی عمارت زمین بوس ہوتی۔ یہ اخبار

فوج اور مغربی پاکستان کے خلاف اشتعال پھیلانے میں پیش پیش تھا۔ میرے ذہن میں ماضی اور مستقبل کے خاکے آنے لگے۔ میں حیران تھا کہ ہمارے ہاں کیا رہ گیا ہے۔ یہاں تو ہماری اپنی آنکھوں کے سامنے ہمارے اپنے آدمی موت اور تباہی سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ اُس وقت ایک سوچ قائم رکھنا خاصا مشکل تھا۔

کیا ہم اس سطح پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہو جاتی ہے؟ کیا یہ زخم مندمل ہو جائیں گے اور پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا؟ کیا چاہا تھا اور کیا ہُوا۔ یہ میرے سامنے تھا.... میں نے دُعا مانگی کہ یہ واقعات تنازعہ کا رُوپ نہ دھار لیں بلکہ عام آدمی کا جذبۂ حب الوطنی فسطائیت پر غالب آ جائے.... کراچی کے ہوائی اڈے پر ایک ہجوم نے ہمارا استقبال کیا.... میں نے صرف اتنا کہا ’’خُدا کے فضل و کرم سے پاکستان بچا لیا گیا ہے‘‘ — میرا دل مطمئن تھا کہ میں نے جو سوچا تھا اور کہا تھا وہ درست تھا۔ یہ تو مستقبل بتائے گا کہ پاکستان بچا لیا گیا یا کھو دیا گیا۔‘‘

جنرل ٹکا خان نے فوجی کارروائی کا مقصد پورا کرنے کی تاریخ ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ مقرر کی تھی۔ اُس وقت تک مقصد پُورا ہو گیا مگر صرف اس حد تک کہ شہروں میں حالات قابو میں آ گئے مگر اس کی مثال ایسی تھی جیسے فائر بریگیڈ نے آگ بجھا دی ہے۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ راکھ میں چنگاریاں رہ تو نہیں گئیں، اس کے بعد تعمیرِ نو کا مرحلہ تھا۔ مگر یہ کارروائی جلتی پر تیل ثابت ہُوئی۔ بھارت مکتی باہنی کی تنظیمِ نو کر رہا تھا اور ٹریننگ دے کر انہیں توپ خانے کی گولا باری سے مدد دے کر مشرقی پاکستان میں داخل کرنے کا پلان بنا رہا تھا۔

مگر مشرقی پاکستان میں اس قدر افراتفری، نفسانفسی اور ایسی جنگی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جسے سنبھالنا جنرل ٹکا خان اور ان کے مشیر برائے شہری امور جنرل فرمان علی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہاں کے عوام کو سنبھالنا اور انہیں اپنی حمایت میں لانا ناممکن ہو گیا تھا۔ جنرل فرمان علی یحییٰ خان کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں موجود تھے۔ وہ اسلام آباد سے احکام لیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ وہاں جنرل پیرزادہ کا رول ادا کر رہے تھے۔ ملٹری ایکشن نے ایسی صُورت

پیدا کر دی تھی کہ وہاں کے اثرات مالبد کو سنبھالنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اب INITIATIVE مجیب اور بھارت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جو حالات پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ ملٹری ایکشن نے پیدا کر دیئے تھے۔

۱۱ اپریل ۱۹۷۱ کو جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کو ایسٹرن کمانڈ کا کمانڈر بنا کر مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ اب مکتی باہنی بھارت کی گولا باری کے سائے میں حملے کرنے لگی۔ جنرل نیازی نے اس کے مطابق نیا پلان تیار کیا۔

جنرل ٹکا خان نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کی رات شروع ہونے والے ملٹری ایکشن کا مقصد پُورا کرنے کی تاریخ ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ مقرر کی تھی۔ انہوں نے اپنی رائے کے مطابق یہ مقصد پورا کر لیا مگر یہ رائے فوجی نوعیت کی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ سیاسی لحاظ سے یہ مقصد پُورا ہو گیا تھا یا نہیں۔ مشرقی پاکستان میدانِ جنگ نہیں تھا۔ یہ تو سیاست کا کھیل تھا۔ وہاں سیاسی تصفیے کی ضرورت تھی۔ فوج نے صرف یہ کامیابی حاصل کی تھی کہ بڑے بڑے شہروں اور چھاؤنیوں کو باغی عناصر سے محفوظ کر دیا تھا مگر باغی عناصر دب نہیں گئے تھے۔ وہ سرحد پار چلے گئے یا دیہاتی علاقوں میں بکھر گئے تھے جو سرحد پار گئے انہوں نے وہاں بھارتیوں سے تربیت اور حوصلہ حاصل کیا اور جو دیہاتی علاقوں میں چلے گئے، اُنہوں نے دیہاتیوں کو ڈرا دھمکا کر، اُکسا بھڑکا کر ان سے پناہ اور مدد لی اور انہیں پاک فوج کی دہشت گردی کے جھوٹے قصے سنا کر انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس لحاظ سے ملٹری ایکشن باعثِ نقصان ثابت ہُوا۔

جہاں تک وہاں کے عوام کا پاکستان کے خلاف ہونے کا تعلق ہے انہیں ہم ہر لحاظ سے مظلوم کہیں گے۔ وہاں عوام دو طرح کے تھے۔ ایک شہری دوسرے دیہاتی۔ مغربی پاکستان میں بھی عوام دیہاتی اور شہری ہیں لیکن یہاں دیہاتی شہروں کے امور اور مسائل سے باخبر رہتے ہیں کیونکہ ذرائع آمد و رفت میں سہولت میسّر ہے۔ مشرقی پاکستان کی زمین ایسی ہے کہ دیہاتیوں اور شہریوں کے درمیان ندیاں دریا، جنگل، دلدل اور ایسی ہی دشواریاں حائل رہتی ہیں۔ وہاں کے دیہاتی اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں تصوّر کی آنکھ سے دکھایا جاتا ہے۔ ملٹری ایکشن

سے شہری عوام محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ تو ایک طوفان تھا، سیلاب تھا۔ راستے میں جو آیا اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ شہریوں میں محبِ وطن بنگالیوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ ملٹری ایکشن کی زد میں آ گئے۔ وہ فوج کی مجبوری (یا حماقت) کو نہ سمجھ سکے اور فوج بلکہ پاکستان کے خلاف ہو گئے۔

اُدھر دیہات میں فوج تو نہ پہنچ سکی، وہاں باغی عناصر اور بھارت کے ففتھ کالمسٹ پہنچے۔ انہوں نے ان سیدھے سادے اور بے خبر لوگوں کو پاکستانی فوج کی فرضی دہشت گردی کے واقعات سنائے۔ یہ ثبوت بعد میں ملا تھا کہ دیہاتی پاک فوج کے خلاف پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوئے البتہ مکتی باہنی اور بھارتی عناصر نے انہیں اپنی دہشت گردی سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ یعنی انہیں مجبور کر دیا کہ وہ انہیں پناہ اور مدد دیں۔ گویا ان سے زبردستی مدد لی گئی۔ ان سے اناج تک لوٹ لیا گیا۔ اس طرح یہ صورت پیدا ہو گئی کہ شہری فوج سے دہشت زدہ ہو کر پاکستان کے خلاف ہوئے اور دیہاتی مکتی باہنی کے ڈر سے فوج کے خلاف ہو گئے۔ بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس نے سرحدی دیہات میں داخل ہو کر دیہاتیوں پر ظلم و تشدد کیا۔ اس فورس کی وردی خاکی ہے۔ چنانچہ یہ کہا گیا کہ یہ پاک فوج ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ حاصل کیا گیا کہ دیہاتی پاک فوج کے خلاف ہو گئے اور دوسرا فائدہ یہ کہ انہیں سرحد پار کر کے بھارت بھاگ جانے پر اُکسایا گیا کہ "پناہ گزینوں" کا سٹنٹ کھڑا کیا جا سکے۔ بھارت کی اس حرکت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دیہاتی پاکستان کے خلاف نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے اُسے اپنی بارڈر سیکورٹی فورس کو استعمال کرنا پڑا۔

ملٹری ایکشن کے کچھ نقصانات اور بھی تھے جن کی وجہ یہ ہے کہ اس کارروائی کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ جو کچھ کیا گیا، اندھا دھند کیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ کارروائی بے وقت اور بے محل کی گئی۔ اگر مشرقی پاکستان کے مسئلے کا علاج فوجی کارروائی ہی تھا تو یہ کارروائی بہت عرصہ پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ تیری وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان جیسے دشوار گذار اور قدرتی رکاوٹوں سے بھرے ہوئے ملک میں جو تین اطراف سے دشمن کے نرغے میں تھا اور جس کے اندر

دشمن کے ریڈ اکا اور غیر ریڈ اکا تخریب کار اور ففتھ کالمسٹ ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے، وہاں صرف ایک ڈویژن سے فوجی کارروائی کرنا احمقانہ حرکت تھی۔ یہ وہاں کے فوجی کمانڈر کا فرض تھا کہ وہ صدرِ مملکت کو ان احوال و کوائف، خطرات اور اپنی ضروریات سے آگاہ کرتا مگر نہ صرف یہ کہ ان احوال و کوائف کو نظر انداز کیا گیا بلکہ سرحدوں کی ناکہ بندی نہ کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے لاکھوں افراد سرحد پار چلے گئے اور اُدھر سے بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس اندر آ کر من مانی کرتی رہی، اور اس کے علاوہ بھارتی کمانڈو فورس بنگالی مسلمانوں کے بھیس میں دھڑا دھڑ اندر آتی اور دیہاتی علاقے میں چھپتی چلی گئی۔

بھارت یہی چاہتا تھا۔ کلکتہ ریڈیو ایک تو یہ واویلا کر رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان آرمی قتلِ عام کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ مشرقی پاکستان کے ہندو باشندوں کو چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "بھاگو مشرقی پاکستان سے بھاگو" —— اور ہندو بھارت کو بھاگے جا رہے تھے۔ غیر ملکی رپورٹروں نے اپنے خبرناموں میں کہا تھا کہ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان سے بھاگ کر بھارت میں پناہ لی ہے ان میں اسی فیصد ہندو ہیں مگر بھارت نے ان سب کو مسلمان کہا اور ان کی تعداد کم و بیش دس گنا زیادہ بتائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملٹری ایکشن میں ہندوؤں کی پکڑ دھکڑ زیادہ ہو رہی تھی کیونکہ فساد کی جڑ یہی لوگ تھے۔ ان کا بھاگنا اور بھارت میں پناہ لینا قابلِ فہم تھا۔ تاہم سرحدوں کی ناکہ بندی نہ کرنے کی وجہ سے بھارت نے بہت فائدے اُٹھائے اور مشرقی پاکستان کے تخریب کار لیڈر بھی بھاگ گئے۔

ملٹری ایکشن کے متعلق بھارتی وقائع نگار اور مصنف منکیکر نے اپنی کتاب میں یہ رائے دی ہے — "دِلّی میں ایک سیاست دان نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یحییٰ خان (بھارت کی سب سے بڑی پاکستان دشمن سیاسی پارٹی) راشٹریہ سیوک سنگھ کا ایجنٹ ہے جسے اس پارٹی نے اسلام آباد میں پاکستان کو ختم کرنے کے لیے متعین کر رکھا تھا" — یہ رائے ازراہِ مذاق دی گئی ہے۔ ہم یحییٰ خان کو راشٹریہ سیوک سنگھ کا ایجنٹ تسلیم نہیں کرتے لیکن ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یحییٰ خان نے فوج کو ملٹری ایکشن کا جو حکم دیا تھا وہ دراصل شکست کی

طرف کوچ کے حکم کے مترادف تھا۔ یہاں ہم ایک بات دہرائیں گے۔ جنرل نیازی اور ان کے ماتحت جرنیلوں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اگر انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم ملا تھا تو وہ ایسا حکم ماننے سے انکار کر دیتے۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر فوجی قواعد و ضوابط اور ڈسپلن کے مطابق ملک کی سلامتی کی خاطر حکم عدولی جائز تھی تو اس کارِ خیر کی بسم اللہ جنرل ٹکا خان کو کرنی چاہیئے تھی۔ وہ ایسا ملٹری ایکشن شروع ہی نہ کرتے جس کی کامیابی کے لیے فوج بہت تھوڑی اور سیاسی حالات اس کے خلاف تھے مگر ۱۰ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز جنرل ٹکا خان نے یہ رپورٹ دی کہ ملٹری ایکشن کامیاب ہو گیا ہے۔

۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کو حکم ملا کہ وہ جنرل ٹکا خان سے ملٹری ایکشن کا چارج لے کر اس کارروائی کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور ایسٹرن کمانڈ کی کمان لے لیں۔ اس حکم کے ساتھ ہی جنرل ٹکا خان کا ملٹری ایکشن کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا اور وہ مشرقی پاکستان کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور گورنر بن گئے۔ وہ اب سیاسی امور اور شہری انتظامیہ کے ذمہ دار تھے۔ باغی لیڈروں اور دیگر افراد کی موت و حیات ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں اب مقدمے چلانے اور سزائیں دینی تھیں اور سیاسی تصفیے کرنے تھے۔ ان کے مشیرِ خاص جنرل راؤ فرمان علی تھے۔ جنرل نیازی کا شہری انتظامیہ اور سیاسی امور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا تعلق فوج اور فوجی کارروائی کے ساتھ تھا اور انہیں احکامات جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی سے ملتے تھے۔ چونکہ شکست کی ذمہ داری جنرل نیازی اور ان کے ماتحت جرنیلوں پر عائد کی گئی ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن حالات اور احوال و کوائف کو دیکھا جائے جن میں جنرل نیازی نے ایسٹرن کمانڈ کی کمان لی اور یہ بھی دیکھا جائے کہ اس کے بعد انہیں کتنی کچھ فوجی اور سیاسی پشت پناہی ملی یا ملی کہ نہیں۔ اگر ملی تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا یا نہیں اور اگر کوئی مدد نہیں ملی تو اس کا ذمہ دار کون تھا۔ یہ تو ہم پہلے دشمن کی زبانی واضح کر چکے ہیں کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست فوجی نہیں سیاسی تھی۔

۱۰ اپریل ۱۹۷۱ء تک مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان میں دو اور انفنٹری ڈویژن بھیجے جا چکے تھے مگر یہ خالصتاً انفنٹری ڈویژن تھے۔ ڈویژن میں صرف پیادہ نفری ہی نہیں ہوتی۔ اس میں فیلڈ، میڈیم اور ہیوی توپ خانہ ہوتا ہے آرمرڈ (ٹینک) رجمنٹ ہوتی ہے، انجینئرز بٹالین، ای۔ ایم۔ ای، سگنل بٹالین، ایمبولینس کور (ڈاکٹر وغیرہ) سپلائی کا محکمہ، گاڑیاں وغیرہ اور اس طرح کے لوازمات ہوتے ہیں مگر جو دو ڈویژن مغربی پاکستان سے بھیجے گئے انہیں نہایت عجلت میں صرف یہ احکام دیئے گئے کہ جس قدر جلدی ہو سکے پی آئی اے سے طیارے لو اور مشرقی پاکستان پہنچو۔ پی۔ آئی۔ اے کو سرکاری طور پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا کہ اُس نے فوراً طیارے مہیا کر دیئے۔ طیاروں کے ذریعے صرف نفری لے جائی جا سکتی تھی۔ ٹینک، توپیں، گاڑیاں اور طیارہ شکن توپیں، انجینئرنگ کا وزنی سامان طیاروں کے ذریعے نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ نفری کو طیاروں میں سوار کر کے مشرقی پاکستان پہنچا دیا گیا۔ اس نفری کے پاس ذاتی ہتھیار تھے۔ مثلاً رائفل یا شین گن یا لائٹ مشین گن اور ریوالور۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ اتنا ہی ایمونیشن تھا جتنا ایک جوان اُٹھا سکتا ہے۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ڈویژن چند گھنٹوں کی رُوٹ مارچ یا ایک آدھ دن کی جنگی مشق کے لیے جا رہے ہیں اور شام کو بارکوں میں واپس آ جائیں گے مگر انہیں اُس میدانِ جنگ میں بھیجا جا رہا تھا جہاں انہیں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک محاصرے کی حالت میں لڑنا تھا اور ان کے ساتھ توقعات یہ وابستہ کی گئی تھیں کہ وہ دشمن کو نیچا دکھائیں گے۔ مشرقی پاکستان میں راشن اور ایمونیشن کا جو سٹاک تھا وہ صرف نوّے دنوں کے لیے کافی تھا۔ یہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ جنگ کی صورت میں نوّے دنوں کا ایمونیشن کتنے دنوں میں ختم ہو جائے گا۔ توپ خانے اور ٹینک رجمنٹ کے بغیر ڈویژن نہیں لڑ سکتا لیکن مشرقی پاکستان میں سب سے زیادہ شدید ضرورت جو تھی وہ انجینئرنگ کے سامان کی تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان ندیوں، نالوں، دریاؤں، وسیع جھیلوں، دلدلی جنگلوں اور نشیب و فراز کی سرزمین ہے۔ وہاں چند فرلانگ کے بعد ایک ندی یا آبی رکاوٹ

آجاتی ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں کشتیوں کو اوّلیت حاصل ہے اور پُلوں کو۔ اگر چھوٹا سا ایک پُل تباہ ہو جائے تو فوج کی نقل و حرکت رُک جاتی ہے۔ وہاں بڑی ہی تیز ملٹری انجنیئرنگ سروس کی ضرورت تھی۔ مکتی باہنی نے کئی پُل اُڑا دیئے تھے۔ فوری طور پر عارضی پُل ڈالنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کشتیوں کی بھی کمی تھی۔ اپریل کے آخر میں ساون کی بارشیں شروع ہو گئیں۔ نقل و حرکت اور زیادہ دشوار ہو گئی۔

اِن ڈویژنوں کے ساتھ ڈاکٹر نہیں تھے۔ ڈاکٹری سامان نہیں تھا۔ ایمبولینس گاڑیاں نہیں تھیں۔ کمبل تک نہیں تھے۔ وردی تک کافی نہیں تھی۔ بُوٹ اور جرابوں کا فالتو سٹاک نہیں تھا۔ ٹروپس کو کشتیوں کی کمی اور پُل تباہ ہو جانے کی وجہ سے زیادہ تر پیدل چلنا تھا۔ پانی اور دلدل میں چلنا تھا جس میں بُوٹوں کے خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ یہ خطرہ دو ماہ بعد ہی سامنے آگیا۔ جوانوں کے بُوٹ پھٹ گئے۔ جرابیں پھٹ گئیں۔ مانگنے کے باوجود یہ ضرورت نہ پوری کی گئی۔ چنانچہ کئی جوان آخر دم تک ننگے پاؤں لڑتے رہے۔ ان کی وردیاں پھٹ گئی تھیں جو تبدیل نہ کی جا سکیں۔ یہی حال راشن کا تھا۔ جنرل فضل مقیم خان نے اپنی کتاب "پاکستان کا المیہ ۱۹۷۱" میں ایک بریگیڈیئر کا ذکر کیا ہے جس نے ۱۰ اپریل ۷۱ء کے بعد ملٹری ایکشن میں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک چپاتی کھائی تھی۔

وہاں سے آنے والے بتاتے ہیں کہ جونکوں اور مچھروں نے ٹروپس کو ادھ مُوا کر دیا تھا۔ وہ بیمار ہوتے تھے، زخمی ہوتے تھے مگر انہیں دیکھنے کے لیے کوئی ڈاکٹر نہیں تھا اور کوئی دوائی نہیں تھی۔ شہیدوں کو کفن کہاں نصیب ہوتا، کمبل بھی نہیں ملتا تھا کہ لاش کو اسی میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا۔ شہیدوں کو اُن کی پھٹی ہُوئی وردیوں میں ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ ٹروپس کو آرام دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شہیدوں کی کمی پُوری کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور ایمونیشن کی کمی پوری کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان ڈویژنوں کو کھُلی جنگ نہیں بلکہ گوریلا اور کمانڈو اپریشن کے خلاف لڑنا تھا۔ اس طریقۂ جنگ کی خصوصی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ANTI GUERRILLA WARFARE ایک

الگ تھلگ طریقۂ جنگ ہے جس کی الگ تھلگ ٹریننگ دی جاتی ہے اور اس کے لیے ہتھیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے کسی بھی ڈویژن کو اجتماعی طور پر ایسی ٹریننگ نہیں دی گئی تھی۔

ایک مشکل اور بھی پیش آئی۔ یہ ہتھیاروں سے متعلق تھی۔ ان ڈویژنوں کے پاس ہتھیاروں کی کھچڑی تھی۔ ان کے پاس جرمن ہتھیار بھی تھے، چینی بھی، امریکی اور برطانوی بھی۔ ہر ایک کا ایمونیشن الگ تھا۔ ایسے کئی بار ہُوا کسی دُور دراز پلاٹون یا کمپنی کو ایمونیشن بھیجا گیا تو پتہ چلا کہ یہ تو بیکار ہے کیونکہ ایمونیشن امریکی رائفلوں کا ہے اور جن رائفلوں کے لیے بھیجا گیا ہے وہ چینی ہیں۔ لہٰذا یہ دھیان بھی رکھنا پڑتا تھا کہ کسے کونسا ایمونیشن بھیجا جائے۔ آگے چل کر یوں بھی ہُوا کہ کسی ملک کا ایمونیشن ختم ہو گیا تو اُس ملک کے ہتھیار بے کار ہو گئے۔ ہتھیاروں میں یکسانیت بہت ضروری ہوتی ہے۔

اِس تجزیے کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم مکتی باہنی کی حقیقت بے نقاب کر دیں تو قارئین کرام کے لیے مناسب ہوگا۔ بتایا یہ جاتا رہا ہے کہ مکتی باہنی مشرقی پاکستان کے اُن بنگالی مسلمانوں کی پرائیویٹ یا رضاکار فوج تھی جو پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش بنانا چاہتے تھے۔ بھارت کے ایک مشہور و معروف ہندو لیڈر مرارجی ڈیسائی نے ۱۹۷۵ء میں ایک انکشاف کیا تھا۔ مرارجی ڈیسائی بھارت کے نائب وزیر اعظم اور وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ۲۷ جون ۱۹۷۵ء کے روز اٹلی کی ایک صحافی خاتون اوریانا فلاشی کو ایک انٹرویو دیا تھا جو امریکہ کے ہفت روزہ "نیوری پبلک" میں شائع ہُوا تھا۔ مرارجی ڈیسائی نے کہا تھا:

> "مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کا دراصل کوئی وجود نہ تھا۔ یہ سب کے سب بھارت کے تربیت یافتہ چھاپہ مار (کمانڈو) فوجی تھے جو بنگالی مسلمانوں کے بھیس میں اپریل سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک پاکستانی فوج کے خلاف لڑتے رہے اور دنیا کو یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے پاکستانی فوج کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیے ہیں۔ اندرا گاندھی نے (مسلمان) بنگالیوں کے بھیس میں

پاکستان سے دور ہٹتا جا رہا ہے۔ وہ احساسِ محرومی میں مبتلا تھے۔ ان کے اس احساس سے ہمارا دشمن پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔"

بریگیڈیئر صاحب داد خان جولائی ۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان گئے۔ فوراً ہی بعد دوسرے نشانِ حیدر میجر طفیل شہید کو بھی ایسٹ پاکستان رائفلز میں بھیج دیا گیا۔ بریگیڈیئر صاحب داد نے جب ایسٹ پاکستان رائفلز کی کمان لی تو اسے مکمل طور پر غیر منظم اور بیکار فورس پایا۔ یہ پولیس کے انسپکٹر جنرل کے ماتحت تھی جو اسے بے جا استعمال کر رہا تھا، بلکہ اس فورس کا محض وجود تھا۔ انفرادی حیثیت کوئی نہیں تھی۔ بریگیڈیئر صاحب داد نے ایک سچے پاکستانی کی طرح پاکستان کے اس خطّے کا فوجی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا۔ انہوں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ مجھے ان الفاظ میں سنایا:

"میں نے جب تمام علاقوں کو جنگی نقطۂ نگاہ سے دیکھا تو مجھے وہاں وہ خامیاں، حکومت کی وہ کوتاہیاں اور وزارتِ دفاع کی بے نیازیاں نظر آئیں جن کا نتیجہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں کہ پاکستان آدھا رہ گیا ہے اور اپنے چہرے پر ہم شکست کا بدنما دھبّہ لیے پھرتے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں وہاں فوج کا ایک پورا ڈویژن نہیں تھا۔ صرف دو بریگیڈ تھے۔ ایک ہوائی اڈہ بنا دیا گیا تھا مگر وہاں ایئر فورس کا ایک بھی طیارہ نہیں تھا۔ بندرگاہ موجود تھی مگر اپنی نیوی کا کوئی جنگی جہاز نہ تھا۔ ایک ایسٹ پاکستان رائفلز تھی جس کی اصل ذمّہ داری رینجرز کی طرح سرحدوں کا تحفظ تھی مگر یہ فورس غریب کی وہ روایتی بہو تھی جو سارے گاؤں کی جورو ہوتی ہے اور سرحد دشمن کے ایجنٹوں اور سمگلروں کے لیے کھلی تھی ——— پاکستان کو معرضِ وجود

اپنی فوج کو لڑانے کا جو تجربہ کیا وہ قطعاً ناکام ہوا اور اس میں بھارتی فوج کو زبردست جانی نقصان ہوا۔ یہ بازی ہارتے دیکھ کر بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف نے اندرا گاندھی سے کہا کہ مشرقی پاکستان سے تمام کمانڈو واپس بلا لیے جائیں یا مشرقی پاکستان پر کھلا حملہ کر دیا جائے ورنہ ہم نے وہاں جتنے بھی کمانڈو بھیجے ہیں وہ سب مارے جائیں گے..... اندرا گاندھی نے ۲ نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر کھلے حملے کا حکم دے دیا..... جس عورت نے اندرا گاندھی اور فاتح مشرقی پاکستان کے نام سے شہرت پائی ہے وہ دراصل ڈھینگیں مارنے والی عورت ہے جس نے بہروپ دھار رکھا ہے۔ اس میں سازش، عیّاری اور جوڑ توڑ کے ہنر کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ انڈین آرمی کے چیف آف سٹاف نے جب اندرا گاندھی سے کہا تھا کہ اپنے کمانڈو واپس بلا لیے جائیں ورنہ وہ مارے جائیں گے، یہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد کا عرصہ تھا جب پاک فوج کا ملٹری آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ ملٹری آپریشن کی کامیابی یہ تھی کہ باغی عناصر دب گئے تھے لیکن نقصان یہ ہوا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا تھا۔ محبِ وطن بنگالی بھی اس کی زد میں آ گئے اور پاکستان کے خلاف ہو گئے تھے۔ البتہ انڈین آرمی کی کمانڈو فورس کے لیے مشرقی پاکستان کی زمین تنگ ہو گئی تھی۔ اس فورس کی نجات کا یہی ایک راستہ تھا کہ وہاں سے نکل جاتی لیکن اندرا گاندھی نے اپنے چیف آف سٹاف کی دوسری تجویز منظور کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کی مغربی سرحد پر حملے کا حکم دے دیا۔

یہ حملہ ۲۱/۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات ہلّی سیکٹر میں ہوا تھا۔ یہ سرحدی جھڑپ نہیں تھی۔ اس محاذ پر پاک فوج کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی اور جو قلیل سے ٹروپس وہاں مورچہ بند تھے ان کے پاس ٹینک نہیں تھے اور توپخانہ بھی نہیں تھا اور ایئر فورس کی مدد بھی حاصل نہیں تھی۔ دشمن کو توقع ہو گی کہ وہ پاکستانیوں کے اس محاذ کو ایک ہی حملے میں اکھاڑ دے گا لیکن اس قلیل نفری نے دشمن کے ایک بریگیڈ کا، پھر دو بریگیڈوں کا، پھر پورے ڈویژن کا حملہ روکا۔ یہ بڑے پیمانے کی جنگ تھی جو ۲۱ نومبر سے ۳ دسمبر تک لڑی گئی۔ پاک فوج کے افسروں اور جوانوں نے ذاتی شجاعت کے حیران کن کارنامے کر دکھائے۔ انہوں نے دشمن کو بھی حیران و پریشان کر دیا۔

ہلّی کی جنگ کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ ہم بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کے

کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے ایک انٹرویو کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو بھارت کے مشہور و معروف ہفت روزہ "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کے شمارہ ۲۳/۱۶ دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو مشرقی پاکستان کا فاتح کہا جاتا ہے۔ جنرل نیازی نے اُسی کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ اُس نے انٹرویو میں کہا :

"(انڈین آرمی) کے نمبر ۲ ماؤنٹین ڈویژن نے سب سے پہلا حملہ ہلّی کے مقام پر کیا جہاں اُسے بڑے ہی سخت مقابلے اور پُرعزم مزاحمت کا سامنا ہوا۔ حملے کی ابتدا نمبر ۸ گارڈز بٹالین نے کی۔ بے انداز جانی نقصان اور دشمن (پاک فوج) کے تابڑتوڑ جوابی حملوں کے باوجود نمبر ۸ گارڈز نے ہمت نہ ہاری ... ہلّی کا معرکہ لڑا جا رہا تھا کہ نمبر ۲۰ ماؤنٹین ڈویژن کے نمبر ۶۶ بریگیڈ نے ہلّی اور دیناج پور کے درمیان سے گزرنے کے لیے حملہ کیا۔ اس حملے کو تقویت دینے کے لیے نمبر ۲۳ بریگیڈ نے بھی حملہ کر دیا۔ نمبر ۶۶ بریگیڈ کو بڑے ہی شدید مقابلے کا سامنا ہوا اور اس محاذ پر سب سے زیادہ خونریز لڑائی لڑی گئی۔"

ہلّی کی لڑائی کی تفصیلات پھر کبھی سنائیں گے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مکتی باہنی دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو فورس تھی۔ اس میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایّوب خان مرحوم نے اپنے دورِ صدارت کے آخری عرصے میں ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ انڈین آرمی کے پچاس ہزار سے اسّی ہزار تک کمانڈو مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کے بہروپ میں موجود ہیں۔

ایّوب خان مرحوم کو معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان میں بھارتی کمانڈو موجود ہیں، لیکن مرحوم نے انہیں پکڑنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ اس سوال کا جواب دینا ممکن نہیں کہ کارروائی کیوں نہیں کی تھی۔

مرارجی ڈیسائی نے یہ انکشاف ۱۹۷۵ء میں کیا تھا۔ اُس وقت اندرا گاندھی ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے ڈکٹیٹر بنی ہوئی تھی۔ مرارجی ڈیسائی کا یہ انٹرویو شائع ہوا تو

اس کے چند گھنٹوں بعد انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

انڈین آرمی کے کمانڈو بہت بعد میں مشرقی پاکستان میں داخل ہونا شروع ہوئے تھے، قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے معرضِ وجود میں آتے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں بھارت کے جاسوس اور تخریب کار موجود ہیں۔ قائدِ اعظمؒ گورنر جنرل کی حیثیت سے مارچ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان گئے تھے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کے روز ڈھاکہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا تھا۔ اس جلسے میں تین لاکھ سے زائد افراد شریک تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے تین بار السلام علیکم کہی تھی۔ انہوں نے تقریر میں کہا تھا :

"ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے دوسرے ملکوں سے اُجرت لے رہے ہیں۔ وہ پاکستان کو زمین دوز طریقوں سے تباہ کرنے کے مقصد کی تکمیل کے لیے سرگرم ہیں۔ آپ چوکنّے رہیں، ہوشیار اور چوکس رہیں۔ دلکش نعروں اور الفاظ سے متاثر نہ ہوں .... مَیں آپ کو کھلے لفظوں میں خبردار کرتا ہوں کہ آپ کے درمیان کمیونسٹ بھی موجود ہیں اور وہ بھی ہیں جو باہر سے مالی مدد لیتے ہیں۔ اگر آپ محتاط نہ ہوئے تو آپ تباہ و برباد ہو جائیں گے .... ہندوستانی اس ارادے سے دستبردار نہیں ہوئے کہ مشرقی پاکستان کو ہندوستان میں شامل کر لیا جائے گا۔ مَیں پُورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ جو لوگ مشرقی پاکستان کو ہندوستان میں شامل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں"۔

آگے چل کر قائدِ اعظمؒ نے اس تقریر میں کہا :

"ہندوستانی اخباروں نے واویلا بپا کر رکھا ہے کہ ملک کی تقسیم کے وقت دس لاکھ ہندوؤں کو مشرقی پاکستان سے ہندوستان کو بھاگ جانے پر مجبور کیا گیا۔ ہمارے (پاکستان کے) اعداد و شمار کے مطابق صرف دو لاکھ ہندو ہندوستان گئے ہیں۔ ہندوستان کے بعض لیڈر ہندوستان جانے والے ہندوؤں کی تعداد بہت ہی زیادہ بتا کر اور انہیں مظلوم قرار دے کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔ اس پروپیگنڈے میں ہندو مہاسبھا پیش پیش

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ بیس لاکھ ہندو موجود ہیں جو یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتے۔"

قائدِ اعظمؒ نے اُسی وقت جب پاکستان کی عمر ابھی سات مہینے اور سات دن تھی، دیکھ لیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہندو تخریبی کارروائیوں میں سرگرم ہو گئے ہیں۔ اس تقریر میں قائدِ اعظمؒ نے کہا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں یہ مسئلہ بھی سر اُٹھا رہا ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی یا بنگالی۔ کچھ سیاسی مفاد پرست اور موقع شناس افراد طلباء کو آلہ کار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے نوجوان دوستو! میرے دل میں تمہاری بے انداز محبت ہے۔ میری ایک بات غور سے سُن لو۔ اگر تم کسی بھی سیاسی پارٹی کے آلہ کار بن گئے تو یہ تمہاری سب سے بڑی لغزش ہو گی۔ میرے نوجوان دوستو! پاکستان کے اصل معمار تم ہو۔ اپنی صفوں میں اتحاد اور استحکام پیدا کرو۔ تمہارے دشمن نے پاکستان میں مسلمانوں کے درمیان نفاق پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں....

"میں آپ سے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ پاکستان کے جو دشمن ہیں اُن کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ بدقسمتی سے تمہارے ساتھ ففتھ کالمسٹ بھی ہیں اور میں افسوس سے کہتا ہوں کہ وہ مسلمان ہیں جنہیں باہر سے مالی معاوضہ ملتا ہے.... میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا آپ پاکستان میں یقین رکھتے ہیں؟"

تین لاکھ کے ہجوم نے بیک زبان کہا — "ہاں قائدِ اعظم، ہاں"۔

قائدِ اعظمؒ نے پوچھا — "کیا آپ چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان یا پاکستان کا کوئی حصہ ہندوستان کے پاس چلا جائے؟"

تین لاکھ بنگالیوں نے گرج کر کہا — "نہیں قائدِ اعظم، نہیں"۔

"اِن مفاد پرست لیڈروں سے بچو جو اپنے مفادات کی خاطر تمہیں آلہ کار بنا رہے ہیں۔ ہم میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے تحریکِ آزادی میں ہمارا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بعض نے کُھلے بندوں ہماری جدوجہد میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دشمن کے ساتھ مِل کر ہمارے خلاف کام

کیا ہے۔ اب وہ دلکش نعرے، جذباتی تقریریں اور بڑے دلچسپ پروگرام لے کر تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ تمہیں اِن لوگوں کی نہیں بلکہ اتحاد، استحکام اور ڈسپلن کی ضرورت ہے۔ بٹ جاؤ گے تو گِر دو گے، متحد رہو گے تو کھڑے رہو گے۔"

پھر کیا بات ہوئی کہ اُن ہی بنگالیوں کا ہجوم چوبیس سال بعد پاکستان کا دشمن ہو گیا جس نے قائدِ اعظمؒ کے اس سوال کے جواب میں، کیا آپ پاکستان میں یقین رکھتے ہیں گرج کر کہا تھا، ہاں قائدِ اعظمؒ ہاں؟ اِن ہی بنگالیوں نے مشرقی پاکستان کے ہندوستان کے پاس چلے جانے کے سوال کے جواب میں اور زیادہ بلند آواز سے کہا تھا — "نہیں قائدِ اعظمؒ نہیں" — لیکن چوبیس سال بعد انہوں نے ہندوستان کی فوج کا استقبال کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنگالیوں کے ہجوم نے پاکستان کے خلاف نعرہ نہیں لگایا تھا۔ جو کچھ ہُوا ڈھاکہ میں ہُوا۔ وہ ہجوم جسے عوام کہا جاتا ہے اور جو ڈھاکہ کے دیہات میں آباد تھے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مرکز مغربی پاکستان میں تھا اور مشرقی پاکستان سے بے پرواہ۔ قائدِ اعظمؒ نے خبردار کیا تھا کہ سیاسی مفاد پرست اور موقع شناس افراد طلباء کو آلہ کار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور طلباء سے قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا کہ وہ کسی بھی سیاسی پارٹی کے آلہ کار بن گئے تو یہ اُن کی سب سے بڑی لغزش ہو گی۔ ہُوا یہی کہ بھارت نواز علیٰحدگی پسند عناصر نے طلباء کو ہی آلہ کار بنایا۔ پہلے ان کے منہ میں "قومی زبان بنگالی" کا نعرہ دیا پھر ان کے ذہنوں میں علیٰحدگی کا بیج بویا۔

شیخ مجیب الرحمٰن دُور اندیش اور دانشمند لیڈر نہیں تھا۔ اُسے بھارت کی پُشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جوشیلا مقرر تھا۔ اشتعال انگیز تقریر سے مجمع کو آگ بگولہ کر دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اُس نے طلباء اور دیگر نوجوانوں کو پاکستان کے خلاف اتنا بھڑکا دیا تھا کہ وہ خود اُس کے قابو سے نکل گئے تھے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں جب یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا بُلایا ہُوا اجلاس منسوخ کر دیا تو شیخ مجیب الرحمٰن نے اگلے روز ڈھاکہ میں جلسۂ عام کا اعلان کر دیا۔ رپورٹ ملی تھی کہ مجیب الرحمٰن آزادی کا اعلان کرے گا۔

اُس وقت جنرل یعقوب وہاں ملٹری گورنر تھے۔ انہوں نے ٹیلیفون پر شیخ مجیب کے ساتھ بات کی اور اُسے کہا کہ وہ جلسہ ضرور کرے لیکن آزادی کا اعلان نہ کرے۔ پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ کی فضائیہ کے کمانڈر ایئر کموڈور مسعود نے ایک ملاقات میں ہمیں بتایا تھا کہ شیخ مجیب جنرل یعقوب کے ساتھ فون پر بات کرتے ہوئے رو پڑا اور اُس نے کہا کہ میری حفاظت کا انتظام کر دو، مَیں خود اپنے پیروکاروں (طلباء وغیرہ) سے خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ اب میں اس راستے سے ہٹنا چاہوں تو بھی نہیں ہٹ سکتا ورنہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

شیخ مجیب نے طلباء اور دیگر نوجوانوں میں ایسی آگ بھر دی تھی کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو وہ اپنے لوگوں کے لیے مصیبت بن گئے تھے۔ انہیں جو اسلحہ دیا گیا تھا وہ واپس ہی نہیں کرتے تھے اور گلیوں میں گولیاں فائر کرتے پھرتے اور جسے چاہتے گولی مار دیتے تھے۔

یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ ذکر ہو رہا تھا قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا جس میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو خبردار کیا تھا کہ دشمن اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے ان کے درمیان موجود ہے۔ قائدِ اعظمؒ اس تقریر کے چھ ماہ بعد فوت ہو گئے۔ ان کے بعد جو آئے انہوں نے مشرقی پاکستان کو بے دردی سے نظرانداز کر دیا۔

مشرقی پاکستان ہمارا دُور افتادہ حصہ تھا۔ محلِ وقوع کے لحاظ سے یہ ہر طرف سے دشمن کے محاصرے میں ہے۔ یہ دشمن مشرقی پاکستان کے اندر بھی موجود تھا۔ یُوں کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارا یہ خطہ جو آدھا پاکستان تھا، دشمن کی گرفت میں تھا۔ دفاع کے بعد اہمیت کے حامل وہاں کے لوگ تھے۔ وہ بہت غریب تھے۔ زمین سے روزی حاصل کرنے کی دشواریوں کے علاوہ وہ دریائی سیلابوں اور سمندری طوفانوں کی زد میں رہتے اور ہر سال تباہ و برباد ہوتے اور لاکھوں کی تعداد میں مرتے تھے۔

اُن کے شب و روز کی دشواریوں اور تلخیوں کے علاوہ اُن کی نفسیات بھی ہم سے جُدا تھی۔ مغربی پاکستان سے اتنی دُوری بھی ان کی نفسیات پر اور اُن کی سیاسی اور معاشی سوچوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اپنائیت جو دونوں بازوؤں کے درمیان تھی وہ دُوری کی وجہ سے کبھی بیگانگی میں بھی بدل جاتی تھی۔ بنگالی مسلمان یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ دشمن کے حملے کی صُورت میں مغربی پاکستان والے اُن کی مدد کو پہنچیں گے بھی یا نہیں۔

ادھر مغربی پاکستان میں یہ صورتِ حال بنی ہوئی تھی کہ قائدِ اعظمؒ فوت ہو چکے تھے۔ لیاقت علی خان قتل ہو چکے تھے اور کراچی جو پاکستان کا دارالحکومت تھا، اقتدار کی جنگ کا اکھاڑہ بنا ہُوا تھا۔ وزارتیں ٹوٹتی تھیں، بنتی تھیں اور جوڑ توڑ گٹھ جوڑ کا سلسلہ عروج پر تھا۔ ملک معاشی بدحالی، سیاسی غنڈہ گردی، لاقانونیت اور جرائم کی لپیٹ میں آیا ہُوا تھا۔

ہم چونکہ مشرقی پاکستان میں اپنی شکست کے اسباب بیان کر رہے ہیں اس لیے ہم وہی صورتِ حال بیان کریں گے جو وہاں بنی ہوئی تھی بلکہ ہمارے اقتدار پرست لیڈروں اور حکمرانوں نے بنا دی تھی۔ یہ ہم ایک ایسی ذمہ دار شخصیت کی زبانی پیش کریں گے جس کی رائے اور جس کے مشاہدات مستند ہیں۔ یہ ہیں بریگیڈیئر ریٹائرڈ صاحب داد خان جو وزیر رہ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے متعلق وہ اس لیے وثوق سے بات کر سکتے ہیں کہ ۱۹۵۸ء میں جب وہ ابھی سروس میں تھے، انہیں مشرقی پاکستان ایسٹ پاکستان رائفلز کو منظم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

بریگیڈیئر صاحب داد خان پاک فوج کے پہلے افسر ہیں جنھوں نے مشرقی پاکستان میں ایسٹ پاکستان رائفلز کو ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے ایک مؤثر اور فعال فورس بنایا تھا۔ اُس وقت تک ایسٹ پاکستان رائفلز کی کیفیت یہ تھی کہ یہ نہ تو باقاعدہ فوج تھی نہ سرحدی پولیس نہ شہری پولیس بلکہ یہ سب کچھ تھی۔ اس کا کمانڈر انسپکٹر جنرل پولیس تھا۔ اس فورس کو سرحد پر بھی استعمال کیا جاتا تھا اور ضرورت پڑتی تھی تو اسے شہر میں بھی بلا لیا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت رینجرز کی ہونی چاہیئے تھی جیسے مغربی پاکستان میں ستلج اور انڈس رینجرز ہیں۔ ایسٹ پاکستان رائفلز ڈیوٹی کے لحاظ سے بھی اور تنظیم کے لحاظ سے بھی انتشار کا شکار تھی۔ ۱۹۵۸ء میں اس کی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مقصد کے لیے اس کا پہلا اقدام

ڈائریکٹر جنرل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے کے تحت بریگیڈیئر صاحب داد خان کو ایسٹ پاکستان رائفلز کا پہلا ڈائریکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ انہوں نے جولائی ۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان میں جا کر اس فورس کا چارج لیا جس کے نہ تو فرائض واضح تھے نہ حیثیت۔

مَیں نے بریگیڈیئر صاحب داد خان سے پوچھا کہ آپ ۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان گئے اور ایسٹ پاکستان رائفلز کا چارج لیا تو کیا آپ نے محسوس کیا تھا کہ ایک دن ہمیں وہاں سے شکست کھا کر نکلنا پڑے گا؟

"وہاں بلاشک وشبہ ایسے آثار پائے جاتے تھے" — بریگیڈیئر صاحب داد نے جواب دیا — "مَیں نے ۱۹۵۸ء میں محسوس کیا تھا کہ مشرقی پاکستانیوں کا دِل مغربی میں آئے گیارہ سال گزر چکے تھے۔ یہ کیفیت ہمارے ملک کے اُس خطے کی تھی جو تین اطراف سے دشمن کے گھیرے میں تھا بلکہ اپنی نیوی کی غیر موجودگی میں چوتھی طرف یعنی سمندری راستہ بھی دشمن کے لیے کُھلا تھا۔ مشرقی پاکستان کا دفاع تو غیر معمولی طور پر مضبوط ہونا چاہیئے تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ڈھاکہ کے سوا وہاں کا ہر ضلع سرحد سے ملا ہُوا تھا...

"ہر وہ بنگالی جو دفاعی امور کو سمجھتا تھا اس احساس میں مبتلا تھا کہ مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کے دفاع سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ یہاں تک کہتے تھے کہ پنجابی اور پٹھان مشرقی پاکستان کے لیے نہیں لڑیں گے۔ یہ تاثر سُوجھ بُوجھ رکھنے والے صرف عوام میں ہی نہیں پایا جاتا تھا، وہاں کے وزیر اور دیگر اعلیٰ حکام برملا کہتے تھے کہ مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کا دفاع نہیں کریں گے۔"

بریگیڈیئر صاحب داد کو وہاں بڑا ہی تلخ تجربہ ہُوا۔ انہوں نے ایسٹ پاکستان رائفلز کی حالت دیکھی تو انہیں انقلابی قسم کی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے لیے انہیں وہاں کے متعلقہ وزیروں اور اعلیٰ حکام کی مدد لینی پڑی مگر پہلے ہی وزیر نے ان کے ساتھ ایسے لب ولہجے میں بات کی جسے دھتکار دینا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُس نے کچھ اس قسم کی بات کی کہ تم لوگ مغربی پاکستان میں عیش کرتے کرتے یہاں حکومت کرنے آجاتے ہو۔

اس کے بعد بریگیڈیئر صاحب داد خان کو ہر ایک بنگالی وزیر اور سی ایس پی افسر سے اسی قسم کی طنزیہ باتیں سننی پڑیں اور بریگیڈیئر صاحب داد اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف عوام میں ہی نہیں بلکہ سرکاری حلقوں میں بھی اور سیاسی لیڈروں میں بھی یہ وہم یقین کی صورت اختیار کر گیا ہے کہ مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کے دفاع میں نہیں لڑیں گے۔ بریگیڈیئر صاحب داد وہاں کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں سے بھی ملے۔ ان کے تاثرات بھی یہی تھے۔

"مَیں نے فیصلہ کر لیا" — بریگیڈیئر صاحب داد خان نے کہا — "کہ مَیں بنگالیوں کا یہ وہم دُور کر دوں گا کہ ہم ان کے لیے لڑیں گے نہیں، مگر مَیں نے نمایاں طور پر دیکھا کہ یہ وہم بنگالیوں کی رگوں میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سدِ باب نہ کیا گیا تو نتائج بھیانک ہوں گے۔ اس وہم کو بنگالیوں کے خون میں پُوری طرح شامل کرنے کے لیے ہمارا دشمن جانفشانی سے سرگرم تھا۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں تو بھارت نے کُھلا حملہ کیا تھا لیکن اس کا زمین دوز حملہ برسوں پہلے شروع ہو چکا تھا اور نومبر ۱۹۷۱ء میں ہماری تاریخ جس حادثے سے دوچار ہُوئی وہ اس ڈرامے کا آخری منظر تھا...

"مشرقی پاکستان میں ایک تو افواج کی کمی کی وجہ سے بنگالی بجا طور پر یقین سے کہنے لگے تھے کہ فوج مغربی پاکستان کی ہے جس پر بنگالیوں کا کوئی حق نہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان والے عیش کر رہے ہیں اور ان کا حصہ وہ کھائے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ انہیں سیاست میں برابر کی نمائندگی نہیں مل رہی۔ بہرحال وہ محرومی کے ایسے احساس میں مبتلا تھے جو مبالغہ آمیز حد تک شدید ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہاں کئی ایک کارخانے اور ترقیاتی منصوبے شروع ہو چکے تھے۔"

جب بریگیڈیئر صاحب داد مجھے یہ باتیں بتا رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ ایوب خان مرحوم کے دورِ حکومت میں ایک بار مشرقی پاکستان کا ایک وزیر شمس الضحیٰ لاہور آیا تو مجھے یہ فرض سونپا گیا کہ اُسے لاہور کی سیر کراؤں۔ اُس نے مال روڈ پر الفلاح، واپڈا ہاؤس، اسمبلی ہال اور دوسری بڑی بڑی عمارتیں دیکھیں اور مال

روڈ پر فیشن کی نمائش دیکھی تو اس نے مجھے کہا — "آپ لوگ عیش کر رہے ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی غیر ملک میں آگیا ہوں۔ ہمارے ہاں تو صرف جھگیاں ہیں۔"

میں نے فوراً اس کی سیر کا روٹ بدل دیا اور اسے وہ لاہور دکھایا جہاں جھگیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ میں نے وہ علاقے دکھائے جہاں کا ہر انسان مفلسی اور مشقت کی چلتی پھرتی تصویر ہوتا ہے۔ پھر میں نے اسے بھکاریوں کی قطاریں دکھائیں اور میں نے اسے اکبری منڈی دکھائی جہاں انسان گھوڑوں گدھوں کی طرح ریڑھے کھینچتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا وزیر بے ساختہ بول اٹھا — "یہ لوگ بنگالیوں سے بہتر نہیں۔"

میں نے کہا — "اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو لوگوں کے گھروں میں لے چلوں گا اور ان کی ہانڈیاں دکھاؤں گا جن میں دال کے سوا کچھ نہیں پکتا اور وہ چولہے دکھاؤں گا جو کبھی کبھی جلا کرتے ہیں.... آپ مال روڈ کو سارا مغربی پاکستان نہ سمجھیں جس طرح ہم ڈھاکہ کے جدید تعمیرات کے حصے کو مشرقی پاکستان نہیں سمجھتے۔"

مشرقی پاکستان کے وزراء، حکام اور سیاسی لیڈر لاہور کی مال روڈ اور اسلام آباد کی جدید شان و شوکت دیکھ کر مغربی پاکستان کو خوش حال اور عیاش سمجھتے رہے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی یہی مغربی پاکستان دیکھا تھا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کا اصل روپ نہ دیکھا نہ انہیں دکھایا گیا۔

بریگیڈیئر صاحب داد بتاتے ہیں کہ بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے مشرقی پاکستان والوں کا یہ وہم یقین میں بدل دیا کہ مغربی پاکستان والوں نے مشرقی پاکستان کو مفلسی میں دھکیل دیا ہے۔ دشمن کا یہ پروپیگنڈہ جن وجوہات کی بنا پر کامیاب ہوا ان میں ایک یہ ہے کہ اپنا ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن اس قدر کمزور تھا کہ سارے مشرقی پاکستان میں سنا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لوگ آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سنتے تھے جو مشرقی پاکستان میں دور دور تک نہایت صاف سنا جا سکتا تھا۔

پروپیگنڈے کا دوسرا مؤثر ذریعہ اخبار ہوتے ہیں۔ دریائے برہم پترا کے مغربی کنارے کے اضلاع میں جن میں جیسور، کھلنا، راجشاہی، دیناج پور اور رنگ پور خاص طور پر شامل ہیں، بھارتی اخبارات علی الصبح پہنچ جاتے تھے۔ ڈھاکہ کے اخبار وہاں تک جلدی پہنچانے کا کوئی انتظام نہ تھا نہ ہی اپنے کسی حکمران نے کبھی پروپیگنڈے کی ضرورت محسوس کی۔ حکومت جس کے ہاتھ آگئی اس نے ملک کے اخباروں اور ریڈیو کو اپنی تشہیر کے لیے استعمال کیا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ عوام اپنے اخباروں سے بیزار ہو کر بھارت کے اخباروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بھارت نے کلکتہ کو پروپیگنڈے کا مرکز بنا رکھا تھا۔

سرحدوں کا تعین ایسا ہوا تھا کہ دونوں ملکوں کی کھیتیاں گڈمڈ تھیں۔ دونوں ملکوں کے کسان ایک ہی ملک کے باشندوں کی طرح اکٹھے کام کرتے اور میل جول سے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف سمگلنگ کھلے بندوں ہوتی تھی بلکہ دشمن کے ایجنٹ ہمارے کسانوں کو مغربی پاکستان کے خلاف گمراہ کرتے رہتے تھے۔ اس کا سدباب نہ کیا گیا۔

مغربی پاکستان کے خلاف بیزاری کا تاثر نوجوان طلبا میں زیادہ شدید تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہاں کے زیادہ تر اساتذہ اور پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ تھے۔ اس کے مقابلے میں غیر بنگالی پروفیسر وغیرہ علی گڑھ، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے گئے تھے۔ ان کے طور طریقے بنگالی طلبا کے لیے اجنبی اور غیر ملکی سے تھے۔ کلکتہ کے پڑھے ہوئے اساتذہ میں جو بنگالی پن تھا، وہ بنگالیوں کو اچھا لگتا تھا۔ بھارت نے سب سے پہلے ان بنگالی پروفیسروں وغیرہ کو مغربی پاکستان کے خلاف کیا پھر ان کی وساطت سے طلباء کے ذہنوں میں زہر بھرا۔

بھارت اور علیحدگی پسند عناصر نے یونیورسٹی کو خاص طور پر پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا میں علیحدگی کی تحریک زیادہ شدید تھی۔ مجیب انہی کا لیڈر تھا اور وہ طلباء کے کچے ذہنوں میں مغربی پاکستان کے خلاف خوب زہر بھر رہا تھا اور انہیں قائل کر رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جو غیر بنگالی ہیں وہ غیر ملکی ہیں جو

بنگالیوں کا خون چُوسنے آگئے ہیں۔ اس طرح مجیب ابتدا ہی سے یعنی ۱۹۵۸ء سے بھی پہلے طلبار کے ذہنوں پر قبضہ کر کے مغربی پاکستان سے علیحدگی کے لیے محاذ تیار کر رہا تھا۔ چونکہ وہ ایک جوشیلا مقرر تھا اور جوان سال بھی تھا اور چونکہ اُس کے ذہن میں تخریبی راستہ واضح تھا اس لیے وہ طلبار میں زیادہ مقبول تھا اور اُن پر اس کی ہر بات اثر رکھتی تھی۔

بریگیڈیر صاحب داد خان وہاں چار سال رہے۔ اِن چار سالوں میں یعنی ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۶۲ء تک انہوں نے وہاں جو غیر معمولی کام کیے ان کی تفصیلات ذرا لمبی ہیں۔ مَیں ان کے مشاہدات اور تاثرات بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بریگیڈیر صاحبداد کہتے ہیں کہ جب وہ مشرقی پاکستان سے واپس آئے تو اُس وقت تک ملک سیاسی لحاظ سے دو حصوں میں بٹ چکا تھا — مشرقی اور مغربی — مارشل لار ۱۹۵۸ء میں نافذ ہُوا تھا۔ بریگیڈیر صاحب داد خان کے مشاہدات کے مطابق مشرقی پاکستان کے سیاسی قائدین کو مارشل لار کا نفاذ بالکل پسند نہیں تھا۔ اُنہوں نے عوام اور طلبار کو یہ تاثر دیا کہ انہیں فوجی ڈکٹیٹر شپ میں جکڑا جا رہا ہے۔ پھر جب ۱۹۶۲ء کا آئین نافذ کیا گیا تو مشرقی پاکستان میں باقاعدہ احتجاجی تحریک چلی اور مظاہرے بھی ہوئے۔ جنرل اعظم خان گورنر تھے اور یہ واحد مغربی پاکستانی حاکم تھے جن کے مخلصانہ روّیے اور برادرانہ سلوک کی بدولت بنگالیوں نے انہیں دل و جان سے قبول کیا۔ اس سے بنگالیوں کی نفسیات کھُل کر سامنے آگئی۔ ہمارا آمر عقل سے کام لیتا تو جنرل اعظم کے متعلق بنگالیوں کے نفسیاتی ردِعمل کے مطابق ان کے دِل جیت سکتا تھا مگر جنرل اعظم کو خلوص کی یہ سزا ملی کہ انہیں گورنری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ مشرقی پاکستان میں جنرل اعظم کی سبکدوشی کے خلاف مظاہرے ہوئے تھے۔ بنگالی جنرل اعظم کو دل و جان سے چاہتے تھے کیونکہ جنرل اعظم نے ان کے کچھ مسئلے حل کر دیے تھے۔

اُس وقت بریگیڈیر صاحب داد خان ایسٹ پاکستان رائفلز کو ایک موثر اور فعال فورس بنا چکے تھے اور ایسٹ بنگال رجمنٹ بھی پاک فوج کی باقاعدہ

یونٹ بن چکی تھی اور مزید یونٹیں تیار کی جا رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان کے اُن عناصر نے جو مغربی پاکستان کے خلاف کام کر رہے تھے، اپنی تخریبی توجہ ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس پر مرکوز کر دی۔ ان یونٹوں میں وہی زہر پھیلایا گیا جو طلبار اور عوام میں پھیلایا جا رہا تھا۔ ان بنگالی فوجیوں اور پولیس والوں نے یہ پروپیگنڈہ قبول کر لیا۔ بنگالی نوجوان جو کمشن لے کر فوج میں آتے تھے، اعداد و شمار کی روشنی میں بنگالی سپاہیوں وغیرہ کو بتاتے تھے کہ مغربی پاکستان والے اقتصادی طور پر عیش کر رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار بے بنیاد ہوتے تھے مگر بنگالی نوجوان افسر انہیں صحیح تسلیم کرتے تھے کیونکہ یہ اعداد و شمار ہندو پروفیسروں سے ملتے تھے۔ یعنی یونیورسٹی، کالج اور سکول مغربی پاکستان کے خلاف نہایت منظم اور پُر اثر پروپیگنڈے کے مراکز بن چکے تھے۔

کیا اپنی سول اور فوجی انٹیلی جنس علیحدگی پسند عناصر کی ان سرگرمیوں سے بے خبر تھی؟ کیا ہماری انٹیلی جنس اتنی گئی گذری تھی کہ اسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان کے اندر سرگرم ہے؟ پوری طرح باخبر تھی مگر حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کو مٹی کے لیپ سے بند کرنے کی کوشش کی جاتی رہی اور لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔

جہاں تک بریگیڈیر صاحب داد کا تعلق تھا، وہ ایسٹ پاکستان رائفلز کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ سرکاری پالیسیاں اُن کے دائرہ اختیار سے باہر تھیں۔ وہ آج صرف یہی کام کر سکتے ہیں کہ قوم آج جس حادثے سے دوچار ہے اور جو ہماری تاریخ کی دردناک اور شرمناک ٹریجڈی ہے، اس کے متعلق وہ پوری طرح بیان کر سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی تھی۔ یہ لاوا اُن کی نظروں کے سامنے پکتا رہا مگر وہ حکامِ بالا کو خبردار کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے اور نہ اِن کے مشاہدات پر کسی نے توجہ دی کیونکہ توجہ دینے والے اسلام آباد میں نیا دارالخلافہ تعمیر کرنے میں مگن تھے جہاں ملکی اور غیر ملکی تعمیراتی کمپنیاں اور ٹھیکیدار اور متعلقہ محکموں کے اہلکار اربوں روپیہ کھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ بریگیڈیر صاحب داد کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ یہ ایوب خان کا دورِ حکومت تھا۔

بریگیڈیئر صاحب داد خان نے ایسٹ پاکستان رائفلز کی تنظیم نو کی ابتدا کی اور بڑی ہی مشکل سے حکام بالا اور متعلقہ وزرا سے تعاون حاصل کیا۔ دیگر وجوہات کے علاوہ حکام سے تعاون نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سمگلنگ کراتے اور دولت کماتے تھے۔ وہ ایسٹ پاکستان رائفلز کو اسی طرح مفلوج سی فورس بنائے رکھنا چاہتے تھے تاکہ سرحدوں پر کڑا پہرہ نہ رہے اور سمگلنگ ہوتی رہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں کی حکومت کے حکام نہیں چاہتے تھے کہ ایسٹ پاکستان رائفلز انسپکٹر جنرل پولیس کی کمان سے نکل جائے۔ بریگیڈیئر صاحب داد نے اس رُجحان کا سراغ لگایا اور ایسٹ پاکستان رائفلز کو انسپکٹر جنرل پولیس کی کمان سے نکال کر اپنی کمان میں لے لیا۔ اُس وقت اِس فورس میں بنگالیوں کے علاوہ پنجابی اور پٹھان بھی تھے۔

اگست ۱۹۵۸ء میں خدا نے بریگیڈیئر صاحب داد کو ایک موقع فراہم کر دیا کہ وہ بنگالیوں پر ثابت کر سکیں کہ پنجابی اور پٹھان ان کی آن پر مر مٹیں گے۔ اُس وقت تک بھارت کا رویّہ یہ تھا کہ سرحد پر جہاں جی چاہتا تھا اپنی فوج کا دستہ بھیج کر مشرقی پاکستان کے تھوڑے سے علاقے پر قبضہ کر لیتا تھا۔ جب ہمارے مقامی افسر بھارتی افسروں کو صلح صفائی سے تصفیہ کرنے کے لیے مدعو کرتے تھے تو وہ طنزیہ انداز سے صاف ٹال جاتے تھے۔ بھارت کے اُس وقت کے وزیرِاعظم پنڈت نہرو کا رویہ بھی یہی تھا۔ وہ ہماری حکومت کے احتجاجی مراسلوں کا جواب ہی نہیں دیتا تھا نہ ہی ہماری حکومت کی یہ تجویز قبول کرتا تھا کہ سرحدی تنازعوں کے لیے بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظموں کی کانفرنس منعقد کی جائے۔

بھارتیوں کے حوصلے یہاں تک بڑھ گئے کہ انہوں نے ایک سرحدی مقام لکشمی پور کے خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا اور ہماری سرحد کے اندر پکّے مورچے قائم کر لیے۔ بریگیڈیئر صاحب داد خان نے فوری کارروائی کی اور یہ کارروائی جو جنگی نوعیت کی تھی، دونوں ملکوں کی تاریخ کا ایک اہم اور خونریز معرکہ بن گیا۔ اسے لکشمی پور کا معرکہ کہتے ہیں جس نے پاکستان کو دوسرا نشانِ حیدر دیا۔ یہ تھے میجر طفیل محمد۔ نائب صوبیدار محمد اعظم بھی اس معرکے میں شہید ہوئے۔ انہیں ستارۂ

جرأت دیا گیا تھا۔ اس معرکے سے پہلے بریگیڈیئر صاحب داد نے میجر طفیل شہید سے کہا تھا کہ ہمیں بنگالیوں کو دکھانا ہے کہ پنجابی اور پٹھان مشرقی پاکستان کے لیے کس طرح جانیں قربان کریں گے۔ چنانچہ میجر طفیل، نائب صوبیدار محمد اعظم اور پنجابی اور پٹھان جوانوں نے دشمن کے مورچوں کو نہایت دلیرانہ حملے سے تہس نہس کر کے اس کی بیشتر نفری کو لاشوں میں بدل کر اور ان کے کمانڈر میجر برٹن کو گرفتار کر کے بنگالیوں کے وہم اور وسوسے دُور کر دیئے۔

اسی معرکے کے دوران شُرماوادی میں بھارتیوں نے سرحد کے اندر آکر فائرنگ شروع کر دی۔ بریگیڈیئر صاحب داد میجر طفیل کو لکشمی پور کے معرکے کے لیے خدا حافظ کہہ کر شُرماوادی کی سمت چلے گئے اور بھارتیوں کی رائفلوں کو ایسی شدید جنگی کارروائی سے خاموش کیا کہ دِلّی کے ایوان بھی لرز گئے۔ لکشمی پور کے معرکے نے پنڈت نہرو کو اس حد تک دہشت زدہ کر دیا کہ اُس نے ہمارے اُس وقت کے وزیرِاعظم فیروز خان نون مرحوم کو ایک کانفرنس کی دعوت دی جو بعد میں نون نہرو کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس کے بعد مشرقی پاکستان کی سرحد پر جہاں بھارتی فوج یا سرحدی پولیس سر اُٹھاتی تھی، ایسٹ پاکستان رائفلز قہر آلود کارروائی کر کے اُسے دبا لیتی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب داد نے حکم دے رکھا تھا کہ سرحد پر کہیں بھی دشمن حرکت کرے حکم اور اطلاع کے بغیر گولی چلا دو۔ ایک بار برما کی سرحدی پولیس نے اراکان کی چند ایک مسلم لڑکیوں کو بے آبرو کر ڈالا تو بریگیڈیئر صاحب داد کے حکم سے برمیوں کی سرحدی پوسٹوں پر حملہ کر کے ان کے سرحدی دستوں کو ہلاک کر دیا گیا اور ان کی پوسٹوں کو آگ لگا دی گئی۔

اس کے بعد اور ایسے کئی ایک واقعات کے بعد ایسٹ پاکستان رائفلز ایک ایسی فورس بن گئی جس نے ملک میں اپنے عوام کو اور سرحد پار دشمن کو اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بریگیڈیئر صاحب داد نے ایسٹ پاکستان رائفلز کو نئی تنظیم سے ایک ایسی حیثیت دلا دی جو پولیس اور فوج سے آزاد تھی اور جس کے سامنے اب واضح فرائض تھے۔ لکشمی پور کے معرکے میں اس فورس نے جس عظمت کا ثبوت دیا اس سے متاثر ہو کر بنگالی فخر سے اس [illegible] نے لگے

جولائی ۱۹۶۲ء میں بریگیڈیئر صاحب داد کو اس فرض سے سبکدوش کر کے مغربی پاکستان بلا لیا گیا اور پشاور کا سب ایریا کمانڈر بنا دیا گیا۔

"مشرقی پاکستان کی جنگ کی ابتداء ۱۹۵۸ء سے بہت پہلے ہو چکی تھی" — بریگیڈیئر صاحب داد خان نے کہا — "مشاہدات اُوپر بیان کیے جا چکے ہیں جو مشرقی پاکستان کو ہم سے دُور لیے جا رہے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ عوامل مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک چلاتے ہیں یا ہمارے حاکم ان کا کوئی پُرامن سدِّباب کرتے ہیں یا نظرانداز کر کے خانہ جنگی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ ہُوا بہت بُرا ہُوا۔ وہاں ایسی خانہ جنگی ہوئی جسے بھارت کی پشت پناہی اس حد تک حاصل تھی کہ ہمارے دشمن نے اپنے ملک میں رفیوجی کیمپوں کو گوریلا ٹریننگ سنٹر بنائے رکھا۔ مکتی باہنی کو اسلحہ بارُود اور دیگر جنگی مدد دے کر ملک کے اندر گھر گھر مورچہ بنا دیا اور آخر کار کُھلا حملہ کر کے ہماری فوج کو اندر کے مورچوں اور باہر کے حملے کے درمیان بے بس کر کے ہتھیار ڈلوا لیے۔"

مَیں نے بریگیڈیئر صاحب داد خان سے پوچھا — "کیا یہ المیہ ٹل سکتا تھا؟ یعنی یہ شکست فتح میں بدلی جا سکتی تھی؟"

"مشرقی پاکستان کا المیہ ٹل سکتا تھا بشرطیکہ بیس سال پہلے اس کی طرف توجہ دی جاتی" — بریگیڈیئر صاحب داد خان نے جواب دیا — "مَیں بیان کر چکا ہُوں کہ بنگالی باغی کیوں ہوئے۔ اگر وہاں بغاوت کا رجحان پیدا ہو ہی گیا تھا تو اُسے پُرامن طریقے سے اور گفت و شنید سے فرو کرنا چاہیئے تھا اور اگر تشدد ہی کرنا تھا تو اُس وقت کرنا تھا، جب باغیوں کے ابھی پاؤں نہیں جمے تھے۔ فوجی کارروائی بہت دیر سے شروع کی گئی۔ ہمارے جرنیل کچھ اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے کہ وہ عوام کو ایک ہفتہ کے اندر اندر قابو میں لا کر صورتِ حال پر قابو پا لیں گے۔ ہمارے حکمران اور فوجی لیڈروں نے روس اور بھارت کے دفاعی معاہدے کی طرف بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اتنا واضح اشارہ ملنے کے باوجود انہوں نے اِسے نظرانداز کیا اور اس کے جواب میں کوئی دفاعی اقدام نہ کیا نہ اپنی پالیسی میں کوئی ردّوبدل کیا جیسے حالات بالکل نارمل تھے....

"ہمارے جرنیل اس خوش فہمی میں بھی مبتلا رہے کہ بھارت سرحد کے اندر نہیں آئے گا۔ باہر باغیوں کو مدد دیتا رہے گا اور ہم مدد کے راستے بند کر دیں گے۔ اس خوش فہمی کے تحت فوج کو بغاوت فرو کرنے میں مصروف کر دیا گیا اور ایسا کوئی پلان ہی نہ بنایا گیا کہ بھارت کی فوج، فضائیہ اور بحریہ نے حملہ کر دیا تو اسے کس طرح روکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہماری فوج ملک کے اندر پھیل گئی۔ ہماری فوج کی ایک کوشش یہ تھی کہ مکتی باہنی کسی ایک علاقے پر قابض نہ ہو سکے۔ اگر کسی شہر یا قصبے اور اس کے گرد و نواح پر مکتی باہنی کا قبضہ ہو جاتا تو وہ اُسے بنگلہ دیش کہہ کر بین الاقوامی سیاست میں ایک مؤثر پوزیشن حاصل کر سکتی تھی۔ فوج نے بے شک باغیوں کے کہیں پاؤں جمنے نہ دیئے۔ اس کے لیے اسے ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ اور بنگالی پولیس سے باقاعدہ معرکے لڑنے پڑے مگر دشمن کی چال زیادہ کامیاب تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ پاک فوج کے یہ ساڑھے تین ڈویژن کمپنی کمپنی اور پلاٹون پلاٹون میں بٹ کر بکھر جائیں۔ ان کی سپلائی لائن نہ رہے، کوئی مرکزیت نہ رہے۔ جب ہمارے ڈویژن دشمن کی مرضی کے مطابق بکھر گئے تو اس نے باقاعدہ حملہ کر دیا....

اُس سے پہلے ملک میں غیر بنگالیوں کا قتلِ عام ہوتا رہا۔ فوج کو بارکوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی پھر اچانک فوج کو صورتِ حال پر قابو پانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس کارروائی سے ہماری بہت رُسوائی ہوئی کیونکہ بین الاقوامی سطح پر ہم خاموش رہے اقوامِ عالم کو نہ بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ دوسرے ملکوں کو چھوڑیئے، مغربی پاکستان والوں کو بھی وہاں کے حالات سے بے خبر رکھا گیا۔ ایک قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) شائع کیا گیا مگر وہ نامکمل تھا اور بے وقت۔ ہمارے مقابلے میں بھارت کا پروپیگنڈہ زیادہ مؤثر تھا اور اس قدر زور و شور سے کیا جا رہا تھا کہ دوسرے ممالک بنگالیوں کو مظلوم، پاک فوج کو ظالم اور مغربی پاکستانیوں کو بنگالیوں کے حق کا غاصب سمجھنے لگے۔ خود مغربی پاکستان میں کئی حلقوں نے بھارت کے پروپیگنڈے کا اثر قبول کیا اور اپنی حکومت اپنے ملک میں رائے عامہ اپنے حق میں نہ کر سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک طرف

تو ہم اس پر فخر کرتے رہے کہ ایک سو چار ملکوں نے بھارت کو جارحیت کا مجرم قرار دیا ہے مگر ان سب نے بنگلہ دیش کو فوراً تسلیم کر لیا۔ یہ بھارت کے پروپیگنڈے کا اور ہماری خاموشی کا نتیجہ تھا....

"ایک اور قباحت بہت ہی خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ تھی اپنی ہائی کمان جو یحیٰی کے رُوپ میں اسلام آباد میں تھی۔ یہ ایک فرد کی ہائی کمان تھی۔ مشرقی پاکستان میں جنگ دو ہفتے نہیں بلکہ نو مہینے لڑی گئی۔ اس دوران نہ ملک کا صدر وہاں گیا نہ کمانڈر انچیف۔ دونوں کا یا کم از کم کمانڈر انچیف کا وہاں جانا اور حالات کا جائزہ اپنی آنکھوں لینا بہت ضروری تھا۔ ہائی کمان صرف اُسی صورت میں صحیح فیصلے دے سکتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں میدانِ جنگ کی دشواریوں، اپنی کمزوریوں، ضروریات اور دشمن کی بالادستی کو دیکھے۔ ڈھاکہ اور اسلام آباد کے درمیان وائرلیس اور ریڈیو ٹیلی فون کا رابطہ تھا۔ یہ پیغامات دشمن کی فضا میں سے گزرتے تھے۔ دشمن کے پاس ہمارے پیغامات سُننے کے لیے سائنسی ذرائع موجود تھے۔ کوئی بعید نہیں کہ دشمن ہمارے کوڈ استعمال کر کے ہماری ہائی کمان کی زبان میں ہمارے ڈھاکہ ہیڈ کوارٹر کو غلط پیغامات دیتا رہا ہو۔ میدانِ جنگ میں ایسے ہوتا ہے....

"جنگ کے بعد بھارت کے دو تین اخباروں میں خبر چھپی تھی کہ ہمارا ایک اسلام آباد سے ڈھاکہ جانے والا وائرلیس پیغام بھارت کی ہائی کمان نے سُن کر ایک جنگی کارروائی کی تھی جس نے مشرقی پاکستان میں ہماری فوج کو بہت نقصان پہنچایا۔ لہٰذا جب بھی آپ مشرقی پاکستان کی جنگ کی بات کریں تو اس عنصر کو پیشِ نظر رکھا کریں کہ ہماری ہائی کمان میدانِ جنگ سے ایک ہزار میل دُور اسلام آباد کے پُرسکون ماحول میں بیٹھی تھی اور یہ ہائی کمان محض ایک فرد پر مشتمل تھی اور اس فرد کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون تھا اور کیسا تھا۔ بعض اوقات تو شک ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے پانچ ڈویژنوں کو ان کے اپنے حال پر اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا....

"اب آپ مجھ سے یہ ضرور پوچھیں گے" ــــ بریگیڈیئر صاحب داد نے کہا ــــ کہ کیا ہمارے جرنیل جو مشرقی پاکستان میں لڑ رہے تھے، ہائی کمان کی ہدایات سے آزاد ہو کر نہیں لڑ سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے جو پہلے بھی واضح کر چکا ہوں کہ وہاں جنگ ڈویژن اور بریگیڈ کی سطح پر تو لڑی ہی نہیں جا رہی تھی۔ آپ نے اخباروں میں یہ خبریں پڑھی ہوں گی کہ ایک مقام پر ہمارے بیالیس جوانوں نے پورے بریگیڈ کا اور بریگیڈ کے ٹینکوں کا مقابلہ کیا اور ایک مقام پر ہمارے بیالیس جانباز پورے بریگیڈ سے لڑے۔ یہی نقص پیدا ہو گیا تھا کہ ہمارے پانچوں ڈویژن بیالیس اور باون کی ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور وہ دشمن کی باقاعدہ فوج کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس قسم کے معرکوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اُسے کچھ دیر کے لیے روک لیا جاتا ہے مگر بڑے پیمانے کی جنگی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ مٹھی بھر جوان جو بے شک لڑتے تو بے مثال جرأت سے ہیں، لیکن ایک ایک کر کے زخمی اور شہید ہوتے چلے جاتے ہیں اور باقی جو رہتے ہیں ان کا اعصابی نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ فرض کیا وہ کوئی جنگی کامیابی حاصل کر بھی لیتے ہیں تو اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تازہ دم کمک کا ہونا لازمی ہوتا ہے مگر مشرقی پاکستان میں جہاں پاک فوج کے افسر اور جوان ڈویژن، بریگیڈ یا رجمنٹ کی صورت میں نہیں بلکہ انفرادی طور پر لڑ رہے تھے، کمک اور سپلائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر اپنی یونٹوں سے اور یونٹیں اپنی کمپنیوں وغیرہ سے کٹی ہوئی تھیں۔ فوجی مرکز ڈھاکہ تھا۔ مواصلات اور آمد و رفت کے ذرائع ایسی بُری طرح پھیل گئے تھے کہ رابطے ٹوٹ گئے۔ اس کے علاوہ ہماری فوج کی سب سے بڑی محرومی فضائیہ کی تھی۔ فضائی مدد کے بغیر کوئی فوج دشمن کو شکست نہیں دے سکتی مگر فضائیہ کہاں سے آتی؟ سولہ سیبر اور ایک ایئر بس کوئی فضائی مدد تو نہیں ہوتی۔ جنگ کے پانچویں دن اپنے طیارے اپنے ہاتھوں نذرِ آتش کرنے پڑے....

"یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں تو اچھا ہے" ــــ بریگیڈیئر صاحب داد نے کہا ــــ کہ پاک فوج پر بُزدلی اور نااہلی کا الزام لگانا صرف حقائق سے لاعلمی ہی نہیں بلکہ اِن افسروں اور جوانوں کے ساتھ ظالمانہ بے انصافی ہے جو اپنے ہیڈ کوارٹروں سے کٹ کر لڑے بلکہ کمانڈروں کے احکامات نہ مل سکنے کے باوجود ایک ایک انچ کے لیے لڑے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ عمومی طور پر فوج ایک

ناقص جنگ لڑی کیونکہ فوج کو فوج کی حیثیت سے لڑایا نہیں جا سکا۔ اس کی وجوہات بیان کر چکا ہوں، لیکن سیکشنیں، پلاٹونیں اور کمپنیاں ایسے ایسے معرکے لڑیں جن کی مثال ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ بھارت سے بہت سے زخمی آئے ہیں اور حال ہی میں پاک فوج کے کچھ افسر جنگی قیدی کیمپوں سے مفرور ہو کر پاکستان پہنچے ہیں۔ وہ جب مختلف معرکوں کی تفصیلات سناتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر دلیری سے اور ایسے شدید جذبے سے لڑنے والوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن ان تمام معرکوں کو جب ہم جنگی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو حرب و ضرب کا علم انہیں UNPLANNED جنگ قرار دیتا ہے یعنی جو کسی پلان کے بغیر لڑی گئی ہو۔ ایسی جنگ میں شجاعت تو قابلِ داد ہوتی ہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ یوں کہہ لیں کہ ہماری فوج نہیں لڑی، فوجی لڑے ہیں۔ میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ فوجی کس طرح لڑے۔"

جنگ تو بعد کی بات ہے، ہم ابھی وہ وجوہات اور حالات بیان کر رہے ہیں جنہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کو خانہ جنگی تک پہنچایا اور اس کا فائدہ ہمارے دشمن کو ملا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ بنگالی غدار تھے۔ تحریکِ پاکستان کو جتنا استحکام بنگالیوں نے دیا تھا وہ اگر پاکستان میں آنے والے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے زیادہ نہیں تھا تو کم بھی نہیں تھا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے صرف بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور یہ مستحکم حکومت تھی جس کے سربراہ خواجہ ناظم الدین تھے۔

اُس وقت بنگالیوں کے تعاون کا یہ عالم تھا کہ مسلم لیگ نے الیکشن میں غیر بنگالیوں کو ٹکٹ دیئے تو بنگالیوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ غیر بنگالی کو کیوں ووٹ دیں۔ اُنہوں نے ان امیدواروں کو بنگالی، پنجابی، بہاری وغیرہ سمجھنے کی بجائے قوم کے نمائندے سمجھا اور امیرِ جماعت کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کی صرف ایک مثال کافی ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان مشرقی پاکستان سے منتخب ہوئے تھے۔ بنگالی مسلمان کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، سراج الدولہ اور ٹیپو میر کو یاد کریں

تو پتہ چلے گا کہ بنگالی مسلمان نے قومی تشخص اور اسلام کی خاطر کتنی قربانیاں دی تھیں۔ پھر یہ انقلاب کس طرح آ گیا کہ بنگالی مسلمان غیر بنگالی مسلمان کا دشمن ہو گیا؟

وجوہات بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں ایک وجہ کو پھر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک ہزار میل کا فاصلہ اور درمیان میں دشمن تھا۔ ایک دوسرے سے نہ ملنا، ایک دوسرے کے رسم و رواج کو نہ سمجھنا اور ایک دوسرے کی نفسیات اور تاریخ سے ناواقف رہنا، دلوں میں ایک ہزار میل کی بجائے دس ہزار میل سے زیادہ فاصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ جہاں تک بنگالیوں کی نفسیات کا تعلق ہے، اسے ہم بریگیڈیئر صاحب داد خان کے الفاظ میں واضح کریں گے کیونکہ بریگیڈیئر صاحب نے بنگالیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ بریگیڈیئر صاحب کہتے ہیں:

"بنگال کی آب و ہوا ایسی ہے کہ وہاں کے لوگ سال میں چھ مہینے اپنے گھروں میں بند رہتے ہیں۔ موسمی حالات کی وجہ سے اُن کا آپس میں میل جول بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں اور یہ تنہائی اُن کی نفسیات بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ملک میں باہر سے آنے والے ہر آدمی کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مغربی پاکستان سے جو کوئی مشرقی پاکستان جاتا تھا، بنگالی اُسے اچھی طرح پرکھتے تھے اور جب انھیں یقین ہو جاتا کہ یہ آدمی مکمل طور پر ان کے حق میں ہے تو وہ اُس کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے تھے اور اگر انہیں یہ شک ہو جاتا کہ باہر سے آنے والا راج کرنے آیا ہے یا رشوت خور ہے یا اُنہیں کمتر سمجھتا ہے تو وہ ذرا سا بھی تعاون نہیں کرتے تھے۔"

مشرقی پاکستانیوں کی اس نفسیات کو، اُن کی تاریخ کو اور اُن کے جذبے کو نہ سمجھا گیا۔ اس کی بجائے اس قسم کے نازیبا مظاہرے کیے گئے کہ مغربی پاکستان سے جو سرکاری افسر وہاں جاتا تھا اس کا طرزِ گفتگو اور طرزِ عمل حاکموں والا ہوتا تھا۔ افسر شاہی کے یہ نمائندے مشرقی پاکستان میں جا کر اپنے کردار اور اپنی گفتار سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ خادم نہیں بلکہ اُن کے حکمران ہیں۔ مغربی پاکستان سے جانے والے افسروں کو مشرقی پاکستان کے عوام مل ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ افسر عوام کی

اپنے ساتھ ملاقات کو خود دشوار بلکہ ناممکن بناتے تھے تاکہ حاکم اور محکوم کے درمیان خلیج قائم رہے۔ اس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں رشوت اور کرپشن کم تھی اور اُن کے افسر یعنی بنگالی افسر سادہ سی زندگی بسر کرتے تھے اور اُن کی رہائش بھی سادہ ہوتی تھی اور انہیں ملنا بھی آسان تھا۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن ان کے اثرات بہت بُرے اور گہرے ہُوئے۔ وہاں کے ہندو بنگالی مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو اپنے قریب کرنا شروع کر دیا۔

اس تجزیئے سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ ہمارا دشمن ہماری ہر کمزوری کو استعمال کر رہا تھا اور ہماری کمزوریوں اور بنگالی مسلمانوں کے ردِّ عمل کو، پروپیگنڈے اور ذہنی تخریب کاری کے لیے ماہرانہ طور پر استعمال کرتا تھا۔

مشرقی پاکستان کے دفاع کے متعلق بات ہو چکی ہے۔ ایک تو وہاں فوج کی نفری بہت تھوڑی تھی، فضائیہ اور بحریہ تھیں ہی نہیں، اس کے ساتھ دفاعی پالیسی یہ بنائی گئی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہو گا۔ اس پالیسی نے مشرقی پاکستان پر مایوسی طاری کیے رکھی۔ اُن کے حوصلے اور استقلال پر بُرا اثر پڑا۔ بنگالی مسلمانوں نے یہ تاثر لیا کہ انھیں بھارت کے رحم و کرم پر پھینک دیا گیا ہے۔ اس عوامی تاثر سے مشرقی پاکستان کے بھارت نواز لیڈروں نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ وہ بھارت نوازی کے چرچے عام کرنے لگے۔ بھارت نے اپنا پروپیگنڈہ تیز کر دیا۔ اس طرح اُدھر یہ تاثر پیدا کیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع بھارت کرے گا۔ آگے چل کر بھارت نے عملاً اپنا دعویٰ ثابت بھی کر دکھایا اور مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔ پھر بنگالی مسلمانوں اور ساری دنیا کو یہ تاثر دیا کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے حملے سے بچایا ہے۔ یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن میں اتنی جان ہی نہیں تھی کہ اُس کی آواز ڈھاکہ کے مضافات سے آگے تک جا سکتی۔

"دشمن کا پروپیگنڈہ اس لیے بھی کامیاب ہُوا کہ ہمارا اپنا گھر کمزور تھا" —— بریگیڈیئر صاحب داد خان کہتے ہیں —— "سیاسی عمل کے رُکنے اور

مارشل لا لگنے سے بنگالی ہم سے دُور ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بنگالیوں پر واضح ہو گیا کہ مشرقی پاکستان ہر لحاظ سے غیر محفوظ ہے۔ یہ ایسی حالت تھی جسے کوئی بنگالی اپنے لیے مفید نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد چھ نکات کا چرچا شروع ہُوا جس نے ہمیں خانہ جنگی تک پہنچا دیا.... شروع سے ہی ہمارا طرزِ عمل ایسا رہا ہے کہ جس کسی نے بھی حکومت سے اختلاف کیا اُسے غدّار کہا گیا۔ چونکہ حکمرانوں کا یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل غلط تھا اس لیے حکمرانوں کو منہ کی کھانی پڑی اور جنہیں انہوں نے غدّار کہا تھا اُنہی کے ساتھ مذاکرات کرنے پڑے۔ اگرتلہ سازش کیس کے سرغنہ مجیب الرحمٰن کو پہلے غدّار کہا گیا پھر اُسے رہا کر کے مذاکرات کی میز پر بٹھایا گیا۔ اس سے ہمارا اپنا موقف غلط ہو گیا۔ اگرتلہ سازش کیس کا جب مقدمہ چلایا گیا تو اس کے لیے عدالت، جج اور وکیل مغربی پاکستان سے گئے جنہیں مشرقی پاکستان والوں نے تسلیم ہی نہ کیا اور اس کے نتیجے میں ہمارے جج کو جوتوں کے بغیر واپس آنا پڑا۔"

ہم نے جتنے بھی مخلص قسم کے سیاسی اور فوجی لیڈروں اور سیاسی امور کے ماہرین سے بات کی ہے وہ کہتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش کیس کا مجرم تھا اور اُسے سزا ملنی چاہیئے تھی لیکن اقتدار پرست سیاسی لیڈروں نے ایوب خان مرحوم کو مجبور کر دیا کہ وہ مجیب الرحمٰن کو گول میز کانفرنس میں بلائے اور اُسے سازش کیس سے بری الذمہ قرار دے دے۔ چنانچہ اُسے بری کرا لیا گیا پھر ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی نے واضح اکثریت حاصل کر لی۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ حکومت اسی کی پارٹی کی بنتی۔ یہ سیاست کے اصول اور فلسفے کا تقاضا تھا لیکن اِدھر سے جیتنے والی پارٹی کے لیڈر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے "اُدھر تم اِدھر ہم" کا نعرہ لگا کر سیاست کے اصولوں کو توڑ دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ مجیب الرحمٰن کو مرکز میں حکومت مل گئی تو وہ ملک کو توڑ دے گا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ الیکشن کے بعد وفاقی اسمبلی کا اجلاس بُلا کر منسوخ کر دیا گیا۔ اس دھاندلی نے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انہیں مغربی پاکستان سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ بھارت

نے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی۔ اُس نے بنگالی لیڈروں کو پوری پوری مدد دی۔

پاکستان کے حکمرانوں کی مفاد پرستی، کوتاہیوں اور بے نیازی کی تاریخ اپنے آپ کو سندھ میں دُہرا رہی ہے اور بھارت اپنا وہی رول جو اُس نے مشرقی پاکستان میں ادا کیا تھا اب سندھ میں ادا کر رہا ہے۔ پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ برسوں سے سندھ کی صورتِ حال کے متعلق "سب خیریت ہے" کی خبریں سُنا رہے ہیں اور وہاں غیر سندھیوں کو سوشل بائیکاٹ، مارپٹائی، قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں سے دہشت زدہ کر کے علیٰحدگی پسند سندھی سندھ سے نکال رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شیخ مجیب الرحمٰن جی ایم سید کے نام سے زندہ اور سرگرم ہے۔ جی۔ ایم سید کھلے عام پاکستان کو توڑنے اور سندھو دیش کے قیام کی باتیں کر رہا ہے جو اخباروں میں شائع ہوتی ہیں مگر ہمارے حکمرانوں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔

ہم المیۂ مشرقی پاکستان کا تجزیہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں کو تو اقتدار کی معرکہ آرائی اور جوڑ توڑ سے فرصت نہیں، قوم کو تو معلوم ہو کہ پاکستان کس نے آدھا کیا اور کس طرح کیا تھا۔

غور فرمائیے کہ حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ کو پردے میں کیوں رکھا گیا پھر اس کو غائب ہی کیوں کر دیا گیا؟ اگر بھٹو مرحوم مخلص ہوتے تو وہ حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ قوم کے سامنے رکھ دیتے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا لوگوں کے ذہنوں سے یہ سوال نکلتا گیا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کی جگہ اس سوال نے لے لی کہ حمود الرحمٰن کمشن کو کیوں چھپا لیا گیا ہے۔

آئیے مشرقی پاکستان کے میدانِ کارزار میں واپس چلتے ہیں۔ ہم ملٹری ایکشن کی بات کر رہے تھے۔ ہم نے بات وہاں تک پہنچائی تھی کہ ملٹری ایکشن تو شروع کر دیا گیا لیکن یہ نہ دیکھا گیا کہ ہماری فوج کی نفری کتنی ہے اور اس کے پاس جو اسلحہ بارُود تھا اُس کی پوزیشن کیا ہے۔

بعض باخبر حلقوں میں جنرل نیازی کا تقرر بھی زیرِ بحث آیا ہے بھارت

میں چھپنے والی دو کتابوں میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے کہ جنرل نیازی جونیئر جرنیل تھے، انہیں ایسٹرن کمانڈ کی کمان کیوں دی گئی۔ سب سے پہلے وہاں جنرل یعقوب کو بھیجا گیا تھا کیونکہ وہ سینیئر تھے۔ وہ ناکام رہے تو دوسرے سینیئر یعنی جنرل ٹکا خان کو بھیجا گیا۔ ان سے ملٹری ایکشن کی کمان لی جانے لگی تو توقع تھی کہ ان کے بعد جو سینیئر جرنیل ہے اُسے بھیجا جائے گا لیکن جنرل نیازی کو بھیجا گیا۔ بھارتی مبصروں نے رائے دی ہے کہ جنرل نیازی کو پچھلے تجربوں اور اہلیت کی بنا پر منتخب کیا گیا تھا۔ ان کے تقرر کا پس منظر خواہ کچھ ہی تھا یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ صرف اہلیت اور تجربے کے زور پر جنگ نہیں جیتی جا سکتی۔

اس حالت میں جن ڈویژنوں کو بھیجا گیا وہ جنرل نیازی کے حوالے کر دیئے گئے اور حکم دیا گیا کہ ملک کو باغی عناصر سے صاف کرو اور حالات کو معمول پر لاؤ مگر حالات غیر معمولی طور پر خراب ہو چکے تھے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ سرحدوں کی ناکہ بندی نہ کرنے کی وجہ سے سرحدیں ختم ہو چکی تھیں۔ ایسٹ پاکستان رائفلز جو سرحدوں کی پاسبان تھی، اجتماعی طور پر باغی ہو چکی تھی۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کی پانچ پلٹنیں تھیں، پانچوں باغی ہو کر دشمن سے جا ملی تھیں۔ تمام تر پولیس فورس باغی ہو گئی اور پہلے ڈویژن میں جو بنگالی افسر اور جوان تھے وہ بھگوڑے ہو کر دشمن کے پاس چلے گئے تھے۔ بھارت کی کمانڈو فورس اندر آ گئی تھی اور مکتی باہنی کہلانے لگی تھی۔ یہ سارے عناصر ایک باقاعدہ فوج میں منظم ہو گئے تھے۔ بھارت انہیں ہر طرح کی مدد دے رہا تھا۔ سیاسی لیڈر بھی غائب ہو گئے تھے جو باغیوں کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کر رہے تھے۔ دیہاتی علاقوں میں دوست بھی دشمن بن گئے تھے۔

مکتی باہنی نے بہت سے پُل اڑا دیئے تھے۔ بھارت نے اس مقصد کے لیے مکتی باہنی کو انجنیئرز بھی دیئے تھے اور ضروری سامان بھی۔ جنرل نیازی نے احکام کے مطابق پلان تیار کیا جس میں سرحدوں کی ناکہ بندی کو سرِ فہرست رکھا۔ یہ کام اندرونی بغاوت فرو کرنے کی نسبت بہت دشوار تھا۔ سرحدی علاقے میں باغی عناصر باقاعدہ فوج کی صورت میں منظم ہو کر بھارتی افسروں

کی قیادت میں مورچہ بند تھے۔ مثلاً مشرقی سرحد پر بیلونیا کے علاقے میں باغیوں نے ڈیڑھ سو مربع میل کے علاقے میں باقاعدہ مورچے بنا رکھے تھے اور بھارتی علاقوں میں انہیں مدد دینے کے لیے توپ خانہ موجود تھا جو مشرقی پاکستان کے دُور اندر تک گولہ باری کر سکتا تھا۔

باغیوں نے اپنے مورچوں کے سامنے وسیع علاقے میں بارودی سرنگیں بھی بچھا رکھی تھیں۔ اس علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے باقاعدہ حملے کی یعنی جنگی پیمانے پر حملے کی ضرورت تھی۔ بھارتی توپ خانے کو خاموش کرنے کے لیے توپ خانے کی ضرورت تھی۔ ہمارے ٹروپس پر عقب سے حملے کرنے اور کمانڈو قسم کے شب خون مارنے کے لیے مکتی باہنی یعنی بھارت کی کمانڈو فورس موجود تھی۔ مکتی باہنی کئی اہم پُل تباہ کر چکی تھی اور دیگر پلوں کی تباہی کا خطرہ ہر لمحہ موجود تھا۔

بیلونیا کو صرف ایک مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تمام تر سرحدی علاقوں میں اندر تک باغی فوج جس میں بھارت کی فوج کی خاصی نفری تھی، مورچہ بند ہو چکی تھی۔ بعض جگہوں پر پوری پوری پلٹنیں مورچہ بند تھیں۔ چٹاگانگ وہاں کی واحد بندرگاہ تھی جسے شہری جہاز رانی اور بحریہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ بندرگاہ تقریباً باغیوں کے قبضے میں آگئی تھی۔ اسے فوری طور پر محفوظ کرنا بے حد ضروری تھا۔ چٹاگانگ کا تمام تر علاقہ پہاڑی اور دشوار گزار ہے۔ یہ مکتی باہنی یعنی بھارتی کمانڈو اور گوریلا لڑاکوں کے لیے موزوں تھا۔ چٹاگانگ بھارت کی بّری اور بحری توپوں کی زد میں تھا۔

یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیے کہ مشرقی پاکستان کے اس واحد بحری اڈے میں ہماری بحری طاقت کُل چار گن بوٹیں تھیں۔ کوئی تباہ کُن یا بڑا جنگی جہاز نہیں تھا۔ بندرگاہ کو ہوائی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے طیارہ شکن گنیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس کے مقابلے میں بھارت کا پُورا بحری بیڑہ موجود تھا جس میں سب سے زیادہ خطرناک اور تباہ کُن طیارہ بردار بحری جہاز "وکرانت" تھا۔ بعد میں اسی سے چٹاگانگ اور اِرد گرد کے علاقوں کو تباہ کیا گیا تھا۔

اپنے پاس فضائی طاقت بھی برائے نام تھی۔ سیبر طیّاروں کا صرف ایک سکواڈرن تھا جس میں ابتدا میں صرف بارہ طیّارے اور بعد میں سولہ تھے۔ اس کے مقابلے میں بھارت نے بنگال اور آسام میں جدید لڑاکا بمبار طیّاروں کے دس سکواڈرن رکھے ہوئے تھے۔ قارئین کو معلوم ہوگا کہ سیبر چھوٹا، سُست رفتار اور قدیم طیارہ ہے جب کہ بھارتی ایئر فورس میں رُوس کے ایس۔ یُو سیون جیسے لڑاکا بمبار طیارے تھے۔ اپنے پاس صرف ایک ہوائی اڈہ تھا۔ پاک فوج کو بحریہ اور فضائیہ کی مدد کی شدید ضرورت تھی جو اُسے نہیں دی گئی۔

اب ملٹری ایکشن کی صورت بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اب وہی صورت پیدا ہو گئی تھی جو ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی کانفرنس میں یحییٰ خان کو ڈھاکہ میں بتائی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اگر ملٹری ایکشن شروع کیا گیا تو بھارت کی فوج "بنگلہ دیشیوں" کے روپ میں اندر آجائے گی بلکہ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق یہ فوج اندر آبھی چکی تھی۔ یحییٰ خان کو خبردار کیا گیا تھا کہ فوج کی بجائے ڈپلومیسی سے کام لیا جائے اور کوئی سیاسی حل تلاش کیا جائے کیونکہ ملٹری ایکشن ایک مرحلے میں جا کر باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کرے گا جس کے لیے مشرقی پاکستان میں فوج، فضائیہ اور بحریہ ناکافی ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جنگ کی صورت میں سپلائی اور کمک کے راستے مسدود ہو جائیں گے اور محاصرے کی حالت میں لڑنے کا نتیجہ صرف شکست بلکہ ذِلّت آمیز شکست ہوگا مگر جنرل ٹکا خان کامیابی کی امید کا اظہار کر رہے تھے اور جنرل حمید اور جنرل پیرزادہ یحییٰ خان کی خوشنودی کے لیے خاموش بیٹھے تھے۔

۱۰ اپریل ۱۹۷۱ء کے بعد وہ صورت پیدا ہو چکی تھی۔ ایسے ثبوت مِل چکے تھے کہ بھارتی فوج سرحدوں کے اندر آچکی ہے۔ اس موقع پر بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے فنی مہارت اور دانشمندی کا ایسا مظاہرہ شروع کر دیا کہ ساری دنیا کے سامنے دو مسئلے رکھ کر اقوامِ عالم کی آنکھوں میں دھُول جھونک دی۔ ایک مسئلہ یہ کہ پاک فوج مشرقی پاکستان میں لوگوں کو جبری غلامی میں رکھنے کے لیے قتل و غارت، لُوٹ مار اور آبروریزی کر رہی ہے اور دوسرا مسئلہ پناہ گزینوں کا تھا۔ بھارت نے واویلا بپا کر دیا کہ مشرقی پاکستان سے پناہ گزینوں کا سیلاب آگیا ہے جسے بھارت

جیسا غریب ملک اپنے ہاں رکھ بھی نہیں سکتا اور انسانیت کی بہبود کے پیش نظر اسے روک بھی نہیں سکتا۔ بھارتی پروپیگنڈہ مشینری نے نہایت چابک دستی سے عالمی برادری کی ہمدردیاں حاصل کر لیں اور اس "مظلومیت" کے پردے میں اپنی فوج مشرقی پاکستان کے سرحدی علاقوں میں داخل کر دی۔ بلکہ یہاں تک کیا کہ انہی دنوں بھارتی پارلیمنٹ میں یہ سوال اُٹھا کہ مشرقی پاکستان کے ضمن میں بھارتی حکومت کی پالیسی کیا ہے؟ اندرا گاندھی نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ہم مشرقی پاکستانیوں کو مغربی پاکستانیوں کی استعماریت اور فوج کے ظلم و تشدد سے آزاد کرانے کے لیے ہر طرح کی مدد کریں گے۔

بھارت کے ان واضح اعلانات، عملی اقدامات اور پروپیگنڈے کے باوجود ہماری پروپیگنڈہ مشینری اپنے ہی حکمرانوں کے گیت گاتی رہی۔ بھارت کے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے سفارت خانے پاکستان کو ذلیل کرتے رہے اور بھارت کو انسانیت کا نجات دہندہ ثابت کرتے رہے۔ ہمارے سفیر حسب معمول عیش و عشرت میں مصروف رہے۔ اس طرح پاکستان اور پاک فوج کی حیثیت ایک مجرم کی سی بن کے رہ گئی اور ملٹری ایکشن جاری رہا۔

سیاسی مذاکرات کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ یہ دروازے یحییٰ خان اور اُس کے مشیروں نے بند کیے تھے۔ یہاں ڈاکٹر ایم اے مالک کا ایک خط جو اُنہوں نے ۷ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز یحییٰ خان کو لکھا تھا پیش کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر مالک جو بعد میں مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے تھے، محبِ وطن پاکستانی تھے شکست کے بعد بھی محبِ وطن رہے۔ شیخ مجیب نے قید سے آزاد ہو کر انہیں قید میں ڈال دیا تو بھی وہ اپنے آپ کو پاکستانی کہتے رہے۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر مالک گھر میں بیمار پڑے تھے۔ شیخ مجیب اُن کی عیادت کے لیے گیا اور انہیں سرکاری ہسپتال میں علاج کے لیے کہا لیکن ڈاکٹر مالک نے سرکاری علاج قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر مالک نے بڑھاپے اور بیماری میں بھی بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا۔ اُنہوں نے ۷ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز یحییٰ خان کو لکھا تھا کہ ہمیں اس حقیقت کا سامنا ٹھنڈے دل سے کرنا چاہیے کہ فوجی کارروائی خواہ دانشمندانہ کیوں نہ ہو، ملک کے دونوں حصوں کو متحد نہیں رکھ سکے گی اور امن و سکون اور باہمی پیار بحال نہیں ہو سکے گا۔ اُنہوں نے لکھا کہ اس وقت تک جو واقعات رونما ہو چکے ہیں ان کے باوجود دونوں حصے ایک ملک اور ایک قوم کی صورت میں رہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی جن تجاویز کو مان لیا گیا تھا اُن پر عمل کیا جائے۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے بددل عوام صدرِ مملکت اور مغربی پاکستان کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر مالک نے لکھا کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی عدل و انصاف کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اکثریت کے مطالبے کو نظر انداز کرنے کی بجائے کشادہ ظرفی اور حقیقت پسندی کی شدید ضرورت ہے۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ سیاسی مسئلے کتنے ہی کیوں نہ اُلجھ جائیں انہیں صرف سیاسی طور طریقوں سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔

قصرِ صدارت میں اس خط کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ بھارت کے عزائم اور اس کے پروپیگنڈے کو بھی اہمیت نہ دی گئی اور ملٹری ایکشن جاری رکھنے کا حکم واپس نہ لیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے شہروں میں نظامِ زندگی معطل ہو چکا تھا۔ سرکاری دفاتر بند تھے۔ اپریل کے آغاز میں ڈھاکہ میں حالات نارمل ہو گئے۔ سرکاری دفاتر، سکول اور کالج بھی کھل گئے۔ جنرل نیازی نے ٹروپس کو چھاؤنیوں سے نکالا۔ وہاں ضرورت کے مطابق نفری رکھی۔ زیادہ تر ٹروپس کو سرحدوں کی طرف روانہ کیا گیا۔ سب سے زیادہ ضروری کام تو سرحدوں کی ناکہ بندی تھی۔

قدم قدم پر مزاحمت ہونے لگی۔ ہمارے جوانوں کے لیے جہاں اسلحہ، ایمونیشن اور دیگر سامان کی کمی تھی، وہاں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اُن کے سامنے دشمن کا تصور واضح نہیں تھا۔ اس دشمن کو وہ دشمن کہتے ہوئے ہچکچاتے تھے کیونکہ یہ تو اُن کا کلمہ گو بھائی تھا۔ جنرل نیازی نے اپنے ٹروپس کو یہ ہدایت واضح طور پر دی تھی کہ یہ تمہارے بھائی ہیں۔ تم صرف اُس پر گولی چلاؤ گے جو تم پر گولی چلائے گا اور جو پُرامن رہے گا اُس کے ساتھ تم پیار سے پیش آؤ گے۔

اس جذبے نے بہت کام کیا۔ لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ فوج ظالم ہے مگر فوج

دیہاتی علاقوں میں گئی تو انہوں نے فوج کو مخلص پایا۔ اسی رویے کا نتیجہ تھا کہ جب وہاں مجاہد فورس اور رضا کار فورس کی بھرتی شروع کی گئی تو بنگالی بھرتی ہونے لگے۔ رضا کاروں میں اکثریت بنگالیوں کی تھی۔ انہیں جبراً بھرتی نہیں کیا گیا تھا۔ اِن رضا کاروں کو نہایت اہم فرائض سونپے گئے۔ مثلاً پُلوں، ریلوے سٹیشنوں اور اہم جگہوں کی حفاظت اور دیہات میں باغیوں کو داخل ہونے سے روکنا وغیرہ۔ اِن رضا کاروں نے یہ کام نہایت خلوص اور جانفشانی سے کیے۔ عوام میں اعتماد بحال ہوتا گیا مگر سرحدی علاقوں کے حالات کچھ اور تھے۔ مئی ۱۹۷۱ء کے وسط تک شہروں، قصبوں اور قریبی دیہات میں تو امن اور نظم و نسق بحال کر دیا گیا مگر دُور دراز کے علاقوں میں گوریلا سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ ہمارے ٹروپس جب سرحدی علاقوں میں پہنچے تو وہاں انہیں باقاعدہ معرکے لڑنے پڑے۔ سرحد پار سے ان پر بھارتی توپ خانوں نے گولہ باری شروع کر دی۔

سرحدی علاقوں میں جن میں اگرتلہ، چوہاڈنگا، راجشاہی، جیسور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ہمارے ٹروپس کو بھارت کی پوری پوری بٹالین سے خونریز معرکے لڑنے پڑے۔ عقب اور پہلوؤں سے مکتی باہنی کے گوریلے حملے کرتے تھے۔ یہ باقاعدہ جنگ تھی جو ہمارے جوان بے سرو سامانی کی حالت میں لڑ رہے تھے۔ اُن کی حالت اور اُن کے سامان کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے۔ اس حالت میں انہیں زیادہ تر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ ایک ایک دِن میں وہ پچیس پچیس میل بھی چلے مگر یہ سفر پنجاب کے میدانوں کا نہیں مشرقی پاکستان کی زمین کا تھا جس کی تشریح کی جا چکی ہے۔ انہیں زیادہ تر پانی اور دلدل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس قدر کٹھن اور طویل سفر طے کر کے انھیں آرام نہیں ملتا تھا بلکہ ریگولر آرمی کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑنی پڑتی تھی۔ کہیں راستے میں ہی کبھی گھات لگ جاتی اور انھیں گوریلوں کے خلاف لڑنا پڑتا تھا۔ اکثر معرکے رات کو لڑے جاتے تھے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ زخمیوں اور بیماروں کے علاج کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اکثر زخمی اور بیمار علاج نہ ہونے کی وجہ سے شہید ہو جاتے تھے۔ وہ جہاں شہید ہوتے انہیں وہیں دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے جنگ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء میں شروع ہو گئی تھی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہماری فوج صرف دو ہفتے لڑی۔ اسے پُورے دس مہینے اس کیفیت میں لڑنا پڑا کہ نفری کم ہوتی جا رہی تھی۔ کمک نہیں ملتی تھی۔ ایمونیشن کی شدید کمی تھی اور راشن کی کیفیت بھی مخدوش تھی۔

جون ۱۹۷۱ء تک سرحدیں سر بمہر ہو چکی تھیں۔ شہری زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ مکتی باہنی ہار گئی تھی۔ اس دوران اپریل کے اوائل میں ہی کلکتہ میں بنگلہ دیش حکومت نے قیام کا اعلان کیا۔ اس نام نہاد بنگلہ دیش کے وزیر اعظم تاج الدین احمد نے ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء کے روز کلکتہ ریڈیو سے اپنی فوج کی تنظیم کا اعلان کیا۔ اس میں اُس نے ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پاک فوج کے بھگوڑے بنگالی فوجی افسروں اور جوانوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ مشرقی پاکستان کو کئی سیکٹروں میں تقسیم کر کے اُن کے کمانڈر مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام افسر پاک فوج کے تربیت یافتہ تھے۔ مکتی باہنی کا کمانڈر پاک فوج کا ریٹائرڈ کرنل عثمانی مقرر کیا گیا تھا جو خصوصی فوجی اہلیت کا مالک تھا۔ یہ فوج ایک باقاعدہ تربیت یافتہ فوج تھی۔ اس کی بہت سی نفری ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ لڑ چکی تھی۔ یہ ہر لحاظ سے تجربہ کار اور لڑنے کے اہل تھی۔ بھارت نے اسے جدید ہتھیاروں سے مسلح کیا اور خصوصی ٹریننگ دی۔ اس کے ساتھ شہریوں کو بھی شامل کیا گیا تھا جن میں طلبا بھی تھے۔ جون ۱۹۷۱ء تک اس فوج کا جو اسلحہ پکڑا گیا اس میں روس، بھارت، اسرائیل، چیکوسلواکیہ اور برطانیہ کا بنا ہوا اسلحہ تھا۔ امریکی ساخت کی آر آر گنیں بھی پکڑی گئیں۔ وائرلیس سیٹ بھی ہاتھ لگے۔

جون تک جنرل نیازی کی زیرِ کمان مشرقی پاکستان کے حالات معمول پر آ چکے تھے۔ اس کامیابی کے لیے بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ افسروں اور جوانوں نے بڑے ہی نامساعد حالات میں حیران کُن جذبے سے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔ اگر ساز و سامان اور دیگر ضروریات کے فقدان کو دیکھا جائے تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اتنی منظم اور جنگی پیمانے کی بدامنی کو مشرقی پاکستان جیسے دشوار گزار ملک میں قابو کیا جا سکے گا۔ دریائی ٹرانسپورٹ بھی بحال کر لی گئی۔ سول سے کشتیاں بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ پُل بحال کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہ تھا۔ تاہم بہت سے پُل مرمت کر لیے گئے۔

ٹروپس کی جسمانی کیفیت یہ تھی کہ تھک کر چُور ہو گئے تھے۔ انھیں آرام

نہیں ملتا تھا اور خوراک بھی ناکافی تھی۔ ساون پورے جوش و خروش سے شروع ہو چکا تھا۔ ہمارے افسر اور جوان اس موسمی کیفیت اور اتنے زیادہ پانی اور ایسی زیادہ نمناک آب و ہوا کے عادی نہیں تھے۔ چنانچہ وہ بیمار ہونے لگے اور دوائیوں سے محرومی کے باعث قوتِ ارادی اور جذبے سے بیماریوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

مگر اس کامیابی سے کوئی سیاسی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ سیاسی حالات معمول پر لائے جاتے۔ بعض سیاسی لیڈر جن میں عوامی لیگ کے ایم۔پی۔اے بھی تھے باغیوں سے ناطہ توڑ کر سامنے آ گئے۔ وہ گرفتاری کے ڈر کی وجہ سے شہروں میں نہیں جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ صلح صفائی کی بات کرنے کے لیے کوئی افسر اُن تک آئے۔ فوج نے مارشل لاء حکام کو اطلاع دی۔ ایسے امور کے ذمہ دار جنرل فرمان علی تھے۔ انہوں نے کسی لیڈر سے ملنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جنرل نیازی کا سیاسی تصفیوں اور تنازعوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہیں جی۔ایچ۔کیو سے براہِ راست احکام ملتے تھے۔ انہوں نے ایک بار جنرل عبدالحمید سے کہا کہ یحییٰ خان کو مشرقی پاکستان لاؤ تاکہ فوج نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے سیاسی فائدہ اٹھایا جا سکے مگر یحییٰ خان نہ آیا۔ ڈھاکہ کے مارشل لاء حکام سیاسی امور سے بے بہرہ تھے اور وہ غالباً اس سے بھی بے بہرہ تھے کہ سرحد پار کیا ہو رہا ہے۔

بھارت نے پناہ گزینوں کے بوجھ کا واویلا بپا کر رکھا تھا اور مبالغہ آمیز اعداد و شمار نشر کر رہا تھا۔ جون ۱۹۷۱ء میں پاکستان نے پناہ گزینوں کو واپس لینے کا فیصلہ کر لیا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس میں سابق فوجی یعنی بھگوڑے بھی شامل تھے۔ یہ ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے افسر اور جوان تھے۔ مشرقی پاکستان میں پناہ گزینوں کے استقبال کے لیے مراکز کھول دیئے گئے۔ اقوامِ متحدہ کا بھی ایک نمائندہ آ گیا۔ شہزادہ صدرالدین آغا خان بھی اقوامِ متحدہ سے آ گئے۔ اقوامِ متحدہ کا ایک اور نمائندہ جان کیلی بھی آ گیا۔ جب واپسی کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو بھارت سرکار نے اقوامِ متحدہ کی تجاویز ماننے سے انکار کر دیا۔ معاہدہ دھرا دھرایا رہ گیا۔

بھارت اپنی ہٹ اور عزم کا پکا ہے۔ اس نے مُکتی باہنی کی جو در اصل اُس کی اپنی کمانڈو فورس تھی اور نام نہاد بنگلہ دیش کی فوج کی ٹریننگ مکمل کر لی تھی اور اس نے انہیں توپ خانے کی مدد دینے کا بھی منصوبہ بنا لیا تھا۔ ان عزائم کے لیے ضروری تھا کہ بھارت کے پاس مشرقی پاکستان میں مداخلت کا جواز موجود رہے۔ یہ جواز صرف "پناہ گزین" تھے۔ بھارت کی بارڈر سیکیورٹی فورس پناہ گزینوں کو بھارت میں داخل ہونے سے تو نہیں روکتی تھی، البتہ انہیں واپس نہیں آنے دیتی تھی۔ بہت سے پناہ گزین نیپال جا رہے تھے جہاں سے وہ پاکستان آنے کا بندوبست کر لیتے تھے۔ بھارت کو پتہ چلا تو انہیں بھی روکا جانے لگا۔ اس طرح وہ پناہ گزین جو بھارت پر بوجھ نہیں بن رہے تھے اور وہاں سے جانے کی کوشش کر رہے تھے انہیں بھارت زبردستی روک کر اپنے اُوپر بوجھ بنا رہا تھا اور پاکستان اپنے آپ کو بے بس سمجھ رہا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بھارت نے اپنے ہاں جو ریفیوجی کیمپ بنائے تھے ان میں "پناہ گزینوں" کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی بھارت سرکار بتا رہی تھی لیکن یہ سب مشرقی پاکستان سے بھاگے ہوئے لوگ نہیں تھے بلکہ ان میں مغربی بنگال کے لوگ بھی شامل تھے جنہیں دیہات سے ہانک کر ریفیوجی کیمپوں میں لے گئے تھے۔ مغربی بنگال کی آبادی بہت ہی زیادہ ہے اور غربت اتنی زیادہ کہ دن میں ایک وقت کی روٹی ان کے لیے مسئلہ ہوتی ہے۔ لاکھوں بنگالی نیم فاقہ کش اور بے ٹھکانہ ہیں۔ ان کا تو روٹی اور رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ چونکہ مشرقی اور مغربی بنگال کے دیہاتی ایک ہی جیسے ہیں اس لیے انہیں جس غیر ملکی نے بھی دیکھا وہ انہیں مشرقی پاکستان کے پناہ گزین سمجھا۔

بھارت کی یہ چابکدستی قابلِ مذمت ہی سہی لیکن اپنے دشمن یعنی پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے اس نے جس عزم کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ داد ہے۔ کاش، پاکستان بھی کبھی اپنے دشمن کے خلاف ایسا ہی رویّہ اختیار کرے یا بھارت کو کم از کم دشمن ہی سمجھ لے۔ بھارت اقوامِ عالم کی نظروں کے سامنے

بیک وقت دو سنگین جرائم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ پناہ گزینوں کا مسئلہ اُس نے اپنے مفاد کی خاطر اپنے اُوپر ٹھونس رکھا تھا، اور دوسرا یہ کہ مشرقی پاکستان میں بغاوت کو از سرِ نو بھڑکا رہا تھا اور باغیوں کو ٹریننگ اور جنگی مدد دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اقوامِ عالم کی نظروں میں پاکستان استعماریت اور عوام پر ظلم و تشدد کا مجرم اور بھارت انسان دوست اور مظلوم تھا۔ یہ پروپیگنڈے کا کرشمہ تھا۔ بھارتی ریڈیو جس کی آواز کرۂ ارض کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہے دوہرا کام کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان کے خلاف بھڑکا رہا تھا اور دوسرا یہ کہ ساری دنیا میں پاکستان کو ذلیل و رسوا کر رہا تھا۔

بھارتی اخبار پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے میں متحد ہو گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے اخبار اپنے بادشاہ کی مدح سرائی میں مصروف تھے۔ ان میں مشرقی پاکستان کے متعلق جو خبریں شائع ہوتی تھیں ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہُوا اور کچھ نہ ہوگا.... آج بھی ہمارے اخباروں کا رویہ یہی ہے۔ ہمارے ریڈیو اور ہمارے قلمکاروں کا رویہ یہی ہے کہ بھارت ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے اور اِدھر دوستی اور امن کا پرچار ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ۱۹۷۱ء میں ہمارے اخبار، رسالے، ریڈیو اور ٹی وی بھارت کے عزائم سے بے خبر تھے اور اب اس کے ہمنوا ہو گئے ہیں۔

پریس ٹرسٹ بنا کر اور دوسرے اخباروں اور رسالوں کے مالکوں اور ایڈیٹروں کو اشتہاروں کے ذریعے اور دیگر ذرائع سے کٹھ پتلی بنا کر ریڈیو اور ٹی وی کو اپنے مفادات اور مقاصد کے لیے وقف کر کے اپنے اقتدار کو تو مستحکم اور طویل کیا جا سکتا ہے لیکن ملک کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور دشمن کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

بھارت کی حکومت اپنے اخباروں اور رسالوں کو وہ خبریں اور تبصرے دے رہی تھی جو پاکستان کی سالمیت کے لیے زہر کا اثر رکھتے تھے

اور ہماری حکومت بھی اپنے سرکاری اخباروں اور اپنے ہمنوا انعام خور اخباروں اور رسالوں کو وہ خبریں اور پریس نوٹ دے رہی تھی جو ملک کی سالمیت کو کاٹ رہے تھے۔

جون ۱۹۷۱ء میں جب ہماری فوج جان پر کھیل کر بھوک، پیاس، تھکن اور بیماری کی حالت میں سیاسی تصفیے کے لیے مشرقی پاکستان میں میدان صاف کر چکی تھی، ہماری حکومت اور ہمارے سیاسی لیڈر سیاسی تصفیے اور مذاکرات کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ مغربی پاکستان میں انتخابات میں ہاری ہُوئی پارٹیاں جیتی ہُوئی پارٹی پیپلز پارٹی کے خلاف زمین دوز کارروائیوں میں مصروف تھیں اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو مرحوم مشرقی پاکستان میں جیتی ہوئی پارٹی عوامی لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنے کی کوششوں میں ہلکان ہو رہے تھے اور یحییٰ خان کرسیٔ صدارت کے ساتھ چپکے رہنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ بھٹو مرحوم نے اعلانیہ کہا تھا —— "اُدھر تم اِدھر ہم"۔

ان کے بیانات آج بھی پڑھو تو ان کی ذہنیت اور عزائم کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ بھارت کے سیاسی لیڈر اپنے اختلافات کو نظر انداز کر کے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کے لیے ایک محاذ پر جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے۔ بھارت کی یہ کتنی بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے کشمیر کو ایک متنازعہ مسئلے کی بجائے اپنا اٹوٹ انگ بنا لیا اور پاکستان کے اٹوٹ انگ یعنی مشرقی پاکستان کو اپنا تنازعہ بنا لیا اور پاکستان کو مشرقی پاکستان کا ظالم اور غاصب قرار دے دیا۔ اس کامیابی میں بھارت کی دانشمندی کا اتنا دخل نہیں جتنا ہمارے لیڈروں کی پست ذہنیت اور بددیانتی کا ہے۔

یہاں پاکستان کے اُس وقت کے صدر یحییٰ خان کا ایک واقعہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے — ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد یحییٰ خان میجر تھا۔ کوئٹہ میں "لال کباب" ایک مشہور دکان ہے۔ اکثر فوجی افسر

بھی وہاں شراب وکباب کے لیے جایا کرتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں قائدِ اعظمؒ کی بے پناہ عقیدت تھی جس کا اظہار لوگ اپنے اپنے طریقوں سے کیا کرتے تھے۔ مصور قائدِ اعظمؒ کی تصویریں بنا کر چھپواتے اور لوگ دھڑا دھڑ خریدتے اور گھروں اور دکانوں میں لگاتے تھے۔ کسی تصویر میں قائدِ اعظمؒ کو تخت پر بیٹھا دکھایا گیا ہے تو کسی میں ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔ "لال کباب" کے مالک نے اپنی دکان میں ایک تصویر آویزاں کر رکھی تھی جس میں قائدِ اعظمؒ گھوڑے پر سوار تھے اور ان کے ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈا تھا۔

میجر آغا یحییٰ خان شراب میں بدمست "لال کباب" میں گیا۔ اُس کے ساتھ کچھ اور فوجی افسر بھی تھے۔ یحییٰ خان کی نظر قائدِ اعظمؒ کی تصویر پر پڑی تو دیوار سے تصویر اُتار کر فریم توڑ دیا پھر تصویر کو پھاڑ کر اس کے ٹکڑے فرش پر بکھیر دیئے۔ دکان میں کئی آدمی موجود تھے۔ وہ قائدِ اعظمؒ کی یہ توہین برداشت نہ کر سکے۔ وہ یحییٰ خان پر ٹوٹ پڑے اور اُس کی حالت خاصی بُری کر دی۔ یحییٰ خان نے یہ جواز پیش کیا کہ قائدِ اعظمؒ کی یہ تصویر مضحکہ خیز لگتی تھی کیونکہ انہیں گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے۔

یہی میجر یحییٰ خان پاک فوج کا جرنیل پھر کمانڈر انچیف اور پھر پاکستان کا صدر بنا تو اُس نے پاکستان کو بھی اسی طرح توڑا پھوڑا جس طرح قائدِ اعظمؒ کی تصویر پھاڑی تھی۔

بھارتی حکومت نے "مکتی باہنی" کی ناکامی دیکھی تو مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ اپنی فوج میں اضافہ کیا اور اگست میں کئی مقامات سے ہماری سرحد کے اندر اپنے دستے بھیجے۔ آگے آنے والے دستوں میں زیادہ تر پاک فوج کے بھگوڑے بنگالی افسر اور جوان ہوتے تھے۔ بھارت کے توپ خانوں نے اپنی سرحد میں رہ کر مشرقی پاکستان میں گولہ باری شروع کر دی۔ بھارت کی کمانڈو پارٹیوں نے پُل اڑانے، دریائی ٹرانسپورٹ اور ہمارے دستوں کو گھات لگانے اور عقب سے ہمارے مورچوں پر حملے

کرنے کا نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ "مکتی باہنی" عموماً یہ کارروائی کرتی تھی کہ ہمارے ٹروپس آگے جاتے تھے تو ان کے پیچھے بارودی سرنگیں بچھا دی جاتی تھیں اور پُل اُڑا دیئے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کی کمانڈو پارٹیوں نے پاکستان کے حامیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ پولیس سٹیشنوں اور ایسی دیگر جگہوں پر بھی حملے شروع ہو گئے۔ دشمن کو ایک تو یہ سہولت حاصل تھی کہ بھارت سے اسے توپ خانے کا فائر، جدید ہتھیار اور دیگر جنگی سامان مل رہا تھا۔ دوسری سہولت یہ کہ وہ اسی ملک کے رہنے والے لوگ تھے۔ انھیں وہاں کی زمین سے واقفیت تھی اور وہاں کے موسمی اور جغرافیائی کوائف کے وہ عادی تھے اور انھیں رہنمائی بھی حاصل تھی۔ اس کے برعکس پاک فوج وہاں اجنبی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق مکتی باہنی کی نفری ایک لاکھ تھی جس میں تیس ہزار باقاعدہ فوج تھی۔ باقی ستر ہزار گوریلا جنگ لڑنے والے تھے۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مکتی باہنی دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو فورس تھی۔

ہمارے پاس وہی تین ڈویژن تھے جو اپریل کے اوائل سے لڑ رہے تھے۔ انہیں ابھی تک کوئی کمک نہیں ملی تھی نہ سپلائی آئی تھی۔ ایمونیشن اور نفری میں کمی آ رہی تھی۔ اگست تک کئی جوانوں کی وردیاں پھٹ چکی تھیں اور کئی بوٹ اور جرابیں پھٹ جانے کی وجہ سے ننگے پاؤں لڑ رہے تھے۔ ان کے لڑنے کا انداز یہ تھا کہ جہاں کسی شگاف سے دشمن آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا ہماری کوئی کمپنی یا پلاٹون پیدل ہی اُس طرف دوڑ اُٹھتی تھی۔ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان کی زمین دیکھی ہے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے افسروں اور جوانوں کا کیا حشر ہوتا ہو گا۔

"مکتی باہنی" نے آبی بارودی سرنگوں سے شہری جہاز رانی کے کئی بحری جہاز اور لانچیں تباہ کر دیں۔ چائے کے باغات اور پٹ سن کے کارخانے تباہ کر دیئے۔ مختصر یہ کہ مشرقی پاکستان کے اندر دشمن نے توڑ پھوڑ اور تباہ کاری کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا اور بھارت نے توپ خانے کی

گولہ باری کے سائے میں اپنی باقاعدہ فوج کی پیش قدمی اور حملے شروع کر دیئے۔

اگست میں ہی جنرل ٹکا خان کو سبکدوش کر کے ڈاکٹر مالک کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جنرل نیازی نے سرحدوں پر بھی جنگ جاری رکھی اور گوریلوں کے خلاف بھی اپنے ٹروپس کو استعمال کیا۔ انہوں نے ہائی کمان سے کہا کہ ان کے پاس جو چند ایک چھوٹی توپیں اور مارٹر گنیں ہیں ان سے انہیں بھارتی علاقے میں گولا باری کی اور بوقتِ ضرورت سرحد پار کرنے کی اجازت دی جائے۔ بھارت نے سرحد کے ساتھ ساتھ اُن بنگالیوں کے لیے ٹریننگ کیمپ کھول رکھے تھے جو مشرقی پاکستان سے بھاگ گئے تھے اور وہ بھی جو مغربی بنگال کے رہنے والے تھے۔ ان میں ہندو بھی شامل تھے۔

جنرل نیازی ان پر گولا باری بھی کرنا چاہتے تھے اور سرحد پار کر کے کیمپوں پر باقاعدہ حملے بھی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر انہیں اس اقدام کی اجازت نہ دی گئی۔ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کو غالباً پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ کی کمزوریوں اور بے بسی کا علم ہو گیا تھا۔ بھارتیوں نے سرحد کے ساتھ ساتھ ہوائی حملے بھی شروع کر دیئے۔ پہلا ہوائی حملہ جیسور کے علاقے پر ہوا تھا۔ اپنے ٹروپس کی بے بسی دیکھیے کہ اُن کے پاس طیارہ شکن گنیں نہیں تھیں۔

ہماری حکومت کی بے نیازی دیکھیے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملے شروع کر دیئے تھے مگر اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا رہی تھی۔ ایک کارروائی یہ ہو سکتی تھی کہ اقوام متحدہ کو آگاہ کر کے وہاں مبصر بلا لئے جاتے۔ اگر یہ نہیں کرنا تھا اور فوجی کارروائی جاری رکھنی تھی تو وہاں فوج، فضائیہ اور بحریہ میں اضافہ کیا جاتا اور سپلائی کا سٹاک بھی اتنا جمع کر دیا جاتا کہ محاصرے کی صورت میں لمبی جنگ لڑی جا سکتی۔ یحییٰ خان کو افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے خود وہاں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیئے تھا۔ اگر وہ خود نہ جاتا تو جنرل حمید کو ہی بھیج دیتا مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنے ان تین ڈویژنوں کو مشرقی پاکستان کی دشوار زمین اور دشمن کے رحم و کرم پر پھینک دیا گیا ہے۔

تیسری کارروائی یہ ہو سکتی تھی کہ مغربی پاکستان سے بھارت پر پُرعزم اور شدید حملہ کیا جاتا۔ ہمارے پاس اس حملے کا جواز موجود تھا۔ اگر بھارت مشرقی پاکستان پر حملے کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے کشمیر کو بچانے کے لیے پورے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اگست ۱۹۷۱ء بلکہ اس سے بھی دو ماہ پہلے وہ وقت تھا جب مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ ہونا چاہیئے تھا۔

یہیں سے ہر باشعور پاکستانی کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ پاکستان کے ایوانِ صدارت میں کچھ عناصر موجود تھے جو مشرقی پاکستان کو کاٹ پھینکنے پر تُلے ہوئے تھے۔ غور فرمائیے، ملک کا صدر ایک جرنیل تھا۔ کیا وہ اس قدر نا اہل تھا کہ مشرقی پاکستان کی صورتِ حال جو سیاسی سے جنگی ہو گئی تھی، سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا؟ اتنی سی بات تو چھوٹے سے چھوٹے رینک کا فوجی افسر بھی سمجھ سکتا تھا کہ بھارت نے ہمارے ملک پر گوریلا اور کمانڈو طرز کا حملہ کر دیا ہے اور اس کے جواب میں ایسی جنگی کارروائی ہونی چاہیئے جو دشمن کے حملے کو بیکار کر دے۔ اس کارروائی میں دشمن کے علاقے پر گولہ باری، بمباری اور اپنے ٹروپس کو سرحد پار بھیجنا بھی شامل ہوتا ہے۔

فلسطینی مجاہدین نے جب اسرائیل کے خلاف کمانڈو کارروائیاں تیز کر دیں تو اسرائیل نے فلسطینیوں کے کیمپوں پر جو دوسرے ملکوں میں تھے، طیاروں سے بمباری شروع کر دی۔ لبنان کی خانہ جنگی میں اسرائیل نے محسوس کیا کہ اس کا اثر اسرائیل پر پڑ رہا ہے تو اُس نے لبنان کی سرحد کے اندر فوج بھیج کر خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ہم اسرائیل کے اس اقدام کو غنڈہ گردی سمجھتے ہیں لیکن اسرائیل نے اپنے مفاد کے لیے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ ہماری تو صورت ہی مختلف تھی۔ بھارت نے ہم پر جنگ ٹھونس دی تھی۔ ہم جوابی حملہ کرنے میں حق بجانب تھے مگر جوابی کارروائی

کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔

اپنی ہائی کمانڈ کے اس رویے کو بے نیازی یا کوتاہی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ یحییٰ خان شراب کے نشے میں بدمست رہتا تھا لیکن اُس کے مشیروں میں اکثریت جرنیلوں کی تھی۔ وہ صدرِ مملکت سے مناسب کارروائی کا اجازت نامہ لے سکتے تھے لیکن ان جرنیلوں کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ انہوں نے یحییٰ خان کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا اور مشرقی پاکستان کے گورنر کی اُس کے ساتھ بات نہیں ہونے دیتے تھے۔ یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ بھٹو مرحوم یحییٰ خان کے خصوصی مشیر بنے ہوئے تھے اور مرحوم کے دماغ پر پاکستان کی حکمرانی کا بھوت سوار تھا۔ اس کے لیے وہ آدھے ملک کی قربانی دینے کے لیے بھی تیار تھے۔

ہائی کمانڈ اور ایوانِ صدارت (جو دراصل ایک ہی چیز تھی) کی مشرقی پاکستان کے حالات اور تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے چشم پوشی اور بے رُخی بلاوجہ نہ تھی۔ وہاں فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ مشرقی پاکستان کو جانے دو۔ بعد میں جو قرائن سامنے آئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات کو بگڑنے دیا گیا تاکہ یہ خطہ پاکستان کے نقشے سے نکل جائے۔ قرائن پوری طرح واضح تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو مرحوم نے اقتدار میں آتے ہی رہا کر دیا حالانکہ وہ غداری اور غیر بنگالیوں کے قتلِ عام کا اور ملک کے دشمن کی افواج کے لیے راہ ہموار کرنے کا مجرم تھا۔ ملک کو توڑنے کا دوسرا مجرم یحییٰ خان تھا۔ اُسے بھٹو مرحوم نے بظاہر نظر بند کر دیا لیکن یہ نظر بندی دراصل اُس کی حفاظت کا انتظام تھا۔ یحییٰ خان کے خلاف عوام کے دلوں میں اتنی نفرت اور اس قدر غم و غصہ تھا کہ اسے نظر بند نہ رکھا جاتا تو وہ کسی بھی پاکستانی کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔

پھر حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ کو اس طرح دبا لینا کہ اس کا ایک آدھ اقتباس بھی شائع نہ کرنا ثابت کرتا ہے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے ذمہ دار اسلام آباد میں موجود تھے۔

ابھی پچھلے ماہ کی بات ہے۔ اسلام آباد میں سارک کے ملکوں کی کانفرنس ہوئی۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اپنی ایک تقریر میں اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو خاص طور پر خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ملکوں کے لیے آزادی کی جنگیں لڑیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن وہ شخص تھا جسے بنگالیوں کی اکثریت نے بھی کبھی خراجِ تحسین پیش نہیں کیا نہ وہ اس قابل تھا۔ بہرحال وہ پاکستان کا غدار تھا۔ بھٹو کی بیٹی نے یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان نے بنگلہ دیش پر ناجائز قبضہ کر کے اُسے مشرقی پاکستان بنا رکھا تھا اور مجیب الرحمٰن نے اسے آزاد کرایا ہے۔

قید سے آنے والے کئی افراد نے وثوق سے بتایا تھا کہ جنرل نیازی ۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان سے حملے کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہائی کمانڈ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں کمک اور سپلائی دی جائے۔ ٹروپس کی ضروریات کپڑے، کمبل، دوائیاں وغیرہ پوری کی جائیں۔ بڑے توپ خانے اور ٹینک دیئے جائیں اور یہ اجازت بھی دی جائے کہ وہ بھارت کے علاقے پر گولہ باری اور جوابی حملے کر سکیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جنرل نیازی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لمبے عرصے تک لڑ سکتے ہیں مگر مغربی پاکستان سے اس سال کی بجائے اپریل ۱۹۷۲ء کے آخر میں حملہ کیا جائے۔ حملے کی صورت میں صاف ظاہر تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کرے گا۔ اپریل کو جنرل نیازی نے اس لیے موزوں وقت سمجھا تھا کہ ان دنوں ساون کا موسم شروع ہو جانے سے ہر طرف پانی جمع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بھارت ٹینک استعمال نہیں کر سکے گا۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ڈویژن ٹینکوں کو غیر متحرک رکھ کر دفاعی جنگ لڑ سکیں گے۔

جنرل نیازی نے یہ مشورہ اس توقع پر دیا تھا کہ مغربی پاکستان سے حملہ اتنا زوردار ہو گا کہ بھارت کی توجہ مشرقی پاکستان سے ہٹ جائے گی۔ جنرل نیازی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اسلام آباد کے حکمران بھی ان کی طرح مشرقی پاکستان کے متعلق پلاننگ کر رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر مالک بار بار تصفیے پر زور دے رہے تھے مگر یحییٰ خان اور ان
کے درمیان جنرل پیرزادہ اور جنرل فرمان علی جیسے مشیر حائل تھے۔ یہ بھی معلوم
ہُوا ہے کہ ڈاکٹر مالک نے بھی آخر پریشان ہو کر یحییٰ خان سے کہا تھا کہ
اگر لڑنا ہی ہے تو لڑنے والوں کی آکر حالت دیکھو اور ان کی ضروریات
پوری کرو۔ ڈاکٹر مالک دیکھ رہے تھے کہ ایسٹرن کمانڈ کے ٹروپس محض جذبے
کے زور پر لڑ اور مر رہے ہیں ورنہ اس حالت میں کوئی فوج نہیں لڑ سکتی۔

اسلام آباد برف کے تودوں تلے دب گیا تھا۔ یہ برف اُس وقت بھی نہ
پگھلی جب بھارت نے روس کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر لیا جس کے تحت
رُوس نے بھارت کو نہ صرف طیارے، ٹینک، توپیں، میزائل اور متحرک
ریڈار وغیرہ دیئے بلکہ اُس نے اسلحہ اور سامان کے استعمال کے لیے اپنے
افراد بھی دیئے۔ اس صورتِ حال میں ہماری حکومت کو اقوامِ متحدہ میں یہ شکایت
پیش کرنی چاہیئے تھی کہ روس برِصغیر کے امن کو تباہ اور مشرقی پاکستان کی بدامنی
کو جنگ میں بدلنے کے انتظامات کر رہا ہے۔

روس اور بھارت کے دفاعی معاہدے کا توڑ صرف یہ تھا کہ پاکستان امریکہ
سے کہتا بلکہ امریکہ کو مجبور کرتا کہ وہ پاکستان کے ساتھ اُسی طرح کا معاہدہ کرے جس
طرح روس نے بھارت کے ساتھ کیا ہے اور پاکستان کو ویسے ہی اور اتنے ہی ہتھیار
دے جتنے روس نے بھارت کو دیتے ہیں۔ اگر پاکستان امریکہ کو ایسے معاہدے
کے لیے کہتا تو یہ پتہ چل جاتا کہ امریکہ پاکستان کی دوستی میں کتنا مخلص ہے لیکن
پاکستان امریکہ کو دفاعی معاہدے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بھکاری
اُن لوگوں کو اپنی پسند اور ناپسند کا پابند نہیں بنا سکتا جن کی بھیک پر وہ زندہ
رہتا ہے۔

ہمارے حکمرانوں نے پاکستان کو امریکہ کا محتاج بنا ڈالا ہے۔ اپنا قومی
وقار اور خودداریت گروی رکھ دی ہے۔ بھارت کی قیادت کو مکار اور عیار
کہہ لیں لیکن اپنے عزم کی تکمیل کے لیے کہ پاکستان کو ختم کرنا ہے، بھارت
کے لیڈر جھوٹ، فریب کاری اور عیاری کو جائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے

ایسی پالیسی وضع کی ہے کہ روس سے بھی مدد لے لی اور امریکہ سے مدد یہ
لی کہ اُسے منوا لیا کہ وہ پاکستان کو کچھ نہ دے۔ اگر کچھ دینا ہی ہے تو دھوکہ
دے۔

اگر اُس وقت کے پاکستانی حکمران مخلص ہوتے تو وہ امریکہ کے ساتھ
دفاعی معاہدہ کرتے۔ اگر امریکہ رضامند نہ ہوتا تو چین کے ساتھ دفاعی
معاہدے کی بات کرتے لیکن ہمارے بادشاہ نے ایسی کوئی ضرورت محسوس
نہ کی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان سے دستبردار ہو
چکے تھے۔

بھارت نے روس کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے ریڈیو، اخبارات اور
ففتھ کالمسٹ کے ذریعے نظریۂ پاکستان کے خلاف اور بنگالیوں کے دلوں میں
مغربی پاکستان کی نفرت پیدا کرنے کی مہم اور زیادہ تیز کر دی۔ محبِ وطن سرکردہ
افراد کو خطوط میں یہ دھمکیاں دی گئیں کہ وہ ملک کے ساتھ غداری کر رہے
ہیں۔ اگر وہ باز نہ آئے تو ان کے پورے کُنبے کو قتل کر دیا جائے گا۔ پاک فوج
کو اب بازار سے خورد و نوش کی اشیا بھی نہیں ملتی تھیں۔ کچھ لوگ رضاکارانہ
طور پر انتظام کرتے اور پاک فوج کو کھانے پینے کا سامان پہنچاتے تھے مگر یہ سلسلہ
بھی رُکتا جا رہا تھا۔ یہاں تک ہُوا کہ فوج کے لیے کیلے خریدے گئے۔ کھانے
سے پہلے ہی کیلوں کا رنگ سیاہ ہونے لگا۔ معلوم ہُوا کہ انجکشن کے ذریعے
کیلوں میں زہر ملا دیا گیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جن کے لیے کیلے گئے تھے
انہوں نے جلدی نہ کھا لیے۔

اب مشرقی پاکستان میدانِ حشر بن گیا تھا۔ سرحدوں پر ٹروپس باقاعدہ
جنگ لڑ رہے تھے اور ملک کے اندر گوریلوں کے خلاف جنگ لڑی جا رہی
تھی۔ کوئی پُل سلامت نہیں رہا تھا۔ کئی جگہوں "مُکتی باہنی" نے گولا بارود کے
ذخیرے بھی اُڑا دیئے۔ وائرلیس سیٹوں کی بھی کمی تھی، اس لیے باہمی رابطے
بھی مخدوش تھے۔ افسروں اور جوانوں کی جسمانی حالت روز بروز خراب ہو رہی
تھی۔ فضائیہ کا ابھی تک ایک ہی سکواڈرن تھا اور بحریہ کی صرف چار گن بوٹیں

تھیں۔ اِن حالات میں اپنی ایسٹرن کمانڈ کو حکم دیا گیا کہ دشمن کو مشرقی پاکستان کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہ کرنے دیا جائے۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر دشمن نے کسی علاقے پر قبضہ کر لیا تو وہاں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دی جائے گی اور بھارت اسے فوراً تسلیم کر لے گا۔

حیرت ہے کہ اسلام آباد سے احکام تو دیئے جاتے تھے مگر احکام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسٹرن کمانڈ کی ضروریات پوری نہیں کی جاتی تھیں۔ ایسٹرن کمانڈ کمک مانگ رہی تھی۔ آخر مغربی پاکستان سے پولیس کی کچھ نفری بھیج دی گئی۔ ملک کے اندر باغیوں کی سرکوبی کے لیے مجاہد فورس اور رضاکار بھرتی کیے گئے مگر انہیں نہ تربیت دی گئی نہ موزوں ہتھیار۔ "مکتی باہنی" کی گوریلا پارٹیوں نے رضاکاروں پر حملے شروع کر دیئے۔ ان کے گھروں پر حملے کیے۔ انہیں پروپیگنڈے سے بھی گمراہ کیا۔ پھر وہ وقت آیا کہ رضاکار بھی بیکار ثابت ہونے لگے۔

ستمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان قدرے پُرسکون ہو گیا۔ یہاں تک اطلاعیں ملنے لگیں کہ مکتی باہنی میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ بھارتیوں نے مکتی باہنی کو یقین دلا دیا تھا کہ اس ساون میں وہ مکتی باہنی کو ایک شدید حملہ کرنے کے لیے بھرپور مدد دے گا جو کامیاب ہو گا۔ درحقیقت یہ حملہ ناکام ہو چکا تھا۔ مکتی باہنی کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ اس کی بہت سی نفری بھارت میں اپنے کیمپوں میں چلی گئی تھی جہاں سے یہاں تک اطلاع ملی تھی کہ مکتی باہنی کی بیشتر نفری کے حوصلے ٹوٹ گئے ہیں اور شاید وہ ایک لمبے عرصے تک اپنی جنگی سرگرمیاں از سرِ نو شروع نہ کر سکے۔ یہ کامیابی ہمارے انہی تین ڈویژنوں کی تھی جو بے سروسامانی کی کیفیت میں لڑ رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسٹرن کمانڈ نے ایک بار پھر سیاسی تصفیے کے لیے زمین ہموار کر دی تھی مگر ہمارے سیاسی حلقے حسب سابق بے نیازی کے عالم میں تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قصرِ صدارت میں کوئی سیاست دان نہیں تھا۔ وہاں سب جرنیل تھے۔ یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ یہ کس نوعیت اور کس ذہنیت کے جرنیل تھے۔

ستمبر ۱۹۷۱ء میں ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ پروپیگنڈے کے ذریعے علیحدگی پسند عناصر کا اعتماد حاصل کیا جا سکتا تھا مگر اس فضا سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان کے بعض لیڈر (جو سیاسی لیڈر بھی تھے وہ حکومتِ پاکستان سے توقع رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ صلح و صفائی کی بات چیت کی جائے لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ اس فضا پر بھی بھارت غالب آ گیا۔ بھارت نے ان لیڈروں کو نفسیاتی طور پر سنبھال لیا اور پہلے سے زیادہ جنگی مدد پیش کی۔ اب تو روس کے مفادات بھی شامل ہو گئے تھے۔ روس بہت جلد مشرقی پاکستان کو فتح کر لینا چاہتا تھا۔ بھارت نے پاکستان کے سیاسی حلقوں (جو دراصل فوجی تھے) کی سرد مہری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکتی باہنی کو ذہنی طور پر از سرِ نو تیار کر لیا اور اکتوبر ۱۹۷۱ء میں سرحدوں پر حملوں میں اضافہ کر دیا۔

ہماری ایسٹرن کمانڈ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ مکتی باہنی کو کسی علاقے پر قبضہ نہ کرنے دے۔ اس کے ساتھ ہی سرحدوں پر اسے حملے بھی روکنے تھے۔ اکتوبر میں مشرقی پاکستان کے اندر دشمن کی گوریلا سرگرمیاں پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ گوریلوں نے ایک دریا میں جاتا ہوا ہمارا ایک بحری جہاز پکڑ لیا جس میں پاک فوج کا ایمونیشن جا رہا تھا۔ اس طرح ہمارے تین ڈویژنوں کے لیے دو محاذ کھل گئے۔ گوریلوں کے خلاف لڑنا اور سرحدوں پر حملے روکنا۔ یہ محاذ تو پہلے ہی کھلے ہوئے تھے مگر اب ان کی شدت میں اضافہ ہو گیا اور یہ محاذ اس لیے بھی زیادہ خطرناک ہو گئے تھے کہ ہمارے ٹروپس تھک چکے تھے اور شہادت، بیماری اور زخمیوں کی وجہ سے ان کی نفری بہت کم رہ گئی تھی۔ انہیں ابھی تک ٹینک اور بڑی توپیں نہیں ملی تھیں اور نہ ہی ایمونیشن بھیجا گیا تھا۔ ان سے ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی توقع وابستہ کر لی گئی تھی۔

روس کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کو جلدی ختم کیا جائے مگر بھارت کو مشرقی پاکستان پر کھلے حملے کا جواز نہیں مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھارت مشرقی پاکستان کے لیے جان اور خون کی اتنی زیادہ قربانی نہیں

دینا چاہتا تھا۔ وہ آسان فتح کے لیے زمین ہموار کر رہا تھا۔ اس منصوبے کے تحت وہ مکتی باہنی کے نام سے اپنی کمانڈو فورس کو استعمال کر رہا تھا۔ سرحدوں پر حملوں میں وہ اپنی فوج کو آگے بڑھاتا تھا۔ اس کے آگے بنگالی ہوتے تھے۔ جہاں پاک فوج کے ساتھ تصادم ہوتا، بھارتی بٹالین پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ بھارت کا توپ خانہ اپنے علاقے سے گولہ باری کرتا تھا۔ بھارت نے ملک کے اندر گوریلا اپریشن پر خصوصی توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ اس کے لیے اُس نے اسرائیل سے ایک ماہر جرنیل جیکب کو بلا لیا تھا۔ جنرل جیکب جنگل کی جنگ اور گوریلا جنگ کا ماہر تھا۔ بھارت کی سکیم یہ تھی کہ پاکستان کے ان تین ڈویژنوں کو جو پہلے ہی کمزور ہو چکے ہیں سارے ملک میں بکھیر دیا جائے اور انہیں اس قدر شل کر دیا جائے کہ نڈھال ہو کر گر پڑیں یا جنگ کی صورت میں یہ لڑنے کے قابل نہ رہیں۔

بھارت کی یہ سکیم کامیاب تھی۔ گوریلوں نے مشرقی پاکستان کے اندر وسیع پیمانے پر ایسی خطرناک کارروائیاں شروع کر دیں کہ ہمارے ٹروپس پہلے کمپنیوں کی صورت میں تقسیم ہوئے پھر پلاٹونوں کی صورت میں اور پھر سکیشن سکیشن ہو کر بکھر گئے۔ بعض اوقات اپنی کوئی سکیشن کہیں گھر جاتی تھی تو دوسری سکشنیں بھاگم بھاگ وہاں پہنچتیں اور انہیں گھری ہوئی سکیشن کو نکالنے کے لیے تا دیر معرکہ لڑنا پڑتا۔ مواصلاتی نظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب تو دریائی ٹرانسپورٹ بھی میسر نہیں تھی۔ اپنے جو ٹروپس سرحدوں پر تھے وہ دفاعی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ سرحدوں پر پابند ہو کر رہ گئے تھے۔

یہاں ان تین ڈویژنوں اور مشرقی پاکستان کو ذرا سامنے رکھیے۔ سوال پیدا ہوتا ہے، کیا اتنے بڑے ملک اور اتنے دشوار گزار ملک میں تین ڈویژن کافی تھے؟ اگر انہیں تمام تر ضروریات مثلاً ٹینک رجمنٹیں، توپ خانہ رجمنٹیں، ای۔ ایم۔ ای گاڑیاں، میڈیکل کور اور دیگر امدادی یونٹیں دی گئی ہوتیں تو ان ڈویژنوں سے زیادہ توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ گو ان حالات میں جب کہ سرحدوں پر حملے اور ملک کے اندر بہت بڑی کمانڈو اور گوریلا فورس سرگرم تھی، تین ڈویژن

پھر بھی ناکافی تھے۔ ذرا تصور فرمائیے کہ مغربی پاکستان پر ۱۹۶۵ء میں حملہ ہوا تو ہر سیکٹر میں کم از کم ایک ڈویژن دفاع میں لڑا تھا۔ سیالکوٹ سیکٹر میں ایک بکتر بند ڈویژن اور ایک پیادہ ڈویژن تھا جنہیں فضائی مدد، سپلائی، ہیوی آرٹلری کی سپورٹ بلکہ کور آرٹلری کی مدد حاصل تھی۔ اسی طرح دوسرے سیکٹروں میں ایک ایک ڈویژن ہر طرح کی مدد کے ساتھ لڑایا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی ایسے ہی ہوا، مگر مشرقی پاکستان کے پورے مد میں صرف تین ڈویژن اور وہ بھی جنگی طاقت کے لحاظ سے بے حد کمزور، لڑائے جا رہے تھے۔ ایسے تین ڈویژن تو صرف ایک سیکٹر میں یعنی زیادہ سے زیادہ ایک سو میل کے محاذ پر لڑائے جاتے ہیں۔

ایک پہلو یہ بھی سامنے رکھیے کہ جنرل نیازی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر بھی تھے اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی اور اُن کی یونٹوں کے افسر ڈپٹی کمشنروں اور تحصیلداروں وغیرہ کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے تھے۔ اسلام آباد کے قصرِ صدارت اور جی۔ ایچ۔ کیو کو اچھی طرح علم تھا کہ مشرقی پاکستان کی صورتِ حال کیا ہے اور اپنے ٹروپس کس کیفیت میں ہیں۔ جی۔ ایچ۔ کیو کے اعلیٰ افسر مشرقی پاکستان جاتے رہتے تھے۔ وہ واپس آ کر مایوسی کا اظہار کرتے تھے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر بھی وہاں گئے اور واپس آ کر ذمہ دار افسروں کو بتایا کہ اپنے ٹروپس بکھرے ہوئے ہیں۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں انھیں دشمن بڑی آسانی سے شکست دے سکے گا۔ نومبر کے شروع میں وائس چیف آف سٹاف نے بھی مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور واپس آ کر چیف آف سٹاف کو وہاں کی کیفیت بتائی۔ چیف آف سٹاف نے کہا کہ انہوں نے وہاں کے فیصلے ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر پر چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ جیسے مناسب سمجھتے ہیں لڑیں۔

جی۔ ایچ۔ کیو میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کی صورت مجلسِ مذاکرہ کی سی تھی۔ اس کا اختتام وہی ہوا جو ہر مجلسِ مذاکرہ کا ہوا کرتا ہے۔ کوئی عملی کارروائی نہ کی گئی۔ سوائے اس کے کہ ایسٹرن کمانڈ بار بار درخواست

کر چکی تھی کہ اسے ایک اور ڈویژن دیا جائے۔ صرف تین انفنٹری پلٹنیں جن میں ایک بٹالین آزاد کشمیر کی تھی، مشرقی پاکستان بھیج دی گئیں مگر ان کے ساتھ بھی بڑے ہتھیار اور دیگر سامان نہ بھیجا گیا۔ پہلے ٹروپس کی طرح ان پلٹنوں کو بھی ذاتی ہتھیار (رائفلیں، سٹین گنیں) دے کر بھیج دیا گیا۔

بھارت کی جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اس نے مشرقی پاکستان کے ارد گرد تین کوریں (کم و بیش بارہ ڈویژن) تیار رکھی ہوئی تھیں۔ اس لشکر کو ہمارے تین ڈویژنوں پر حملہ کرنا تھا۔ بھارتی فیلڈ مارشل مانک شا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا — "ہم نے مشرقی پاکستان کو فتح کرنے کا پلان انتہائی باریک تفصیل تک تیار کر لیا تھا۔ ہم پر سیاسی مقاصد واضح کر دیئے گئے تھے اور حکومت پوری طرح ہماری پشت پناہی کر رہی تھی مگر بھارت کو حملے کا جواز نہیں مل رہا تھا۔"

مانک شا سرحدی حملوں اور گوریلوں سے ہماری ایسٹرن کمانڈ کو اپنی مرضی کی پوزیشن میں لے آیا تھا۔

جنرل اروڑہ نے جو بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کا کمانڈر تھا دسمبر ۷۳ء میں ایک انٹرویو میں کہا تھا — "ہم جنگ کے لیے اور مشرقی پاکستان کو ایک ہی ہلّے میں لے لینے کے لیے بالکل تیار تھے مگر پاکستان کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہو رہی تھی جو ہمیں کھلے حملے کا جواز مہیا کرتی ..... میں مایوس ہو گیا تھا کہ جنگ ہو گی ہی نہیں۔ آخر ۳ دسمبر کی شام جنرل یحییٰ خان نے ہمیں وہ تحفہ دے دیا جس کی ہم دعائیں مانگ رہے تھے۔ مغربی پاکستان سے حملہ ہوتے ہی ہمیں حکم ملا کہ مشرقی پاکستان پر حملہ کر دو۔"

جنرل نیازی جی۔ ایچ۔ کیو کو خبردار کر چکے تھے کہ مغربی پاکستان سے حملہ نہ کرنا۔ انہوں نے اسی خطرے کے پیش نظر یہ مشورہ دیا تھا جس پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے مغربی پاکستان کے اندرونی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اکتوبر میں اچانک مغربی پاکستان سے ایک نیا نعرہ اُٹھا CRUSH INDIA دیکھتے ہی دیکھتے یہ نعرہ جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ گاڑیوں پر، دیواروں پر اور جدھر دیکھو انہی الفاظ کے پوسٹر لگے نظر آتے تھے۔ ہمارے صحافیوں اور ادیبوں نے اس نعرے CRUSH INDIA کو اور زیادہ مشتہر کیا۔ پھر اس نعرے کو بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور بڑے بڑے کارخانوں نے اپنی پبلسٹی کا ذریعہ بنایا۔ مثلاً موٹے حروف میں لکھا ہوتا CRUSH INDIA اور اس کے نیچے کسی بنک یا کسی کمپنی کا نام لکھا ہوتا۔ جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے بھارت کو کچل دینے کے مطالبے ہونے لگے۔ سیاسی لیڈروں کی زبان پر بھی یہی نعرہ تھا۔ غرض ایک جنون تھا جو حیران کن سرعت کے ساتھ ساری قوم پر طاری ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی بھارت نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ تیز اور اشتعال انگیز کر دیا۔ بھارت کے صفِ اوّل کے وہ ادیب جن کے افسانے پاکستان کے ادبی اور دیگر رسالے آج بھی بڑی شد و مد سے شائع کیا کرتے ہیں، آل انڈیا ریڈیو سے پاکستان کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کرتے تھے اور پاکستان کے ادیبوں سے مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ ادیب کا کوئی ملک نہیں ہوتا اور ادیب کسی سرحد کا پابند نہیں ہوتا۔ ادیب بنی نوع انسان کا مونس و غمخوار ہوتا ہے۔ پاکستان کے ادیبو! اپنا فرض ادا کرو اور اپنے حکمرانوں سے کہو کہ مشرقی پاکستان کو آزاد کریں اور وہاں کے لوگوں پر ظلم و تشدّد بند کریں۔

پاکستان کے چند ایک ادیبوں نے مل کر پاکستان ڈیفنس کمیٹی بنائی اور ٹی وی اور ریڈیو کے حکام سے ملے کہ بھارت کے ادیبوں کی اشتعال انگیز نشری تقریروں کے جواب میں ہمیں ریڈیو اور ٹی وی سے بولنے کی اجازت دی جائے۔ ٹی وی کے حکام نے تو سُنی ان سُنی کر دی، ریڈیو سے دو یا تین ادیبوں کو بولنے کا موقع دیا گیا پھر یہ سلسلہ ریڈیو والوں نے روک دیا۔ اس طرح مغربی پاکستان کے عوام کے کانوں میں صرف بھارتی ادیبوں کی آوازیں پڑتی رہیں۔ عوام یکطرفہ پروپیگنڈہ سنتے رہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانیوں پر "کرش انڈیا" کا جنون بھارت نے طاری کرایا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ بھارت چاہتا تھا کہ پاکستان ادھر سے حملہ کرے۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس کتنی کچھ جنگی طاقت ہے۔ اُس نے حملہ روکنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اُسے مشرقی پاکستان پر حملے کے لیے جواز کی ضرورت تھی۔ اس کا اُس نے یہ ذریعہ اختیار کیا کہ اپنے ففتھ کالم اور ایجنٹوں کی وساطت سے مغربی پاکستان میں "کرش انڈیا" کا نعرہ پھیلا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ قوم اپنی حکومت کو مجبور کر دے کہ ادھر سے بھارت پر حملہ کیا جائے۔

ہم جذبات میں بہہ جانے والی قوم ہیں۔ جذبات کی شدّت سے ہم عقل و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈروں نے ہمیشہ ہماری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ہمارے دشمن نے ہماری اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ ہمارے منہ میں "کرش انڈیا" کا نعرہ دے دیا اور ہم بھڑک اُٹھے۔ اُس وقت ضرورت یہ تھی کہ قوم کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا جاتا اور جذباتیت پر قابو پایا جاتا۔ قوم کو بتایا جاتا کہ اب تو بھارت بھی یہی چاہتا ہے کہ اس پر حملہ کیا جائے، مگر قوم کو ابتدا ہی سے اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ اگر ہمارے حکمران قوم کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرتے تو انہیں اپنے جرائم کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی جو بیان دیا وہ جذباتی نوعیت کا دیا۔ ہمارے سیاسی لیڈر بھی دشمن کی چال کو نہ سمجھ سکے۔ وہ تو اپنی چالوں میں مگن تھے۔ انہوں نے بھی کہیں تقریر کی یا بیان دیا تو عوام کی جذباتیت سے کھیلنے کی کوشش کی۔

ہوسکتا ہے بعض قارئین ہماری اس رائے سے متفق نہ ہوں کہ "بھارت کو کچل دو" کا نعرہ ہمارے منہ میں بھارت نے ڈالا تھا بلکہ یہ قوم کے اپنے جوش اور جذبے کا آزادانہ اظہار تھا، ہم ان سادہ لوح قارئین کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پروپیگنڈہ اور ففتھ کالم باقاعدہ سائنس کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ بھارت نے اس سائنس میں ہمیشہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ پروپیگنڈے کا اگر بحیثیت ایک سائنس مطالعہ کریں تو آپ پر بعض حیرت انگیز اصول اور طریقے بے نقاب ہوں گے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ بعض حالات میں ایسا پروپیگنڈہ کرنا پڑتا ہے جس میں دشمن کی بہادری کی تعریفیں کی جاتی ہیں اور اپنے آپ کو کمتر کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات دشمن کو ایک خاص پوزیشن میں لانے کے لیے دشمن کو اپنے خلاف بھڑکانا پڑتا ہے۔ دشمن کو مشتعل کرنے کے لیے اپنے ایجنٹ جنہیں ففتھ کالم کہتے ہیں استعمال کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بھارت کے ایجنٹوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ سرکاری حلقوں میں ادیبوں اور صحافیوں میں بھارت کے ایجنٹ موجود ہیں۔

اگست ۱۹۷۱ء کے بعد، خصوصاً اکتوبر کے مہینے میں اچانک "کرش انڈیا" کے نعرے کا اُٹھنا اور طوفان کی طرح پوری قوم کو لپیٹ میں لے لینا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ نعرہ بڑی کاوش اور نہایت منظم سازش سے ملک میں آیا تھا۔ ورنہ یہی انڈیا تھا جس کے متعلق قوم کو ایک عرصے سے معلوم تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں کیا کر رہا ہے۔ آج وہی پاکستانی ہیں جو انڈیا کے فلمی گانوں اور اُس کی فلموں کی وساطت سے اُس کے گرویدہ ہوتے جا رہے ہیں، "وہ کرش انڈیا" کے نعرے کو بھول چکے ہیں۔ ہم دراصل بارُود ہیں۔ اس میں دشمن چنگاری پھینک دے یا دوست، ہمارا دھماکہ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ پھر ہم دھماکے کی گونج کی طرح تھوڑی سی دیر بھٹک کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔

اُدھر ہماری ایسٹرن کمانڈ کا یہ مطالبہ تھا کہ مغربی پاکستان سے حملہ نہ کیا جائے اِدھر قوم چلّا رہی تھی کہ بھارت پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ دشمن بھی ہمیں اُلّو بنا رہا تھا اور اپنے حکمران بھی۔ ہم بڑی تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے تھے یا لے جائے جا رہے تھے۔ ہمارے فوجی حکمران مشرقی پاکستان میں فوج، فضائیہ اور بحریہ میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے تھے۔ وہاں جو فوج تھی اُس کی کیفیت کو بہتر بنانے کی طرف ذرہ بھر توجہ نہیں دے رہے تھے۔ وہ یا تو مطمئن تھے کہ اُس فوج کی حالت تسلّی بخش ہے یا انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارے یہ تین ڈویژن لڑنے کے قابل نہیں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جانتے تھے اور جو کچھ ہو رہا تھا وہ انہی کا منشاء تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان سے حملے کا وقت تو ایک مدت ہوئی گزر چکا تھا۔ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ حملے کے حکم کی منتظر تھی۔ سیاسی لحاظ سے بھارت نے پمفلٹوں سے، ریڈیو، ٹی وی، اپنے سفارت خانوں سے، دوست ممالک کے اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے عالمی برادری کو اپنا ہمنوا بنا کر پاکستان کے خلاف کر دیا تھا۔ پاکستان کیلئے عالمی پریس میں اب دھتکار اور پھٹکار رہ گئی تھی۔ برطانیہ کے اخبارز نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بھارت نے پاکستان کے "کرش انڈیا" نعرے کو اپنی مظلومیت اور معصومیت" کے حق میں یوں استعمال کیا کہ عالمی برادری کو بتایا کہ اسے پاکستان سے خطرہ ہے اور چین بھی پاکستان کی حمایت میں بھارت پر حملہ کر دے گا۔ لہٰذا وہ رُوس کے ساتھ دفاعی معاہدے میں حق بجانب ہے۔ اس طرح روس اس الزام سے بری ہو گیا کہ وہ مشرقی پاکستان میں جنگ کرانا چاہتا ہے۔

بھارت آدھی جنگ جیت چکا تھا۔ اب اسے ہتھیار ڈلوانے کے لیے حملہ کرنا تھا۔ اندرا گاندھی نے کئی ممالک کا دَورہ کر کے اپنا رونا رویا تھا۔ اُس نے پناہ گزینوں کی تعداد نوّے لاکھ بتائی اور یہ بھی کہا کہ ان میں ہزاروں پناہ گزین ہیضے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ اب (اکتوبر ۱۹۷۱ء) تک بھارت پناہ گزینوں پر پانچ ارب پچیس کروڑ روپیہ خرچ کر چکا ہے جس سے اُس کی اپنی اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے اور اُس کے ترقیاتی منصوبے رُک گئے ہیں۔ بعد میں بھارت نے سرکاری طور پر یہ اعداد و شمار نشر کئے تھے کہ پناہ گزینوں کے لیے دُوسرے ملکوں نے ایک ارب ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ دیا تھا۔ باقی چار ارب ساڑھے بارہ کروڑ بھارت کو اپنے پلّے سے خرچ کرنا پڑا۔ یہ ایک سفید جھوٹ تھا جو بھارت کی وزیرِ اعظم نے دوسرے ممالک میں جا کر بولا اور روپیہ اکٹھا کر لیا اور عالمی رائے عامہ کو پاکستان کے خلاف کر دیا۔ اس جھوٹ کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ حکومتِ پاکستان خاموش تھی اور یہ خاموشی مجرمانہ تھی۔

نومبر ۱۹۷۱ء میں بھارت کی گوریلا فورس نے جسے مکتی باہنی کا نام دیا گیا تھا، مشرقی پاکستان کے اندر اس قدر تباہی بپا کر دی تھی کہ اُن سے نہ کسی کی جان محفوظ

تھی نہ کوئی جگہ۔ ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نامہ نگار نے ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کے روز اپنے خبرنامے میں لکھا تھا ــــ "پاک آرمی اور گوریلے خونریز جنگ لڑ رہے ہیں۔ گوریلوں کا مقصد یہ ہے کہ انڈیا کے ساتھ جنگ سے پہلے پہلے پاک آرمی کو انتہائی کمزور کر دیا جائے۔ ایسٹ بنگال (مشرقی پاکستان) کے ایک تہائی حصے پر گوریلے کا قبضہ تو نہیں لیکن ان کی تباہ کُن سرگرمیوں کی وجہ سے یہ حصہ پاک آرمی کے کنٹرول سے باہر ہے۔ ملک کے اندر پچاس ہزار گوریلے سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کے خلاف لڑنے کے لیے پاکستان کے صرف تین ڈویژن ہیں جو سرحدوں پر بھی لڑ رہے ہیں"

ــــ اس نامہ نگار نے اپنے خبرنامے میں یہ بھی لکھا ــــ "میں نے پاک آرمی کے نوجوان افسروں کو کہتے سُنا ہے کہ یہ خانہ جنگی یحییٰ خان نے شروع کرائی ہے۔ اگر ہمارے بس میں ہو تو ہم اسے صدارت سے ہٹا دیں"۔

بھارتی وقائع نگار منکیکر نے اپنی ایک کتاب میں جنرل نیازی کی بے بسی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ــــ "ساڑھے سات کروڑ دشمن آبادی کے اندر جنرل نیازی کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی تھوڑی فوج سے وہ سرحدوں کو بھی سربمہر رکھتا اور ملک کے اندر ایسی بھیانک بغاوت کو بھی دبائے رکھتا" ــــ اگر جنرل نیازی کی بے بسی کو ہمارے حکمران بھی سمجھ جاتے تو پاکستان اتنی ذلت و رُسوائی سے دوچار نہ ہوتا۔

ہمارے حکمران، ہائی کمانڈ اور جی ایچ کیو اُس وقت بھی جنرل نیازی، ان کے ماتحت جرنیلوں اور ٹروپس کی بے بسی نہ سمجھ سکے جب ۲۰/۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کی رات بھارت نے تین کوروں یعنی کم و بیش بارہ ڈویژنوں سے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بھارتی توپ خانوں نے بے تحاشہ گولہ باری کی۔ تقریباً ایک سو بیس ہیلی کاپٹر استعمال کیے اور مجموعی طور پر چالیس سے پچاس میل تک بھارتی فوج اندر آ گئی۔ ہمارے ٹروپس نے ہر طرف سے حملہ روک لیا، حالانکہ جسمانی لحاظ سے، اسلحہ کے لحاظ سے، ساز و سامان اور نفری کے لحاظ سے وہ حملہ روکنے کے قابل نہیں تھے۔ یہ حملے جاری رہے۔ حملے آتے تھے اور ہمارے دستے جذبے کے زور پر روکتے تھے۔ کمک اور سپلائی کے بغیر لڑتے تھے۔ اُدھر بھارت کی نیوی دریاؤں تک آ گئی۔

اسے روکنے کے لیے ایسٹرن کمانڈ کے پاس کچھ نہیں تھا۔ صرف چار گن بوٹیں تھیں جو محض ایک مذاق کی حیثیت رکھتی تھیں۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ فوج کو مشرقی پاکستان میں داخل ہونے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے حکمرانوں نے وہی سرد رویہ اختیار کیے رکھا جو پہلے تھا۔ انہوں نے نہ اقوامِ متحدہ سے شکایت کی نہ ایسٹرن کمانڈ کو جنگی طاقت دی۔ نہ سامان بھیجا نہ کمک دی۔

مشرقی پاکستان میں کھلی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ گو بھارتی فوج سرحد سے زیادہ آگے نہیں آ رہی تھی۔ اُن کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ پاک فوج کے ان تین ڈویژنوں میں اگر کچھ دم خم رہ گیا ہے تو وہ توڑ دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ کمانڈو فورس کو ملک کے اندر آزادی سے تباہ کاری کا موقع فراہم کیا جائے۔

اب ہماری کمان ناممکن کو ممکن کر دکھا رہی تھی مگر صرف جذبے اور شوقِ شہادت کے زور پر جنگ لڑی تو جا سکتی ہے جیتی نہیں جا سکتی۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہونے سے پہلے انڈین آرمی ہلی سیکٹر میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر چکی تھی اور ۳ دسمبر کے روز بھی اس سیکٹر میں بڑی ہی خونریز جنگ لڑی جا رہی تھی جو ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک لڑی گئی۔ اس معرکے کی تفصیلات بہت طویل ہیں جو پھر کبھی سنائی جائیں گی۔ یہاں ہلی کا مختصر سا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ دشمن نے کس قدر بھیانک طاقت سے حملہ کیا تھا اور اتنے وسیع فرنٹ پر اتنا بڑا حملہ روکنے کے لیے پاک فوج کی کتنی نفری تھی۔

بھارت نے یہ حملہ ۲۱/۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات کیا تھا۔ یہ مشرقی پاکستان کا شمال مغربی محاذ تھا۔ بھارت نے جس فورس سے حملہ کیا اس کی تفصیل یہ ہے —— نمبر ۲۰ ماؤنٹین ڈویژن، نمبر ۶ ماؤنٹین ڈویژن اور شمال کی طرف نمبر ۷۱ ماؤنٹین بریگیڈ —— یہ انڈین آرمی کی نمبر ۳۳ کور تھی جس کا کمانڈر جنرل تھاپن تھا۔ نمبر ۲۰ ماؤنٹین ڈویژن کا کمانڈر میجر جنرل لچھمن سنگھ تھا۔

اس فورس کے ساتھ انڈین آرمی کا ایک بکتر بند (ٹینک) بریگیڈ بھی تھا جس کے پاس روس کے دیئے ہوئے PT-76 قسم کے ٹینک تھے جو خشکی پر چلتے اور پانی میں تیرتے ہیں۔ اس بریگیڈ میں روس کے T-55 قسم کے ٹینک بھی تھے جو رات کے اندھیرے میں بھی لڑ سکتے ہیں۔ اس حملہ آور فورس کے پاس کور آرٹلری تھی جس کی توپوں کی تعداد تقریباً تین سو تھی۔

اس کے مقابلے میں اس محاذ پر پاک فوج کا صرف ایک پیادہ ڈویژن تھا۔ اس ڈویژن کی ذمہ داری میں سارا علاقہ تھا جہاں دشمن کے دو پہاڑی ڈویژنوں، ایک پہاڑی بریگیڈ اور ایک آرمرڈ بریگیڈ نے حملہ کیا تھا۔ پاک فوج کے اس تھکے ماندے پیادہ ڈویژن کے پاس M-24 قسم کے چھ سات ٹینک تھے جنہیں TOY TANK کہا جاتا تھا، یعنی کھلونے۔ دشمن کی تین سو توپوں کے مقابلے اپنے پاس چند ایک چھوٹی (فیلڈ) توپیں تھیں۔

پاک فوج کی اس قلیل نفری نے ۲۱ نومبر سے ۱۶ دسمبر تک دشمن کے تابڑ توڑ حملے روکے۔ اس محاذ نے ایک "نشانِ حیدر" پیدا کیا۔ یہ تھے میجر محمد اکرم شہید نشانِ حیدر۔

ہلی کے معرکے میں پاک فوج کے ان مٹھی بھر افسروں اور جوانوں نے جانبازی اور حب الوطنی کے جو مظاہرے کیے انہیں بھارتی جرنیلوں نے دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اُدھر اتنی خونریز لڑائی لڑی جا رہی تھی اِدھر اسلام آباد میں ہمارے فوجی حکمران تماشائی بنے ہوئے تھے۔

ہماری ایسٹرن کمانڈ نے جس طرح مارچ ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتے سے شروع ہونے والا ایکشن لڑا اور بھارت کے شدید اور طاقتور حملے روکے وہ جرأت، شجاعت، فرض کی لگن اور جذبہ حب الوطنی کی بے مثال داستان ہے۔ اکتوبر اور نومبر کے مہینے اُن کے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔ وہ اتنی تھوڑی نفری سے، اتنی بری جسمانی حالت میں، اتنی بے سروسامانی کے

عالم میں بیک وقت دو طرح کی جنگ لڑے اور جب ان کے جسموں میں آخری سانسیں رہ گئی تھیں اُن پر چاروں طرف سے دشمن نے حملہ کر دیا۔

ایسٹرن کمانڈ کے جرنیلوں اور بریگیڈ کمانڈروں پر ہمارے ہاں یہ الزام عاید کیا گیا ہے کہ اُن کی قیادت ناقص تھی اور انہوں نے کسی پلان کے بغیر جنگ لڑی۔ اس الزام کا جواب صرف ایک ہی صورت میں دیا جا سکتا ہے کہ وہاں کا ہر ایک معرکہ بیان کیا جائے۔ اس زمین کی تشریح بھی تفصیل سے کی جائے جس پر یہ معرکے لڑے گئے۔ ایک مضمون میں اتنی طویل داستان کو سمیٹنا ممکن نہیں۔

یہاں صرف ایک کیپٹن کی مثال کافی ہو گی۔ کیپٹن اظہر الطاف بخاری شہید کومیلا سیکٹر میں تھے۔ انہوں نے مکتی باہنی اور بھارت کی گوریلا فورس کا ایسا بُرا حشر کر رکھا تھا کہ دشمن نے انہیں زندہ یا مُردہ پکڑنے کے لیے دس ہزار روپے انعام مقرر کیا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۱ء کے روز کیپٹن بخاری اپنی پارٹی کے ساتھ ایک موٹر بوٹ میں جا رہے تھے کہ گھات میں آ گئے۔ وہ شہید ہو گئے لیکن دشمن انہیں مُردہ بھی نہ پکڑ سکا۔ انہیں کومیلا چھاؤنی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ان کے جسم سے ساٹھ گولیاں پار ہو گئی تھیں۔

اکیلے کیپٹن اظہر الطاف بخاری نہیں، ہمارے ہر شہید افسر اور جوان کا جوش اور جذبہ یہی تھا اور جہاں تک جرنیلوں اور بریگیڈ کمانڈروں کی قیادت اور پلاننگ کا تعلق ہے، یہ قیادت اور پلاننگ کا ہی کمال تھا کہ وہ نو مہینے لڑے اور آخر میں انہوں نے اپنے حکمرانوں، سیاسی لیڈروں اور اپنی ہائی کمان کی حقائق سے چشم پوشی اور مجرمانہ کوتاہیوں کی سزا بھگتی۔ اُن پر جو الزامات عاید کیے گئے وہ دراصل اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا گیا۔ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ ہماری اسی لغزش کی منتظر تھی اور ہماری ایسٹرن کمانڈ اپنے بادشاہوں کو اس لغزش سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو اُسی شام حکم مل گیا کہ پاکستان نے بھارت پر حملہ کر دیا ہے۔ تم مشرقی پاکستان پر فوراً حملہ کر دو۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے کچھ عرصہ بعد "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان پر کھُلا حملہ کرنے کو تیار تھا لیکن اعلانِ جنگ کا کوئی جواز نہیں مل رہا تھا۔ اروڑہ نے کہا ــــ "آخر ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام جنرل یحییٰ خان نے ہمیں کرسمس کا یہ تحفہ دیا کہ مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا۔ اندرا گاندھی نے ہمیں حکم دیا کہ مشرقی پاکستان پر حملہ کر دو۔"

اگر جنرل یحییٰ خان اور اُس کے فوجی مشیروں کے اِس حکم کا کہ بھارت پر حملہ کر دو، تجزیہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے اور اس ڈرامے کا آخری پردہ گرانے کا جواز مہیّا کیا تھا۔

اپنے حکمرانوں کی عیّاری اور ریاکاری کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب بھارت کی تین کوروں، پورے کے پورے فضائی بیڑے اور نیوی نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تو جنرل نیازی اسے بھی اکتوبر نومبر کے حملوں کی ایک کڑی سمجھتے رہے۔ ۴ دسمبر کے روز انہوں نے آل انڈیا ریڈیو سے سُنا کہ گزشتہ شام پاکستان نے اُدھر سے بھارت پر حملہ کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اِدھر سے بھارت پر حملہ کرنے سے پہلے جنرل نیازی اور ڈاکٹر مالک کو اطلاع تک نہیں دی گئی تھی اور انہیں یہ مہلت ہی نہیں دی گئی کہ وہ کھُلی جنگ کے لیے اپنی پوزیشنوں میں ردّ و بدل کریں ـــــ جنرل نیازی اور اُن کے دوسرے جرنیل اب شکست کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک ملتوی کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

یہاں بھارت کے عزائم کو مزید واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بھارت کے عزائم تو روزِ روشن کی طرح واضح رہے ہیں۔ بھارت کی قیادت نے پاکستان کے متعلق اپنی معاندانہ پالیسی اور ذہنیت کو کبھی بھی پردے میں نہیں رکھا۔ یہ پالیسی ان کا مذہبی فریضہ بن چکی ہے اور یہ ان کی ذہنیت کا بنیادی پتھر ہے۔

اس تجزیئے میں جو ہم پیش کر رہے ہیں ہم یہ کہتے آئے ہیں کہ بھارت نے علیحدگی پسند مسلمان بنگالی لیڈروں کو مدد دی اور اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں مغربی پاکستان کے عوام کے خلاف نفرت پیدا کی لیکن بنگلہ دیش کے بعض لیڈروں اور وقائع نگاروں نے بھارتی قیادت کے عزائم کو زیادہ اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ان میں ایک ڈاکٹر پروفیسر مطیع الرحمٰن ہیں جو زیادہ تر لندن میں رہتے ہیں۔ انہوں نے ڈھاکہ اور لندن کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست اور تاریخ پر انھیں عبور حاصل ہے اور وہ متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ان کی کتابیں لندن میں ہی چھپی ہیں اور عالمی شہرت یافتہ تبصرہ نگاروں اور سکالروں نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بنگلہ دیش پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور ایک کتاب مرتّب کی ہے جس کا نام SECOND THOUGHTS ON BANGLADESH ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کے مصنّف نے بعض مصلحتوں کی بنا پر اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔

اس کتاب کے مصنّف نے جو مکتی باہنی کا سرگرم کارندہ تھا، اپنے مشاہدات اور مختلف مفکّروں اور وقائع نگاروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان مغربی پاکستان کی ناروا بالادستی اور غیر جمہوری طرزِ حکومت سے آزاد ہونا چاہتے تھے لیکن اندرا گاندھی اور دیگر ہندو لیڈر پاکستان کے ٹکڑے کرنے کا تہیّہ کیے ہوئے تھے یعنی وہ مشرقی پاکستان کو بالکل ختم کرنا چاہتے تھے پھر اسے بنگلہ دیش بنا کر بھارت کا طفیلی ملک

بنانا یا اسے مکمل طور پر نئی دہلی کے تحت رکھنا ان کا پلان تھا۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کی اپنی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے لیڈر مغربی پاکستان سے آزاد ہونا تو چاہتے تھے لیکن بنگلہ دیشی بن کر بھی وہ پاکستانیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے کہ بنگلہ دیش بنتے ہی بھارت نے بنگلہ دیش میں ثقافتی انقلاب لانے کے ذرائع اختیار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر موصوف کے الفاظ یہ ہیں ــــ "بھارت کے ثقافتی انقلاب کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے (بنگلہ دیش کے) نوجوانوں کو DEPAKISTANISE کیا جائے اور ان پر اسلام کے جو اثرات ہیں وہ صاف کر کے ان کے ذہنوں میں ہندوازم داخل کیا جائے۔"

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن کا یہ لفظ DEPAKISTANISE قابلِ غور ہے۔ بنگلہ دیش پر بعض اور مصنفوں کی تحریریں بھی ہماری نظروں سے گزری ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے لیڈر مغربی پاکستان سے آزاد تو ہونا چاہتے تھے لیکن وہ پاکستانیت اور دو قومی نظریے سے آزادی نہیں چاہتے تھے اور وہ بھارت سے ہر طرح کی مدد لینے کے باوجود بھارت کی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

بھارت نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے شیخ مجیب کی عوامی لیگ کی اس طرح تشہیر کی تھی کہ آل انڈیا ریڈیو کے کلکتہ سٹیشن سے ہر وقت یہ پروپیگنڈہ نشر ہوتا رہتا تھا کہ "کشتی" کو ووٹ دیں۔ کشتی عوامی لیگ کا انتخابی نشان تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا یہ پروپیگنڈہ اُن ہندوؤں کے لیے تھا جو مشرقی پاکستان میں آباد تھے۔ ان ہندوؤں کو ہر قسم کی ہدایات آل انڈیا ریڈیو سے ملا کرتی تھیں۔

ہندوؤں کی اس پلاننگ کو واضح کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ مشرقی پاکستان میں راجشاہی کا ایک ہندو ایڈووکیٹ بیرن سرکار ہوا کرتا تھا۔ وہ وہاں کا سیاسی لیڈر بھی تھا۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ولی خان نے سرکار کو اپنی نیشنل عوامی پارٹی کا ٹکٹ دیا اور اسے ضلع راجشاہی کے کسی حلقے سے نیشنل اسمبلی کی سیٹ کے لیے کھڑا کیا۔ ڈاکٹر پروفیسر مطیع الرحمٰن لکھتے ہیں کہ سرکار بُری طرح ہار گیا۔ ایک تو اُسے ناکامی کی مایوسی کا سامنا ہوا اور دوسرے یہ کہ وہاں کے سرکردہ ہندوؤں

نے اُسے بُرا بھلا کہا کہ اُسے عوامی لیگ کی طرف سے کھڑا ہونا چاہیئے تھا۔ کسی دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہونا ایک ہندو کے لیے غداری تھی۔ سرکار جس حلقے سے کھڑا ہُوا تھا وہ ہندوؤں کی اکثریت کا حلقہ تھا پھر بھی وہ ناکام رہا۔

جن سرکردہ ہندوؤں نے اُسے بُرا بھلا کہا تھا اُن سے سرکار نے پوچھا کہ عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی میں فرق ہی کیا ہے؟

"مسٹر سرکار!" — ایک ہندو لیڈر نے اُسے کہا — "ہم نے پاکستان کو توڑنا ہے اور یہ کام عوامی لیگ کے ذریعے ہوگا۔"

سرکار نے انہیں کہا کہ اس صورت میں پاکستان آرمی فوجی کارروائی کرے گی تو پھر کیا کیا جائے گا؟ ان سرکردہ ہندوؤں نے اُسے جواب دیا — "اس کے لیے تمام تیاریاں مکمل ہیں۔"

بھارت کی حکومت نے جس طرح اپنے جاسوسوں کو مشرقی اور مغربی پاکستان میں داخل کر رکھا تھا اس کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔ پاکستان نیوی کا ایک بنگالی افسر لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین اگرتلہ سازش کیس کا ملزم تھا اور زیرِ حراست تھا۔ اُسے اُس کی بیوی کوہ نور نے ایک خط لکھا تھا جو ڈاک کے ذریعے نہیں بلکہ کسی اور طریقے سے معظم حسین تک پہنچایا گیا تھا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد یہ خط تاریخی اہمیّت کا خط بن گیا اور یہ ڈھاکہ کے ایک بنگالی اخبار "پوربھا دیش" میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء کے روز شائع ہُوا تھا۔ اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"....آپ اب میرے ساتھ نہیں ہیں۔ میں آپ کو مرتے دم تک نہیں بھولوں گی اور آپ نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے جو کچھ کیا ہے اور جو قربانیاں دی ہیں میں انہیں بھی نہیں بھولوں گی.... آپ کراچی سے ڈھاکہ جس طرح کسی اور نام سے آتے تھے اور جس طرح بھارتی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری پی این اوجھا سے سرحد پر اگرتلہ کے مقام پر ملے تھے اور جس طرح وہاں آپ کی ملاقات کچھ بھارتی افسروں کے ساتھ ہُوئی تھی وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔

آپ نے بڑی خوبی سے بھارتی افسروں کے ساتھ اسلحہ اور ایمونیشن کی مدد کی بات کی تھی"....

پی این اوجھا اپنے سفارت خانے میں پاکستان میں بھی رہ چکا ہے۔ وہ بڑی سنگین جاسوسی اور تخریبی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تھا اس لیے حکومتِ پاکستان نے اسے پاکستان سے نکال دیا تھا۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن اور تین اور بنگالی مسلمان وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ اسلحہ اور دیگر مدد کے لیے اُنہیں بھارت کی طرف ہی رجوع کرنا تھا بنگالیوں کے پاس اسلحہ اور ایمونیشن کی کمی تھی۔ بنگالی لیڈروں نے "بنی نوع انسان کی محبت" کے نام پر بھارت کی حکومت سے یہ کہہ کر مدد مانگی کہ وہ آزادی اور جمہوریت چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر مطیع الرحمٰن لکھتے ہیں کہ بھارت نے بنی نوع انسان کی محبت کے نام پر اس طرح مدد دی کہ اُس نے اپنے منافع کا حساب کر لیا لیکن یہ ایسا دودھ تھا جس میں بھارت نے خوب پانی ملایا۔ آخر میں پتہ چلا کہ دودھ تو بھارت نے رکھ لیا ہے اور ہمارے لیے صرف پانی رہ گیا ہے۔

وہ مکتی باہنی جس نے بڑی شہرت پائی تھی، دراصل ایک "مظلوم" گروہ تھا۔ یہ پہلے مرارجی ڈیسائی کی زبانی بتایا جا چکا ہے کہ مکتی باہنی دراصل بھارت کی تجربہ کار کمانڈو فورس تھی۔

وہ مکتی باہنی جسے ہم نے مظلوم کہا ہے وہ مشرقی پاکستان کے نوجوان بنگالیوں کی جماعت تھی لیکن انڈین آرمی نے یا یوں کہیں کہ انڈین آرمی کی کمانڈو فورس نے اسے زبردستی اپنے ماتحت رکھ لیا تھا اور اسے انتہائی خطرناک جگہوں پر استعمال کیا تھا۔ اس مکتی باہنی کے اپنے کمانڈر اسے اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہتے تھے کہ دونوں طرف خونریزی اور قتلِ عام ہو اور اس کا فائدہ بہت تھوڑا ہو لیکن انڈین آرمی کی کمانڈو فورس کے افسر جو بنگالی عوام کے بہروپ میں مشرقی پاکستان میں موجود تھے وہ اس مکتی باہنی کو بلاوجہ قتلِ عام پر یا خود قتل ہونے پر اُکساتے تھے۔ اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایسٹ پاکستان کا ایک بنگالی لقمان حکیم مکتی باہنی کے ایک گروہ کا کمانڈر تھا۔ اس کے گروہ میں پچیس آدمی تھے۔ انڈین آرمی کے افسروں نے انہیں جان سے مار دینے کی دھمکی دے کر ہلی کے محاذ پر یہ حکم دے کر آگے بھیج دیا کہ پاکستان آرمی پر حملہ کر دو۔ لقمان حکیم اپنے پچیس نوجوانوں کو لے کر آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی انڈین آرمی نے پاکستان آرمی کی پوزیشن پر فائر کھول دیا۔ پاکستان آرمی نے اس کے جواب میں فائر کھولا۔ لقمان حکیم اپنے پچیس جوانوں کے ساتھ دونوں طرف کے فائر میں پھنس گیا۔ آخر صرف پانچ بنگالی زندہ واپس آئے۔ ان میں لقمان حکیم بھی تھا۔ انڈین آرمی کے افسروں نے انھیں زندہ رہنے کی باقاعدہ سزا دی۔

بنگلہ دیش کے چند اور وقائع نگاروں نے بھی ایسے واقعات لکھے ہیں لیکن وہ بھارت کے خلاف کچھ کرنا تو دور کی بات ہے وہ بھارت سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ (ان بنگلہ دیشی وقائع نگاروں کے الفاظ میں) بھارت نے انھیں بیس (راڈہ) دے رکھا تھا، جنگی مدد دے رہا تھا مگر بھارت ایک وسیع جنگی حکمت عملی پر کام کر رہا تھا۔ وہ ایشیا کی لیڈر شپ حاصل کرنے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اسی لیڈر شپ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

بنگلہ دیشی محقق اور مفکر اور وقائع نگار پروفیسر مطیع الرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ جب بھارت نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تو ہر حملے میں اس نے مکتی باہنی کو آگے رکھا۔ بہت سے محاذوں پر پاکستان آرمی کے جن مورچوں پر بھی انڈین آرمی نے حملہ کیا وہاں مکتی باہنی کے نوجوانوں کو اپنے آگے آگے چلایا۔ اس طرح دونوں صورتوں میں جانی نقصان مکتی باہنی کا ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈین آرمی کا حملہ اگر ناکام ہو جاتا تو بھارتی جوان بنگالی نوجوانوں کو وہیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ آتے اور اگر حملہ کامیاب ہوتا تو بھی بنگالی نوجوانوں کا جو مکتی باہنی کہلاتے تھے بہت جانی نقصان ہوتا۔ انڈین آرمی جہاں کامیاب رہتی وہاں کے متعلق آل انڈیا ریڈیو اور بھارتی اخبارات یہ پروپیگنڈہ کرتے کہ بھارت کے جوانوں نے فلاں جگہ فتح حاصل کی ہے۔ حملے کی ناکامی کی ساری ذمہ داری مکتی باہنی پر عائد کر دی جاتی۔

یہ انکشاف تو بہت بعد میں مرارجی ڈیسائی نے کیا تھا کہ مکتی باہنی دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو فورس تھی لیکن بنگلہ دیشی وقائع نگاروں اور لیڈروں کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اس وقت پتہ نہیں چلا تھا کہ ان کے درمیان ایک کمانڈو فورس ہے جو اس مکتی باہنی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہی ہے جو مشرقی پاکستان کے لیڈروں نے بنائی تھی اور جس میں مشرقی پاکستان کے نوجوان شامل تھے۔ اس مکتی باہنی کا کمانڈر انچیف کرنل عثمانی کو بنایا گیا تھا۔ بھارت کے ریٹائرڈ جنرل چوہدری نے جو ۱۹۶۵ء میں انڈین آرمی کا کمانڈر انچیف تھا، اپنے ایک مضمون میں جو ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء کے "ہندوستان سٹینڈرڈ" کلکتہ میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا کہ مکتی باہنی انڈین آرمی کے زیر کمان تھی اور اسے گائیڈ اور گارڈز کی حیثیت سے پیش قدمی کرتے ہوئے ٹروپس کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ اس مضمون میں جنرل چوہدری نے اس اصل مکتی باہنی کو چوکیدار لکھا ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر مطیع الرحمٰن کی مرتبہ کتاب کے مصنف نے لکھا ہے:

"جو لوگ ۱۰۰۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کی برصغیر کی تاریخ سے ذرا سی بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ اعتراف کریں گے کہ مکتی باہنی اور مشرقی پاکستان کے دیگر تمام لوگ اگر اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں اور حق تلفی کی وجہ سے پاکستان آرمی کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوتے تو انڈین آرمی پاکستان آرمی کو شکست تو بہت دور کی بات ہے معمولی سا نقصان بھی نہ پہنچا سکتی۔ بھارتی فوج کی افراط پاکستان آرمی کی ان تھوڑی سی یونٹوں کا جو مشرقی پاکستان میں تھیں کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی۔ اگر وہاں کے عوام پاکستان سے مطمئن ہوتے یا یہ جنگ فرغنا اور کشمیر کے لیے ہوتی تو انڈین آرمی کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔۔۔۔ آزاد

بنگلہ دیش ریڈیو انڈین آرمی اور مکتی باہنی کو اتحادی فوج
ALLIED FORCES کہا کرتا تھا لیکن آل انڈیا ریڈیو اور
بھارت کے اخباروں نے یہ اصطلاح ہمیشہ نظر انداز کی اس
کی بجائے وہ بھارت کے بہادر جوان کہتے رہے .... ہم
اسے جنگِ آزادی کہتے تھے لیکن بھارت کے ریٹائرڈ جنرل
چوہدری نے اپنے مضمون میں اسے چوتھی پاک بھارت
جنگ کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارتی حکومت اسے پاک
بھارت جنگ کہتی تھی"۔

شیخ مجیب الرحمٰن اور بھارت نے یہ واویلا برپا کیا تھا کہ پاکستان آرمی نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات شروع ہونے والے ملٹری ایکشن میں تیس لاکھ بنگالی شہریوں اور فوجیوں کو ہلاک کیا ہے۔ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے مختلف حوالوں سے ہلاک ہونے والوں کی اس تعداد کو "ایک شاندار جھوٹ کی کلاسیکل مثال" کہا ہے۔ لندن کے مشہور اخبار "دی گارڈین" نے اپنے ۶ جون ۱۹۷۲ء کے پرچے میں لکھا تھا کہ جنگ کے بعد جب سرکاری طور پر تفتیش اور تحقیقات ہوئی تو بنگلہ دیش گورنمنٹ کے سرکاری اعداد و شمار یہ تھے کہ پاکستان آرمی کے ہاتھوں مارے جانے والے شہریوں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔

ہم مشرقی پاکستان پر بھارت کے حملے کا ذکر کر رہے تھے۔ اس حملے اور مشرقی پاکستان میں دو ہفتوں کی پاک بھارت جنگ کی تفصیلات سنانے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کی ذہنیت اور اس کے عزائم کو واضح کیا جائے۔ بھارت کی برہمن قیادت کے عزائم ڈھکے چھپے نہیں لیکن جب بھارت کی ذہنیت کی بات کسی بنگلہ دیشی مفکر اور مبصر کی زبان سے نکلتی ہے تو یہ معاملہ اور زیادہ سنگین نظر آتا ہے۔ ہم بنگلہ دیشیوں کو لعن طعن کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی قوم سے مدد لی جو پاکستان کی ہی نہیں بلکہ اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ بنگلہ دیشی اپنے دین کے دشمن سے مدد اور پناہ مانگنے پر مجبور ہی کیوں ہوئے؟

اگر غدار ہی کہنا ہے تو چند ایک بنگالی لیڈروں کو غدار کہا جا سکتا ہے سارے کے سارے عوام کو نہیں۔ اُوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ بنگلہ دیشی اپنا حق اور معاشرتی انصاف اور مساوات چاہتے تھے۔ وہ پاکستانیت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اندرا گاندھی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے فوراً بعد کہا تھا کہ اُس نے دو قومی نظریہ باطل قرار دے دیا ہے اور اُس نے اسلام کا رشتہ بھی توڑ دیا ہے، لیکن یہ آوازیں بنگلہ دیش سے اُٹھیں کہ دو قومی نظریہ اور اسلام کا رشتہ نہیں ٹوٹا اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی چودہ روزہ جنگ میں بھارت اپنا کھیل کھیل رہا تھا اور اُسے مشرقی پاکستان کے عوام اور ان کے حقوق کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ہماری فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھارت نے جس طرح بنگلہ دیش کو لُوٹا وہ ایک بڑی لمبی روئیداد ہے جو غیر ممالک کے اخباروں اور رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ ہم کسی وقت تفصیل سے سنائیں گے۔ بنگلہ دیش کے ایک اور وقائع نگار نعیم حسن جو بنگلہ دیش کے دو جریدوں — "آواز" اور "نشان" — کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور متعدد انگریزی کتابوں کے مصنّف ہیں، مختلف حوالوں اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ انڈین آرمی نے جنگ کے فوراً بعد لُوٹ مار شروع کر دی تھی۔ وہاں سے جس قدر سونا اور دیگر قیمتی مال ہاتھ لگا وہ انڈین آرمی نے اپنا مالِ غنیمت سمجھ کر ہضم کر لیا۔ پاکستان آرمی سے لکھوکھہا روپیہ انڈین آرمی نے اپنے پیٹ میں ڈال لیا۔ پاکستان آرمی کے تمام ہتھیار جن میں ٹینک بھی تھے اور توپیں بھی بھارت کو چلی گئیں۔ ڈاک بنگلوں سے اور افسروں کے بنگلوں سے قیمتی قالین انڈین آرمی اُٹھا لے گئی۔ بعض بنگلہ دیشیوں نے احتجاج بھی کیا لیکن انہیں یہ جواب ملا کہ ہم نے تمہاری جو مدد کی ہے اس کے صلے میں یہ مالِ غنیمت ہمارا حق ہے۔

ہم کہہ رہے تھے کہ بنگلہ دیشی مسلمان اپنے دین کے دشمن سے مدد مانگنے پر کیوں مجبور ہوئے۔ اس سوال کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ انہیں ہماری فوجی اور سیاسی قیادت نے مجبور کیا تھا۔ بنگالی مسلمان ایسے پکّے پاکستانی تھے

کہ انگریزوں کے دور کے آخری دنوں میں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ برِ صغیر کے مسلمان احتجاج کرتے تھے۔ جلسے کرتے اور جلوس نکالتے تھے لیکن بنگالی مسلمان عملاً مسلمانوں کے خون کا انتقام لیتے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ بنگالی مسلمانوں نے کس طرح ہندوستان کے کسی بھی صوبے میں ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے والے مسلمانوں کے خون کا بدلہ بنگال کے ہندوؤں کو قتل کر کے لیا۔

اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سیّد احمد شہید کی تحریکِ مجاہدین میں بنگالی مسلمانوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ سیّد احمد شہید نے آج کے صوبہ سرحد میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑائیاں لڑی تھیں۔ بنگال سے صوبہ سرحد کا فاصلہ ملاحظہ کیجیے۔ بنگالی مسلمان وہاں تک پیدل پہنچتے اور جہادِ آزادی میں شریک ہوتے تھے۔ ایک انگریز مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر جو اُس وقت ہندوستان میں سول سروس کا اعلیٰ حاکم تھا، اپنی کتاب OUR INDIAN MUSALMANS میں لکھتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے لیے یہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا تھا کہ بنگالی مسلمان صوبہ سرحد کے باغی کیمپ میں چلے جاتے اور تاجِ برطانیہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہوتے تھے۔ سیّد احمد شہید کی تحریکِ مجاہدین کو انگریز باغی کیمپ کہتے تھے۔

غور فرمائیے کہ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن نے کتنی حقیقی اور کتنی قیمتی بات کہی ہے کہ ایسٹ پاکستان کے مسلمان حق تلفی اور بے انصافی اور دیگر دھاندلیوں کی وجہ سے پاکستان کی سیاسی اور فوجی قیادت کے خلاف اُٹھ کھڑے نہ ہوتے تو انڈین آرمی اس سے بھی زیادہ نفری اور طاقت سے حملہ کرتی تو پاکستان آرمی کو کسی ایک پوزیشن میں بھی شکست نہیں دے سکتی تھی۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ اگر یہ جنگ فرخا اور کشمیر کے لیے ہوتی تو انڈین آرمی کے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بنگالی مسلمان کے دل میں کشمیر زندہ ہے اور وہ کشمیر کے لیے لڑنا بھی چاہتا ہے حالانکہ فرخا بیراج بنگالیوں کا ایک مسئلہ ہے لیکن اس کے ساتھ وہ کشمیر کا نام بھی لیتے ہیں۔

بنگلہ دیش کے عوام نے جس طرح پاکستانیت کو یا پاکستان کی محبت کو دلوں میں زندہ رکھا اس کے مظاہرے جون ۱۹۷۴ء میں اُس وقت دیکھنے میں آئے جب ذوالفقار علی بھٹو بنگلہ دیش کے سرکاری دورے پر گئے تھے۔ بھٹو ۲۷ جون کے روز ڈھاکہ پہنچے۔ وہاں شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت تھی۔ اُس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ اُس کے عوام کے دلوں میں پاکستان کی محبت موجود ہے۔ اس محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے اُس نے حکم دے کر بھٹو کے دورے سے ایک دو روز پہلے ٹیلیویژن سے لوگوں کو ایسی فلمیں دکھائیں جن میں پاکستان آرمی کے عوام پر ظلم و تشدد کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو گھروں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپتا اور بھارت کی طرف بھاگتا دکھایا گیا تھا۔ یہ فلمیں اس سے پہلے بھارت کئی بار اپنے ٹی وی سے دکھا چکا تھا۔ یہ پروپیگنڈہ فلمیں تھیں جو بھارت نے دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد تیار کی تھیں۔ ان میں حقیقت کم اور افسانوی خلیقیت زیادہ تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو کے دورے سے پہلے یہ فلمیں اپنے عوام کو دکھائیں۔ ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی فلم بھی دکھائی۔ اخباروں میں پاکستان کے خلاف لکھوایا۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں کے لیے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ قارئین جانتے ہیں کہ دفعہ ۱۴۴ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چار سے زیادہ آدمی کہیں بھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

اس تمام پروپیگنڈے اور امتناعی اہتمام کے باوجود بھٹو کے استقبال کے لیے بنگلہ دیش کے عوام صحیح معنوں میں سیلاب کی طرح اُمڈ آئے اور یہ سیلاب ایئرپورٹ پر جا رُکا۔ اس بے قرار اور بے کراں ہجوم نے سکیورٹی کے تمام انتظامات تہ و بالا کر ڈالے۔ ان مناظر کی کچھ جھلکیاں غیر ملکی اخباروں کے اُن نامہ نگاروں کی زبانی پیش کی جاتی ہیں جو وہاں موجود تھے۔ لندن کے دو مشہور اخباروں ــــــ "دی گارڈین" اور "دی ٹائمز" ــــــ نے ۲۸ جون ۱۹۷۴ء کی صبح جو رپورٹ شائع کی تھی وہ ایک ہی جیسی تھی کیونکہ یہ ایک ہی نامہ نگار والٹر شیوارز کی لکھی ہوئی تھی۔ یہ نامہ نگار ڈھاکہ ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

"بھٹو کے کاروں کے جلوس کو اُن لڑکوں اور نوجوانوں کے انتہائی گنجان ہجوم میں سے گزرنا محال ہو گیا جو جذبات اور ہیجان سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اُچھل اُچھل کر چلّا رہے تھے۔ "پاکستان زندہ باد"... "بھٹو زندہ باد" ـــــ اور وقفے وقفے سے یہ نعرہ بھی سنائی دیتا تھا ـــــ "بھٹو واپس آجاؤ" ـــــ جب کاروں کا یہ جلوس ڈھاکہ کے وسط میں پہنچا تو عوام کا ہجوم اور زیادہ بڑھ گیا۔ لوگوں نے پاکستانیوں کی کاروں کے دروازے زبردستی کھول لیے اور ان سے ہاتھ ملائے شہر میں لوگ اپنے کام کاج، دکانیں اور دفتر چھوڑ کر باہر نکل آئے اور پاکستانیوں کے استقبال میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔"

لندن کے ایک اور مشہور اخبار ـــــ "دی ڈیلی ٹیلی گراف" ـــــ نے ۲۸ جون ۱۹۷۴ء کی صبح اپنے نمائندے وارڈ کی جو رپورٹ شائع کی اُس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"... چند لمحوں کے لیے دَورے پر آئے ہوئے پاکستانیوں کی کاروں کا جلوس تقریباً رُک گیا۔ پولیس مہمانوں کے لیے راستہ صاف کرنے کے لیے ہجوم پر ٹوٹ پڑی لیکن بھٹو کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے میزبان (شیخ مجیب الرحمٰن) کا چہرہ مضحکہ خیز انداز سے لٹکا ہوا تھا۔"

پیرس کے ایک اخبار ـــــ LE MONDE ـــــ نے ۱۱ جولائی ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں اپنے رپورٹر کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل سے شائع کیا۔ اس کا ایک اقتباس پیش ہے:

"ایک بنگلہ دیشی نے جس کا بھائی مارچ ۱۹۷۱ء میں ملٹری ایکشن میں مارا گیا تھا، مجھے بتایا کہ پاکستان کے وزیرِ اعظم اور اُس کے ساتھ آئے ہوئے پاکستانیوں کو دیکھ کر بنگلہ دیشیوں پر ایسا موڈ طاری ہو گیا تھا کہ اگر بھٹو وہاں الیکشن میں کھڑا ہو جاتا تو غالب اکثریت سے جیت جاتا۔"

لندن سے شائع ہونے والے ایک جریدے JANAMAT نے اپنے شمارہ نمبر ۲۴ میں عوامی لیگ کے ایک ایسے رُکن کا بیان شائع کیا ہے جو ڈھاکہ ایئرپورٹ پر بھٹو کی آمد پر اس لیے موجود تھا کہ وہ واپس انگلینڈ جا رہا تھا۔ لندن پہنچ کر اُس نے اس جریدے کے ایک نمائندے کو بتایا کہ اُسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہُوا کہ بنگلہ دیش کے لوگ پاکستان کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ سب "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ کسی ایک بھی آدمی نے "جے بنگلہ" کا نعرہ نہ لگایا۔

نعیم حسن اور مطیع الرحمٰن اپنی کتاب IRON BARS OF FREEDOM (آزادی کی آہنی سلاخیں) ـــــ میں لکھتے ہیں کہ پاکستانیوں کا یہ پُرجوش استقبال مجیب کے لیے خوفناک تجربہ تھا۔ اُس نے پہلے کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں کیا تھا کہ اُس کے عوام نے اُسے دھتکار دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا اور وہ مجبور ہو گیا کہ اپنے اردگرد "ایمرجنسی پاور" کی دیواریں کھڑی کرے۔ اس کا ایک ثبوت لندن کے اخبار "دی ڈیلی ٹیلیگراف" کے ۸ جولائی ۱۹۷۴ء کے پرچے میں ملتا ہے۔ اس اخبار نے لکھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی کابینہ کے نو وزیروں نے استعفے دے دیئے اور اُس کے باقی وزیروں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ساتھ مسلح محافظ رکھا کریں گے۔ پارلیمنٹ میں یہ صورتِ حال پاکستانی وزیرِ اعظم کے دورے کے ایک ہی ہفتہ کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔

اس کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا ڈکٹیٹر بننا شروع کر دیا اور ایسا ظالم اور احمق ڈکٹیٹر بنا جس کی مثال تاریخ میں صرف ایک ملتی ہے۔ یہ تھا رومن ایمپائر کا بادشاہ نیرو۔ مجیب کی انسان دشمنی، درندگی اور فرعونیت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ اُس نے ڈھاکہ سے اُن تمام لوگوں کو جو دیہات سے بھوک کے مارے اکٹھے ہو گئے تھے باہر نکال دیا۔ یہ لوگ روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ دو تین ہفتوں میں صرف ایک مقام ڈیمرا میں چار سو افراد فاقہ کشی سے

ہلاک ہو گئے۔ فاقہ کشی سے اموات کی یہ تعداد صرف ایک جگہ کی ہے۔ اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پورے بنگلہ دیش میں کتنے لوگ بھوک سے مر رہے ہوں گے۔

فلاح و بہبود کا کام کرنے والے ایک ولندیزی ادارے ”ڈچ سیلوشن آرمی“ کے ایک رضاکار نے فاقہ کشی سے مرنے والے بنگلہ دیشیوں کی تعداد دیکھ کر کہا تھا — ”یہ خدا کا کام نہیں۔ یہ اس (بنگلہ دیش کی) حکومت کا کام ہے یہ ایک انسان کی پیدا کردہ تباہی ہے“۔ (ٹائمز آف انڈیا ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء ”دی گارڈین“ لندن ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء)

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد بھارت نے مجیب الرحمٰن کی مکتی باہنی نے، انڈین آرمی نے سرکاری احکام سے اور افسروں اور سپاہیوں نے ذاتی طور پر بھی پھر مجیب کی راکھی باہنی نے جس طرح بنگلہ دیش کو لوٹا، اس کی مثال سو فیصد اُس مردار جیسی ہے جس پر گدھوں کا غول ٹوٹ پڑا ہو اور مردار ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہو۔

یہ ایک الگ داستان ہے کہ بنگلہ دیش کی تباہی کس طرح اس کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ ہمارا موضوع یہ ہے کہ بنگلہ دیش معرضِ وجود میں آیا ہی کیوں؟ یہ بدنصیب لوگ تو پاکستانی تھے۔ ایسے حالات کس نے پیدا کیے کہ پاکستانی اپنی اصلیت اور اپنی پہچان سے دستبردار ہو گئے؟

ہم نے بھارت کے پاکستان دشمن اور اسلام دشمن عزائم کی یہ جھلکیاں یہ دکھانے کے لیے پیش کی ہیں کہ ہمارے بنگلہ دیشی بھائی اپنی اصلیت، اپنی جڑوں اور اپنی پہچان سے دستبردار نہیں ہوتے۔ انہوں نے بھٹو کے استقبال میں یہ جو نعرہ لگایا تھا ”بھٹو واپس آجاؤ“ اس کا مطلب ذوالفقار علی بھٹو نہیں بلکہ پاکستان تھا۔ بھٹو کو پاکستانیت کی علامت سمجھ کر انہوں نے یہ نعرہ لگایا تھا۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں ایک بار پھر پاکستان کی گود میں ڈال دو۔ بھٹو تو اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے انہیں پاکستان کی گود سے نوچ کر اندرا گاندھی اور اُس کی فوج کے آگے پھینک دیا تھا۔ اقوامِ متحدہ میں تصفیے کی ایک قرارداد کو پھاڑ کر اجلاس سے واک آؤٹ کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا تھا کہ بھٹو صاحب کے لیے کوئی بھی تصفیہ قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ اپنا فیصلہ دے چکے تھے — ”اُدھر تم اِدھر ہم“ — اور اب مرحوم کی محترمہ بیٹی نے بنگلہ دیشیوں کے دھتکارے ہوئے ”بنگلہ بندھو“ مجیب کو جنگِ آزادی کا ہیرو قرار دے کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ایسا ہی خراجِ تحسین اندرا گاندھی کو بھی پیش کیا ہے۔

یہ خراجِ تحسین ایسا ہی ہے جیسا جونیجو صاحب نے وزارتِ عظمیٰ کے دَور میں امریکہ کے دورے میں اپنی ایک تقریر میں امریکہ کو پیش کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ میں جو رول ادا کر رہا ہے وہ اتنی زیادہ تعریف کے قابل ہے کہ جونیجو صاحب کو اس کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

کون نہیں جانتا کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ عالمِ اسلام کی اور اسلامی اتحاد کی بیخ کنی کر رہا ہے۔ اسرائیل امریکہ کی تخلیق ہے اور اسے اُس نے مشرقِ وسطیٰ کا غنڈہ بنا رکھا ہے۔ لبنان کی خانہ جنگی اور فلسطینیوں کے قتلِ عام میں امریکہ کا ہاتھ ہے۔

اس سوال کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا کہ شیخ مجیب الرحمٰن مکمل آزادی چاہتا تھا یا پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ پر ہی راضی ہو جاتا۔ کچھ شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مجیب کے پیشِ نظر بنگلہ دیش نہیں تھا۔ البتہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ ”کچھ دو کچھ لو“ کے اصولوں پر سودا بازی کرنا چاہتا تھا۔ ہم اس کی کچھ باتیں پیش کرتے ہیں۔ ان سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن میں کیا تھا۔

مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو شروع ہُوا تھا یہ ایکشن جنرل ٹکا خان نے شروع کرایا تھا۔ اس ایکشن کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن دوسرے علیحدگی پسند لیڈر پُراسرار طور پر رُوپوش ہو گئے تھے۔

کرنل ڈاکٹر جمشید ترین اُس وقت سی ایم ایچ کومیلا کے سی۔ او تھے۔

ملٹری ایکشن کے بعد اپریل ۱۹۷۱ء میں اُن کے پاس ایک کمانڈو میجر بلال علاج کے لیے آیا۔ اس میجر نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا تھا۔ اس نے کرنل صاحب کو مجیب کی گرفتاری کی رُوداد ان لفظوں میں سنائی:

ہم مجیب الرحمٰن کے دھان منڈی والے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سارے گھر پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ مجیب کا یہ گھر دو منزلہ تھا۔ ہم اُوپر کی منزل پر گئے تو وہاں بھی کسی ذی روح کے آثار نہیں تھے۔ اچانک ایسے لگا جیسے ایک کمرے سے کوئی فائر ہُوئی ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اندر کوئی ہے۔ میَں نے ایک طرف ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھُلا تو مجیب الرحمٰن باہر نکلا۔ وہ کانپ رہا تھا اور اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

"سر!" — کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مجیب کہنے لگا — "میں نے وہی کچھ کیا ہے جو مجھے جنرل صاحب نے بتایا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پھر اُس نے یہی بات کہی تو میرے ایک جے سی او نے اُسے گھونسہ مارا۔ میَں نے اپنے اس ساتھی کو روک دیا۔

"مجھے سر نہ کہیں" — میَں نے مجیب سے کہا — "میَں تو صرف میجر ہوں اور آپ کو لینے آیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔"

وہ ہمارے ساتھ چل پڑا اور ہمارے ساتھ اُتر کر جیپ تک آیا۔ اتنے میں اس کے بیوی بچے بھی آ گئے اور مجھے کہنے لگے کہ میں مجیب کو تھوڑی دیر کے لیے اندر بھیج دوں۔ میَں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن اسی وقت میرا سی او آگیا اور اُس نے کہا کہ مجیب کو اندر بھیج دو تاکہ یہ گھر سے اپنے کپڑے اور بستر وغیرہ لے آئے۔

ہم مجیب کو ایوب نگر لے گئے جہاں قومی اسمبلی کی عمارت بن رہی تھی۔ اتنی دیر میں وہ سنبھل چکا تھا اور اس کی کپکپی بھی ختم ہو گئی تھی۔

"میجر!" — اپنے حواس بحال ہوتے ہی مجیب نے مجھے مخاطب کیا — "تمہیں معلوم ہے کہ جب پاکستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو مجھے اس میں پاکستان کے ابراہام لنکن کے طور پر یاد کیا جائے گا۔"

میَں نے حیران ہو کر کہا کہ شیخ صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اُس نے کہا، اچھا یہ بتاؤ کہ میَں کون ہوں؟ میَں نے کہا آپ مجیب الرحمٰن ہیں۔ اُس نے کہا کہ تم نے تاج الدین کو گرفتار کر لیا ہے؟ میَں نے کہا کہ نہیں۔ اُس نے پوچھا کہ عبدالرب، عطاء الرحمٰن بھی گرفتار ہو گئے ہیں؟ میَں نے کہا کہ نہیں۔

"مجھے تمہاری اپنی آرمی کے لوگوں نے بتایا تھا کہ ایکشن ہونے والا ہے"۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا — "جنہوں نے مجھ سے سُنا تھا کہ آج رات ایکشن ہو گا وہ بھاگ گئے ہیں اور آپ مجھے پکڑ لائے ہیں۔ اگر میں مجرم ہوتا تو میں بھی رُوپوش ہو جاتا۔ ایک عام مجرم بھی ایسی جگہ غائب ہوتا ہے جہاں پولیس کو بھی توقع نہیں ہوتی۔ میَں تو اپنے گھر میں اپنے بال بچوں کے ساتھ تھا۔ میں بھی باقی لوگوں کی طرح بھاگ سکتا تھا، لیکن میَں آپ لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں وہ بنگلہ دیش نہیں مانگتا جو تاج الدین مانگتا ہے۔ میں تو اپنے بنگالی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نیم خودمختار بنگلہ دیش مانگتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ میرا پہلے سے ریکارڈ شدہ انٹرویو ریڈیو ٹی وی پر چلائیں تاکہ میَں لوگوں کو بتاؤں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سندھی کہتے ہیں لیکن ہم اپنے آپ کو بنگالی کہتے ہیں تو آپ ہمیں کیوں روکتے ہیں؟"

جب میَں نے جنرل ٹکا خان کو بتایا کہ مجیب الرحمٰن نے ریڈیو ٹی وی پر انٹرویو نشر کرانے کی درخواست کی ہے تاکہ بنگالیوں کو اصل بات کا پتہ چلے تو جنرل صاحب نے بڑی رعونت سے کہا — "لعنت بھیجو HE IS BLOODY TRAITOR (وہ غدار ہے)"۔

میجر بلال بعد میں شہید ہو گیا تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کا ایسے وقت ڈھاکہ میں اپنے گھر میں ہی رہنا جب ملٹری ایکشن شروع ہو چکا تھا اور علیحدگی پسند بنگالی لیڈر بھارت کو بھاگ گئے تھے، ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس انتظار میں تھا کہ مغربی پاکستان کے حکمران آئیں گے اور مذاکرات کریں گے۔ وہ بھی بھارت کو فرار ہو سکتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ اُس نے کہا

تھا ـــ "میں پاکستان کا وزیرِ اعظم ہوں" ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے مغربی پاکستان کی سیاست نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ غدار بنے پھر اُس کی غداری کو سیاسی شیطانوں کے ذریعے تقویت دی گئی۔

اب ہم میدانِ جنگ کی طرف لوٹتے ہیں۔

اگر آپ نے اس سلسلے کا پچھلا مضمون غور سے پڑھا ہے اور اگر آپ میں فنِ حرب و ضرب کی ذرا سی بھی سوجھ بوجھ ہے تو آپ پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ہم نے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر کے اپنی ایسٹرن کمانڈ کو شکست کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ صحیح تر الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ ہمارے حکمرانوں نے مشرقی پاکستان کی کربلا میں لڑنے والے جرنیلوں اور دیگر افسروں اور جوانوں کو اس کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا کہ دیکھتے ہیں وہ کتنے دن اور لڑتے اور کب ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اس حملے کا حکم دینے والے مشرقی پاکستان کے مستقبل اور وہاں کے ٹروپس کی قسمت کے متعلق کتنے کچھ سنجیدہ تھے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

بھارت نے ۲۰/۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کی رات مشرقی پاکستان پر ہر طرف سے باقاعدہ حملہ کر دیا تو ۲۱ نومبر کی رات راولپنڈی میں وائس چیف آف سٹاف کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اُنہوں نے چیف آف سٹاف سے کہا کہ کل صبح پریذیڈنٹ (یحییٰ خان) سے احکام لینے کے لیے آ جائیں۔ اس صبح (۲۲ نومبر) یحییٰ خان سیالکوٹ سیکٹر میں مورچوں میں بیٹھے ہوئے ڈویژنوں کو دیکھنے جا رہا تھا۔ چیف آف جنرل سٹاف نے اُسے کہا کہ مشرقی پاکستان پر حملہ ہو گیا ہے اس لیے اس صورتِ حال پر غور کرنے اور احکام جاری کرنے کے لیے وہ سیالکوٹ سیکٹر کا دَورہ ملتوی کر دے۔ یحییٰ خان نے دَورہ ملتوی نہیں کیا۔ وہ اتنی سنگین صورتِ حال کو محض نظرانداز کر کے چلا گیا۔ وہ اگلے دن (۲۳ نومبر) پچھلے پہر واپس آیا۔ چیف آف جنرل سٹاف اور ایئر فورس کا کمانڈر انچیف ایئرپورٹ پر اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اُسے وہیں سے آپریشن روم میں لے جا کر مشرقی پاکستان کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر کے احکام لینا چاہتے تھے۔ چیف آف سٹاف نے کہا کہ اس وقت پریذیڈنٹ تھکے ہوئے ہیں، ذرا سوئیں گے۔ لہٰذا یہ کانفرنس شام کے بعد ہوگی۔ پریذیڈنٹ صاحب اُس وقت "ذرا سونے" کے لیے تشریف لے گئے جس وقت مشرقی پاکستان میں ہمارے آٹھ نو مہینے کی مسلسل لڑائی کے تھکے ہوئے، نڈھال اور بے مایہ افسر اور جوان ٹینکوں اور توپوں کے بغیر دشمن کے ٹینکوں اور توپ خانوں کا مقابلہ کر رہے تھے، کٹ رہے تھے اور دنیا دم بخود تھی کہ یہ مٹھی بھر بے مایہ سپاہی اس سرزمین کو جس کا پتھر پتھر بتا پتا ان کا دشمن ہے، دشمن کی تین کوروں سے کب تک بچاتے رکھیں گے۔

یحییٰ خان نے شام کو ایک کانفرنس کا مژدہ سنایا۔ شام کو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والے جو زندہ ہیں، پاکستان میں موجود ہیں۔ اُن سے تصدیق کرا لیجیے۔ عینی شاہد کہتے ہیں کہ یحییٰ خان جو ملک کا صدر اور مسلح افواج کا سپریم کمانڈر تھا، ہشاش بشاش تھا۔ اُس کے چہرے پر اور انداز میں کوئی سنجیدگی نہیں تھی۔ کانفرنس کے شرکاء میں سے جن کی نظر حقائق پر تھی انہیں توقع تھی کہ یہ کانفرنس ہنگامہ خیز اور فیصلہ کُن ہوگی۔ مگر صدرِ مملکت نے اس کانفرنس کو تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ کہہ کر برخاست کر دیا ـــ "میں بھلا مشرقی پاکستان کے لیے کیا کر سکتا ہوں! میں صرف دُعا کر سکتا ہوں"۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یحییٰ خان نے دُعا بھی کی تھی یا نہیں، البتہ غیر ملکی اخباروں میں یہ ریکارڈ محفوظ ہے کہ قصرِ صدارت مشرقی پاکستان کے متعلق بے پرواہ اور بے غم تھا۔ بعض غیر ملکی وقائع نگاروں نے جن میں کچھ مشرقی پاکستان میں تھے اور کچھ راولپنڈی میں، لکھا تھا کہ اسلام آباد والوں کے اس سرد رویے سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں مشرقی پاکستان کے متعلق مکمل طور پر اطمینان ہے کہ ہاتھ سے نہیں جائے گا، انہیں یا تو علم ہی نہیں تھا کہ اُن کے مشرقی کمان کے تین ڈویژن لڑنے کے قابل نہیں رہے اور انہیں کمک، بدلی اور بے تحاشہ جنگی ساز و سامان کی ضرورت ہے یا انہیں یہ خوش فہمی تھی کہ یہی تین ڈویژن اسی حالت میں مشرقی پاکستان کا کامیاب دفاع کریں گے۔ یا وہ دل ہی دل میں مشرقی پاکستان سے [illegible] بیٹھے تھے اور کسی کو بتانا نہیں چاہتے تھے اور یہ کہ اپنی فوج کا [illegible]

وہاں کشت و خون کرانا خفت مٹانے کے مترادف تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان تین ڈویژنوں کو وہاں کے حالات اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

یحییٰ خان اور اُس کے مشیر اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ چونکہ اپنے ملک کے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر حکومت کا قبضہ ہے اس لیے وہ اپنی کوتاہیوں اور مجرمانہ پالیسیوں کو قوم اور اقوامِ عالم سے چھپائے رکھیں گے۔ بے شک انہوں نے ابلاغ کے ان ذرائع کو اپنے ڈھنگ سے استعمال کر کے ملّتِ پاکستان کی آنکھوں میں کامیابی سے دھول جھونک دی تھی مگر اقوامِ عالم سے وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکے۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ دُنیا بھر کے اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندے اور کیمرے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اور بھارت میں جمع ہو گئے تھے۔ انہیں پاکستان کے اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی کے سرکاری خبرناموں اور ہمارے حکمرانوں کی پریس کانفرنسوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے اخباروں اور نشریاتی اداروں کو صرف وہ خبریں دیں جو انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھ کر ریکارڈ کیں۔

مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن کے آغاز میں وہاں کے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر نے انتہائی بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا کہ غیر ملکی پریس رپورٹروں کی بے عزّتی کی۔ اُن کے کیمروں سے فلمیں نکال کر پھینک دی گئیں اور انہیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس ڈکٹیٹر شپ کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ عالمی پریس کو اپنے خلاف کر لیا گیا۔ اس کا دوسرا اثر اقوامِ عالم پر جو ہُوا وہ یہ کہ ساری دُنیا پاکستان کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگی اور یہ تاثر عام ہو گیا کہ پاکستان کی فوج مشرقی پاکستان میں کسی سنگین جُرم کا ارتکاب کر رہی ہے۔

مشرقی پاکستان کا مسئلہ ہمارے حکمرانوں کی کوششوں کے باوجود عالمی برادری سے چھپایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ یہ اب عالمی برادری کا مسئلہ بن گیا تھا۔ بھارت سفارتی میدان میں پاکستان کو بہت بُری شکست دے چکا تھا اور اب میدانِ جنگ میں پاکستان کو شکست دینے کی تیاریاں
شکست دے چکا تھا اور اب میدانِ جنگ میں پاکستان کو شکست دینے کی تیاریاں

مکمل کر چکا تھا۔ روس کھُلم کھلا بھارت کو بے دریغ جنگی مدد دے کر برِّ صغیر میں جنگ شروع کرا چکا تھا۔ چین کے متعلق ہر کسی کو توقع تھی کہ پاکستان کو جنگی مدد دے گا۔ امریکہ نے اپنے ساتویں بیڑے کو خلیج بنگال میں بھیجنے کی دھمکی دے دی تھی۔ لہٰذا مشرقی پاکستان پر ساری دنیا کی نظریں مرکوز ہو گئی تھیں۔ غیر ملکی رپورٹر ایک بار پھر مشرقی پاکستان میں جا پہنچے اور انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ان کی وساطت سے مشرقی پاکستان کی کہانی ساری دُنیا کے اخباروں میں خبرناموں، مقالوں، تبصروں اور سپیشل رپورٹوں، تصویروں اور ٹیپ ریکارڈوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ اخبار رسالے پاکستان میں بھی آئے۔ بے شک ہمارے اخباروں نے اُن کے وہ اقتباسات شائع نہ کیے جن میں ہمارے حکمران اور ہماری ہائی کمانڈ بے نقاب ہوتی تھی، تاہم انہیں چھپایا نہ جا سکا۔ اس کے علاوہ پاکستانی ساری دنیا میں موجود ہیں۔ انہیں باہر اصل صورتِ حال کا علم ہوتا رہا۔

جنگی امور کے عالمی شہرت یافتہ مبصرین اور ماہرین کو یہ توقع تھی کہ پاکستان کی حکومت چونکہ جرنیلوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی کیفیت کیا ہے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مغربی پاکستان میں جو فوج ہے وہ ایسا شدید حملہ کرنے کے لیے کافی نہیں جس سے وہ بھارت کے اتنے زیادہ علاقے پر قبضہ کر لے جسے وہ مشرقی پاکستان سے بھارتی فوج کی گرفت کمزور کرنے کے لیے استعمال کر سکے۔ ہماری جنگی حکمتِ عملی یہی تھی کہ بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں مشرقی پاکستان میں صرف دفاعی جنگ لڑی جائے گی اور مغربی پاکستان سے اتنا زوردار حملہ کیا جائے گا جس سے بھارت کے خاصے علاقے پر قبضہ کر کے اس کی توجہ مشرقی پاکستان سے ہٹا دی جائے گی اور اس علاقے کو سودا بازی کے لیے استعمال کیا جائے گا مگر اب اس حکمتِ عملی کا وقت گزر چکا تھا۔

بھارت ہماری اس پالیسی سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ لڑ کر ہماری افواج کی خوبیوں اور قوم کے جذبۂ ایثار کو دیکھ چکا تھا۔ اُس نے

ان کے مطابق اپنی افواج میں اضافہ بھی کیا۔ انہیں جدید ہتھیاروں سے لیس کیا اور نئی ٹریننگ دی۔ ہماری قوم کے جذبے کو ختم کرنے کے لیے اُس نے ابلاغ کے تمام تر ذرائع اور اپنے ففتھ کالم کو استعمال کیا۔ پاکستان کا وہ کونسا سرکاری یا غیر سرکاری شعبہ ہے جس میں بھارت کے ففتھ کالمسٹ موجود نہیں تھے (وہ اب بھی موجود ہیں)۔ حد یہ کہ ہماری انٹیلی جنس بھی بھارت کی انٹیلی جنس کے افراد سے پاک نہیں تھی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت کی انٹیلی جنس اتنی زیادہ کامیاب نہیں تھی جتنی ۱۹۷۱ء میں ثابت ہوئی۔ بھارتی ایئر فورس نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہماری کئی ایک اہم ریل گاڑیوں پر کامیاب حملے کیے۔ انہیں اپنے جاسوسوں کی طرف سے گاڑیوں کے اوقات اور سفر کی صحیح اطلاعیں ملتی تھیں۔ بھارت کی توجہ ریل گاڑیوں پر اتنی نہیں تھی جتنی انجنوں پر تھی۔ انڈین ایئر فورس کو حکم ملا تھا کہ پاکستان کو ریلوے انجنوں سے محروم کر دو۔ اسی مقصد کے لیے لاہور ریلوے سٹیشن پر بمباری ہوتی رہی تھی۔ اُن کا ٹارگیٹ لوکو شیڈ تھا۔

بھارت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مغربی پاکستان میں کتنی کچھ جنگی طاقت ہے جس سے پاکستان حملہ کرے گا۔ اس کے مطابق اُس نے مغربی سرحد کے دفاع کا پورا اہتمام کر رکھا تھا اور جوابی حملوں کے لیے بھی اُس نے فوج تیار رکھی ہوئی تھی۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے حملہ کرنے کے لیے دشمن کی نسبت تین گُنا فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ تر نقصان حملہ آوروں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جن پر حملہ کیا جاتا ہے وہ مورچوں اور بنکروں میں ہونے کی وجہ سے اتنے زیادہ نقصان سے بچے رہتے ہیں جو انہیں پسپائی پر مجبور کر دے۔ تین گُنا تو دُور کی بات ہے ہمارے پاس حملہ کرنے کے لیے جو نفری تھی وہ اُس نفری سے بھی کم تھی جو بھارت نے دفاع میں مورچہ بند کر رکھی تھی۔ اتنے بڑے حملے کے لیے (جسے یلغار کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا) ہماری جنگی قوت تین گُنا اور دو گُنا نہ سہی برابر تو ہوتی۔ پھر اس حملے کے لیے خاصی بڑی ایئر فورس کی ضرورت تھی مگر ہماری ایئر فورس اتنی سی تھی جسے حملے کی سپورٹ میں استعمال کرتے تو ہوائی اڈوں، ریلوے سٹیشنوں، ریل گاڑیوں اور دیگر فوجی ٹھکانوں کو دشمن کی ایئر فورس سے بچانے کے لیے کوئی طیارہ نہیں رہتا تھا، اگر ایئر فورس اُدھر بھیج دیں تو فوج فضائی مدد سے محروم ہو جاتی تھی۔ ایئر فورس کا ایک اہم مشن اور بھی تھا، وہ تھا بھارت کے اندر جا کر حملے کرنا۔ آپ نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں دیکھ لیا تھا کہ بھارتی طیارے کس بے خوفی سے آتے اور اطمینان سے حملے کر کے چلے جاتے تھے۔ یہ ہماری ایئر فورس کی کمی اور ناقص پلاننگ کا نتیجہ تھا۔

یہی کیفیت ہماری بحریہ کی تھی۔ بھارت کی نیوی میں دو ہتھیار بڑے ہی خوفناک تھے۔ ایک تھا طیارہ بردار بحری جہاز "وکرانت" جس پر پینتیس لڑاکا بمبار اور بارہ ہیلی کاپٹر تھے اور دوسرا ہتھیار میزائل بردار کشتیاں تھیں جن کی تعداد چار تھی۔ ان کے مقابلے میں ہماری بحریہ کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بھارت کے پاس "وکرانت" جنگِ ستمبر سے پہلے کا تھا۔ ہمارے کسی بھی حکمران نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہمارے پاس بھی ایسا ہی بحری جہاز ہونا چاہیئے۔ بھارت کے تباہ کُن جہازوں، جنگی جہازوں، میزائل کشتیوں، فریگیٹ (وکرانت کو شامل کر کے) کی مجموعی تعداد اکاون تھی۔ ہماری تعداد تیئس تھی جس میں میزائل بردار کشتیاں اور طیارہ بردار جہاز نہیں تھے۔

بھارت کو ہماری اس جنگی قوت سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس قوت کو پہلی ہی جھڑپ میں ٹھنڈا کر دینے کے لیے بھارت کے پاس بہت کچھ تھا۔ اُس نے ہماری جنگی حکمتِ عملی کے اُلٹ پلان بنایا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مغربی سرحد پر دفاع میں لڑیں گے اور مشرقی پاکستان پر زیادہ سے زیادہ طاقتور حملہ کر کے قبضہ کریں گے لیکن بھارت مشرقی پاکستان کے لیے کم سے کم جانی اور مالی قربانی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے پلان ایسا بنایا جس میں زیادہ سے زیادہ قربانی بنگالی مسلمانوں کو دینی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھارت نے جو طریقے اختیار کیے وہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔

آپ نے یہ تفصیلات پڑھ کر ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے حکمران اور سیاسی لیڈر محبِ وطن ہوتے تو عیاشیوں، خرمستیوں اور اقتدار کی رسہ کشی کو ملتوی کر کے مشرقی پاکستان کی بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش کرتے۔ بھارت کے عزائم

کو مفلوج کرنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ وہ بھارت کے پروپیگنڈے کے جواب میں پروپیگنڈے کی مہم شروع کرتے جس طرح بھارت نے اپنے سفارت خانوں کو عالمی رائے اپنے حق میں کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح ہماری حکومت بھی شرابی کبابی سفیروں کو واپس بلا کر ساری دُنیا میں ایسے سفیر بھیجتی جو سفارتی مشن کو قومی مشن سمجھتے اور بھارت کے سفارتی حملے کو کُند کرنے کے اہل ہوتے۔

بھارت مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے میں اور بغاوت کرانے میں صرف اس لیے کامیاب ہُوا کہ ہم نے لاپرواہی، کوتاہی اور غفلت سے اس کی کامیابی کے لیے فضا پیدا کی۔ بھارت نے اس فضا سے نہایت چالاکی سے فائدہ اٹھایا اور ہمیں تباہی کے اُس مرحلے میں لے گیا جہاں ہمارے حکمرانوں نے وہ کارروائیاں کیں جو تباہی کو تیز کر سکتی تھیں، صورتِ حال کو سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ ان میں ایک کارروائی ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کا ملٹری ایکشن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور دوسری تباہ کُن لغزش مغربی پاکستان سے حملہ۔

بھارت نے اپنی قابلیت اور عزم کی پختگی سے اور ہماری حکومت کی نااہلی سے INITIATIVE اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یعنی حالات کی باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں وہ گھوڑے کے پیچھے باندھ کر گھسیٹتا پھر رہا تھا۔ اگر ہمارے حکمرانوں نے جنگ ہی لڑنے کا تہیہ کر رکھا تھا تو جنگی ضروریات پوری کی جاتیں۔ وہ بھی نہ کی گئیں۔ بھارت کے تمام سیاسی لیڈر (جو بھان متی کا کُنبہ تھے) پاکستان کے خلاف ایک محاذ پر جمع ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے سیاسی لیڈر ایک دوسرے کے خلاف اقتدار کے لیے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ بھٹو یحییٰ خان پر زور دے رہے تھے کہ اقتدار منتقل کرو۔ ۲۱/۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا، ضرورت یہ تھی کہ ہمارے لیڈر مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے وہاں کے ٹروپس کو کمک اور دیگر سامان پہنچاتے اور اُس خطے کو بچانے کے لیے دیوانے ہو جاتے، یحییٰ خان نے نہایت اہم کانفرنس کو یہ کہہ کر کہ مَیں صرف دُعا کر سکتا ہوں برخاست کر دیا اور بھٹو سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز یحییٰ خان نے نورالامین

مرحوم کو اپنا وزیرِاعظم اور ذوالفقار علی بھٹو کو ڈپٹی وزیرِاعظم اور وزیرِ خارجہ مقرر کر دیا۔ خود صدرِ مملکت بنا رہا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں حضرات کو اقتدار کا کتنا کچھ حصہ ملا تھا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نورالامین مرحوم اور ذوالفقار علی بھٹو یحییٰ خان کی کابینہ میں (اگر یحییٰ کے دربار میں کابینہ نام کی کوئی چیز تھی) شامل ہو گئے تھے۔ کابینہ میں ان دو لیڈروں کی شمولیت سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ حکومت کے روّیے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ یہ انتقالِ اقتدار نہیں تھا۔

قصرِ صدارت کی اِن سرگرمیوں سے یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ جب ہمارے تین نیم مسلح اور نڈھال ڈویژنوں پر دشمن کے بارہ ڈویژنوں نے حملہ کر دیا تھا اور جب (۷ دسمبر تک) مغربی پاکستان سے ہمارا حملہ بیکار ہو چکا تھا اور جب مشرقی پاکستان میں شکست کے آثار نظر آنے لگے تھے، اسلام آباد میں لیڈروں کی دلچسپیاں اقتدار پر مرکوز تھیں اور یحییٰ خان کرسیٔ صدارت کے ساتھ چپکے رہنے کے جتن کر رہا تھا۔ لندن کے جریدے ECONOMIST نے ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں نورالامین اور بھٹو کی تقرری پر رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارتی حملے کے فوراً بعد یحییٰ خان کی یہ کارروائی اچھی تھی، لیکن نورالامین اور ذوالفقار علی بھٹو کو سول گورنمنٹ کا سربراہ بنا کر یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ فوجیوں کو تباہی کی ذمہ داری سے بری کیا جا سکے گا۔

ان حالات میں مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کیا گیا جس کی ابتدا بھارت کے آٹھ ہوائی اڈوں پر ہوائی حملوں سے کی گئی۔ قوم کو یہ خبر سنائی گئی کہ بھارت نے مغربی پاکستان پر بھی حملہ کر دیا ہے۔ اس خبر نے قوم کا مورال بلند کرنے کی بجائے یہ ڈر پیدا کر دیا کہ بھارت اتنا طاقتور ملک ہے کہ اس نے بیک وقت دو محاذ کھول دیے ہیں۔ بعض پاکستانیوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سُنا گیا کہ بھارت مشرقی پاکستان کو ختم کر کے مغربی پاکستان کو بھی لے لے گا۔ قوم کو یہ بتانا چاہیے تھا کہ ہم نے مغربی پاکستان سے بھارت پر جوابی حملہ کر دیا ہے۔ اس کا اثر اور ردِّ عمل کچھ اور ہوتا۔ قوم کو غلط خبر سنانے کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ قوم نے اُس جذبۂ ایثار سے مسلح افواج کا ساتھ نہ دیا جس کا مظاہرہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہُوا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں قوم پر مایوسی سی

طاری تھی جس میں خوف کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ غیر ملکی وقائع نگاروں نے اس حملے کی جو مختلف وجوہات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں،

- حکومتِ پاکستان مشرقی پاکستان میں فائر بندی کرانا چاہتی تھی۔ مشرقی پاکستان کی جنگ کو وہ محدود جنگ سمجھتی تھی۔ اس لیے یحییٰ خان نے مغربی پاکستان سے حملہ کرکے دونوں ملکوں کی کھلی جنگ بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ اقوام متحدہ فائر بندی کرا دے اور بھارت مشرقی پاکستان سے اپنی فوجیں نکال لے۔ اس طرح یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو بچانا چاہتا تھا۔
- پاکستان کی ایسٹرن کمانڈ تین چار مہینوں سے ہائی کمانڈ کو پریشان کیے ہوئے تھی کہ اُسے ٹینک، بڑی توپیں، طیارے اور بحری جہاز دیے جائیں۔ اسلام آباد کے حاکموں نے انہیں مدد دینے کی بجائے مغربی پاکستان سے ڈھیلا سا حملہ کرکے ایسٹرن کمانڈ سے کہا کہ گھبراؤ نہیں، ہم نے ادھر سے حملہ کرکے اتنی کامیابیاں حاصل کرلی ہیں کہ بھارت اب تم پہ دباؤ نہیں ڈالے گا۔
- اپنی لغزشوں اور غفلت پر پردہ ڈالنے کے لیے قوم کا یہ پُرزور مطالبہ پورا کیا گیا کہ مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا جائے۔
- اس حملے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اِدھر سے بھارت کے خاصے علاقے پر قبضہ کرکے اُس پر اپنی شرائط ٹھونسی جا سکیں۔ اس حملے کے پس منظر میں پاکستان کی اندرونی سیاست کارفرما تھی۔
- یحییٰ خان کے دربار میں بعض مشیر ایسے تھے جو مشرقی پاکستان کو جلدی ختم کرانا چاہتے تھے اس لیے اُنہوں نے اِدھر سے حملے کا مشورہ دیا۔ وہ جنرل نیازی کو کوئی کمک، سپلائی اور بڑے ہتھیار دینے کے حق میں نہیں تھے۔
- یہ مختلف قیاس آرائیاں تھیں۔ بعد کے حالات نے سب کی قیاس آرائیوں کو صحیح ثابت کر دیا اور یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام آباد میں جو بھی فیصلہ کیا گیا وہ مشرقی پاکستان کو نظر انداز کرکے یعنی مشرقی پاکستان سے دستبردار ہو کر کیا گیا۔ ... کا ذمہ دار کون تھا؟ یہ چھان بین حمود الرحمٰن کمشن کو کرنی تھی۔

۳ دسمبر کے حملے کے فیصلے نے مشرقی پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ بھارت نے بے شک ۲۱/۲۰ نومبر کی درمیانی رات مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا لیکن کھلی جنگ کی طرح وہ دُور اندر کے ٹھکانوں وغیرہ تک ہوائی حملے نہیں کر سکتا تھا، وہ نہ ہی نیوی کو استعمال کر سکتا تھا۔ وہ ٹینکوں کو بھی دُور اندر تک لانے سے گھبراتا تھا۔ بھارتی فوج کے لیے ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ اس کے جو ٹینک ہماری سرحد کے اندر تباہ ہوتے تھے اور جو نفری مرتی تھی، ان ٹینکوں اور لاشوں کو بھارتی رات ہی رات اپنی سرحد میں اُٹھا لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً ہلی کے محاذ پر بھارتیوں نے اپنے تباہ شدہ ٹینک اور لاشیں لے جانے کی کوشش میں اپنا بے تحاشہ جانی نقصان کرایا تھا۔ کھلی جنگ میں تباہ شدہ ٹینکوں اور لاشوں کی طرف کم ہی دھیان دیا جاتا ہے۔

ہمارے ٹروپس کو یہ سہولت حاصل تھی کہ دو بین الاقوامی اڈے، ڈھاکہ اور چٹاگانگ محفوظ تھے۔ ان سے سامان اِدھر اُدھر بھیجنے اور زخمیوں کو منتقل کرنے کی سہولت تھی۔ ہیلی کاپٹر آزادانہ استعمال ہوتے تھے۔ بھارت ان اڈوں کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے تین ڈویژن بہت ہی بُری حالت میں تھے پھر بھی انہوں نے ۳ دسمبر تک دشمن کو کسی ذرا سے علاقے پر بھی قبضہ نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ جذبے کے زور پر لڑ رہے تھے۔ مغربی پاکستان سے جانے والی سپلائی کے لیے راستے کھلے تھے۔ اگر اپنے ٹروپس کو کمک نہ سہی سامان ہی ملتا رہتا اور انہیں ٹینک، ٹینک شکن اسلحہ اور بڑی توپیں دے دی جاتیں تو وہ لمبے عرصے تک لڑتے رہتے مگر ۳ دسمبر کی شام اُن کی قسمت سربمہر کر دی گئی۔

۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح بھارت نے وہ تمام تر قہر جو اُس نے مشرقی پاکستان پر پھینکنے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا کھلا چھوڑ دیا۔ ہماری ایسٹرن کمانڈ اُن تمام سہولتوں سے محروم ہوگئی جن کے بل بوتے پر وہ محاصرے میں لمبے عرصے تک لڑ سکتی تھی۔ دونوں بین الاقوامی اڈے بھارت کے طیاروں کے ٹارگیٹ بن

گئے۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ کا یہ عالم تھا کہ اڈہ تباہ ہونے تک ہوائی حملے کی زد میں رہتا تھا۔ آٹھ طیارے جاتے تھے تو بارہ آجاتے تھے۔ چٹاگانگ بھارت کے طیارہ بردار جہاز "وکرانت" کے طیاروں کا نشانہ بن گیا۔ بھارتی نیوی دریاؤں کے اندر آگئی۔ روسی ٹینک جو خشکی اور پانی پر چلتے تھے اپنے پورے رول میں استعمال ہونے لگے۔ دشمن کی ہیوی اور میڈیم آرٹلری کا قہر الگ تھا۔ ہمارے ہیلی کاپٹروں کی دن کی پروازیں بند ہوگئیں۔ بھارت کے ہیلی کاپٹر آزادی سے اُڑنے لگے۔ اگلے مورچوں تک سامان پہنچانے کے راستے مسدود ہوگئے۔ تقریباً تمام پل بھارت کی اُس کمانڈو فورس نے اُڑا دیے تھے جو پہلے سے وہاں انہی کاموں کے لیے موجود تھی۔ دریائی ٹرانسپورٹ کی حالت بھی مخدوش تھی۔ بہت سے جہاز اور لانچیں آبی بارودی سرنگوں سے تباہ ہو چکی تھیں۔ ہماری اپنی کوئی کشتی چلتی تھی، انڈین ایئر فورس کے کسی طیارے کا شکار ہو جاتی تھی۔ دن کے وقت محاذوں کی طرف جاتی ہوئی گاڑی منزل تک کم ہی پہنچتی تھی۔

فضا میں انڈین ایئر فورس کی حکمرانی تھی۔ پاک فضائیہ کا واحد سکواڈرن ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کے دفاع میں لڑتا رہا۔ حتیٰ کہ اڈہ طیارے اُڑانے کے قابل نہ رہا۔ پاک فضائیہ کے اِن مٹھی بھر جانباز شاہبازوں کو خراجِ تحسین نہ پیش کرنا زیادتی ہوگی۔ عینی شاہدوں میں اکثریت غیر ملکی رپورٹروں کی تھی ـــ وہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی چھت پر کھڑے فضائی معرکے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انڈین ایئر فورس کے بارہ سے سولہ طیاروں تک کا مقابلہ پاکستان ایئر فورس کے صرف تین تین ہوا باز کرتے تھے۔ بھارتی طیاروں میں پاکستان کے طیارے نظر نہیں آتے تھے لیکن بھارتی طیارے ایک دوسرے کے پیچھے جل جل کر گر رہے تھے یا فضا میں پھٹ رہے تھے۔ انہیں مار گرانے والوں میں پاک فوج اور فضائیہ کے طیارہ شکن گنر بھی تھے جن پر طیارے بے دردی سے مشین گن اور راکٹ فائرنگ کر رہے تھے۔ تین دنوں میں ہمارے شاہبازوں اور طیارہ شکن گنروں نے دشمن کے چھبیس طیارے مار گرائے۔ اس کے

مقابلے میں اپنے صرف پانچ طیارے ضائع ہوئے جن میں سے ایک ۳ دسمبر سے پہلے سرحد کے قریب ایک فضائی جھڑپ میں تباہ ہو گیا تھا۔ دوسرا ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اپنے کسی طیارہ شکن گنر کی زد میں آگیا تھا۔ ڈھاکہ کے فضائی معرکے میں صرف تین طیارے ضائع ہوئے۔

اپنے شاہبازوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہم اُن شاہبازوں کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں پاک فضائیہ کا جو سیبر سکواڈرن تھا اسے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں "دُم تراش" TAIL CHOPPERS کا خطاب دیا گیا تھا۔ اِن شاہبازوں کا کارنامہ ایسا بے مثال تھا کہ وہ اس سے بڑے خطاب کے حقدار تھے۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح انڈین ایئر فورس کے لڑاکا بمبار طیاروں نے ڈھاکہ اور چاٹگام پر حملہ کیا اور کوئی نقصان کیے بغیر واپس چلے گئے۔ وہ کلائی کنڈہ (مغربی بنگال) کے اڈے پر اُترے ہی تھے کہ ہمارے شاہباز پہنچ گئے اور اُن تمام طیاروں کو تباہ کر آئے جو ڈھاکہ اور چاٹگام پر حملہ کر گئے تھے۔ ہمارے صرف ایک سکواڈرن نے پہلے ہی دن انڈین ایئر فورس کے چودہ کینبرا بمبار طیارے اور ایک باربردار طیارہ بالکل خاکستر اور چار کینبرا اور تین ہنٹر بیکار کر کے انڈین ایئر فورس کا زعم توڑ دیا۔ اس کے بعد انڈین ایئر فورس نے مشرقی پاکستان کا رُخ نہ کیا۔ البتہ ہمارے شاہبازوں نے دشمن کے ہوائی اڈوں پر حملوں کا تسلسل جاری رکھ کر بھارت کی اُس فضائی قوت کو سر نہ اُٹھانے دیا جو اس نے مشرقی پاکستان کے لیے جمع کر رکھی تھی۔

مگر اسی سکواڈرن کو جس نے انڈین ایئر فورس کو چھ سال پہلے سر نہیں اُٹھانے دیا تھا، دسمبر ۷۱ء میں اپنے طیارے اپنے ہاتھوں تباہ کرنے پڑے اور شاہبازوں کو ایک ہیلی کاپٹر میں وہاں سے جان بچا کر نکلنا پڑا۔ مقابلہ تو انہوں نے اب کے بھی کیا تھا اور خوب کیا تھا۔ اس مقابلے کا آنکھوں دیکھا حال بہت سے غیر ملکی نامہ نگاروں نے لکھا تھا۔ وہ ڈھاکہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی چھت پر کھڑے فضا میں اس مقابلے کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے دیس دیس کے اخباروں کو جو خبریں دی تھیں ان میں سے صرف دو ملاحظہ فرمائیے۔ بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی، یونائیٹڈ پریس

انٹرنیشنل ریو۔پی۔آئی) کے نمائندے جوزف گیلوے کی دی ہوئی خبر جو ہر ملک کے اخباروں میں چھپی تھی، کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"ڈھاکہ ۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء ——— آج مشرقی پاکستان میں پہلی فضائی جنگ کا سکور ۱۶ ——— ۲ رہا۔ بھارت کے سولہ اور پاکستان کے دو طیارے تباہ ہوئے۔ بھارتی بہت پیچھے رہ گئے ہیں ... ڈھاکہ ہوائی اڈے سے دو میل دور انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی چھت پر کھڑے بہت سے غیر ملکی نامہ نگاروں نے اپنی آنکھوں بھارت کے پانچ مگ اور ایس یو سیون شعلوں میں لپٹے ہوئے گرتے دیکھے ..... بھارت کی ایئرفورس کے حملے صبح تین بجے شروع ہو گئے تھے۔ جونہی صبح کا اجالا نکھرا پاکستان کے کوریا کی جنگ کے دور کے سست رفتار اور قدیم سیبر طیارے بھارت کے جدید اور تیز مگ ۲۱، ہنٹر اور ایس یو سیون طیاروں کے مقابلے میں فضا میں پہنچ گئے .... دنیا بھر کے ستر اخباری نمائندے اور غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کے نامہ نگار انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی چھت پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ٹیلی ویژن کمپنیوں کے کیمرہ مین فضائی معرکوں اور بھارت کے جل جل کر گرتے ہوئے طیاروں کی فلمیں لے رہے تھے۔"

ایک اور بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی 'رائٹر' کے وقائع نگار سندر لینڈ نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

"ڈھاکہ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء ——— جنگی مبصروں اور شاہدوں کی نظروں کے سامنے ڈھاکہ کے اہم ہوائی اڈے پر بھارتیوں کا پہلا ہوائی حملہ بُری طرح ناکام کیا گیا ہے۔ بھارتی بے دریغ بمباری، راکٹ اور مشین گن فائرنگ کے باوجود اڈے کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا سکے ..... بھارت کے چھ جیٹ طیارے گرا کر پاکستانی اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ دوپہر کے بعد تک ڈھاکہ ہوائی اڈے پر پینتیس حملوں کے

باوجود اڈے کا کچھ نہ بگڑا۔ بھارتیوں سے ہر کسی کو توقع تھی کہ اتنے زیادہ اور ایسے جدید طیاروں سے پاکستان کے سیبر طیاروں کے مقابلے میں بہت نقصان پہنچائیں گے لیکن پاکستانی ہوابازوں نے سیبر جیسے سست اور پرانی قسم کے طیاروں سے بھارتی طیاروں کو مار گرایا۔"

پاک فضائیہ کی شجاعت کی داستان جو دوسرے ملکوں کے عینی شاہدوں نے سنائی ہے خاصی طویل ہے۔ صرف دو کے اقتباس پیش کر کے اس کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس ولولہ انگیز داستان کا آخری منظر بڑا ہی افسوسناک ہے لیکن اس کی ذمہ داری پاک فضائیہ پر عائد نہیں کی جا سکتی۔ مشرقی پاکستان کے دونوں طرف بھارت نے لڑاکا بمبار طیاروں کے دس سکواڈرن رکھے ہوئے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا وہاں صرف ایک سکواڈرن تھا جس کے پاس کُل سولہ طیارے تھے اور وہ بھی قدیم اور سست رفتار سیبر، جب کہ دشمن کے پاس مگ ۲۱، اور ایس یو سیون جیسے جدید طیارے تھے جن کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ تھی۔ ذرا تصور فرمائیے کہ شاہبازوں سے یہ توقع وابستہ کی گئی تھی کہ وہ سولہ سیبر طیاروں سے ڈیڑھ سو برتر طیاروں کا مقابلہ کریں۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ کے سکواڈرن کے کمانڈر ونگ کمانڈر افضل چوہدری تھے۔ انہیں انتہائی مشکل حالات میں ایک طاقتور دشمن سے مقابلہ کرنے اور اسے اپنی استطاعت سے بڑھ کر نقصان پہنچانے کے صلے میں ستارۂ جرأت دیا گیا ہے۔ ونگ کمانڈر افضل چوہدری کہتے ہیں ——— "ڈھاکہ میں سیبر طیاروں کا صرف ایک سکواڈرن تھا۔ جنگی پروازوں کے لیے اڈے پر ضروری سہولتوں اور انتظامات کی بھی کمی تھی اور ان حالات میں ہمارا مقابلہ دشمن کے آٹھ سے دس ایسے سکواڈرنوں سے تھا جن کے پاس جدید ترین طیارے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آخر میں ہمیں مقابلے سے دستبردار ہونا پڑا لیکن ایسے بے حد مشکل حالات میں جس طرح میرا سکواڈرن لڑا، اس کی مثال فضائی جنگوں کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ ایسے

فضائی معرکوں میں جن میں فریقین میں برابری تھی ہی نہیں، ہمارے جوشیلے ہوابازوں نے پورے جوش اور استقلال سے دشمن کا چیلنج قبول کیا اور حملہ آور طیاروں کو فضا میں تباہ کیا۔ ان کی تعریف دوست نے بھی کی دشمن نے بھی۔

ونگ کمانڈر چوہدری نے کڑی آزمائش کے اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا ـــ ”کھلی جنگ تو ۳ دسمبر ۱۹۷۱ کی رات شروع ہوئی تھی جب انڈین ایئرفورس نے ڈھاکہ اور کرمی ٹولہ کے ہوائی اڈوں پر بمباری شروع کر دی تھی لیکن پاکستان ایئرفورس مارچ ۱۹۷۱ سے ہی باغیوں اور اُن بھارتی فوجیوں کی سرکوبی کے لیے سرگرم تھی جو مشرقی پاکستان میں گھس آئے تھے۔ اس عرصے میں پاکستان ایئرفورس پاک فوج کی مدد کرتی رہی جس میں اس نے بہت سی جنگی پروازیں کیں.....

”۳ دسمبر ۱۹۷۱ کے بعد جہاں تک پاکستان ایئرفورس کا تعلق ہے جنگ تین دنوں میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ ان تین دنوں میں ہمارے ہوابازوں اور طیارہ شکن توپچیوں نے جرأت اور بے خوفی کے غیر معمولی مظاہرے کیے اور ناقابلِ یقین کارنامے کر دکھائے۔ ہوابازوں نے اِن دنوں میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جس طرح انہوں نے جنگی پروازیں کی ہیں ان کے پیچھے زمین پر کام کرنے والے عملے کی انتھک کوششوں اور فرض شناسی کا بڑا دخل ہے۔ اس کے بغیر ہوا باز ڈھاکہ کے ہوائی اڈے سے ایسی مشکلات اور مجبوریوں میں کبھی جنگی پروازیں نہ کر سکتے.....

”۳/۴ دسمبر کی درمیانی رات انڈین ایئرفورس نے ہمارے ہوائی اڈے اور دفاعی انتظامات پر شدید بمباری کی۔ بہرحال پاکستان ایئرفورس کی تنصیبات محفوظ رہیں لیکن بھارتی ہوابازوں کے بم شہری آبادی پر گرے یا ڈھاکہ کے اِردگرد کھیت میں۔ اگلی صبح سے انڈین ایئرفورس نے دن کے وقت بھی حملے شروع کر دیے۔ ڈھاکہ اور کرمی ٹولہ کے ہوائی اڈوں اور نارائن گنج کے کارخانوں پر دشمن نے ایک سو اٹھائیس جنگی پروازیں بھیجیں۔ یعنی ایک سو اٹھائیس طیاروں نے بمباری، راکٹ اور مشین گن فائرنگ کے حملے کیے۔ ہر حملے میں کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ سولہ طیارے آتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے مگ ۲۱

طیارے ساتھ ہوتے تھے تاکہ ہمارے طیارے بمباری کرنے والے طیاروں کو روک نہ سکیں....

”۴ دسمبر کی شام تک پاکستان ایئرفورس کے ہوا باز تیرہ ایس یو سیون اور ہنٹر فضائی معرکوں میں گرا چکے تھے۔ ان کے علاوہ چار طیارے طیارہ شکن توپچیوں نے گرائے تھے۔ ہر فضائی معرکے میں تناسب یہ تھا کہ ہمارے ایک ہوا باز کا مقابلہ چار سے آٹھ طیاروں تک تھا۔ برتری، رفتار کی تیزی اور دیگر جدید تکنیکی خوبیوں کے باوجود ہنٹر اور ایس یو سیون، سیبر جیسے قدیم فضائی گھوڑے کے سامنے مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہ ہمارے ہوابازوں کی فنی مہارت اور جذبے کا کمال تھا، ۴ دسمبر کے پچھلے پہر بھارتیوں نے آواز کی رفتار سے تیز مگ ۲۱ طیارے بھیجے....

”صبح کے وقت انڈین ایئرفورس کے بارہ طیاروں کا ایک ریلا آیا جس میں ہنٹر اور ایس یو سیون تھے۔ وہ ہوائی اڈے پر بمباری کے لیے آئے۔ پاکستان ایئرفورس کے دو ہوا باز سکواڈرن لیڈر افضل اور فلائٹ لیفٹیننٹ سعید افضل خان پہلے ہی فضا میں موجود تھے۔ وہ گشتی پرواز کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ بھی پروا نہ کی کہ وہ دو ہیں اور دشمن کی تعداد بارہ ہے۔ وہ بارہ کے مقابلے میں آ گئے۔ دن کے وقت جب زمین سے ہر کوئی دیکھ رہا تھا۔ ہمارے دو ہوابازوں نے بارہ برتر طیاروں سے فضائی معرکہ لڑا اور بارہ میں سے ایک ایس یو سیون اور دو ہنٹر مار گرائے۔ باقی دس بم گرائے بغیر بھاگ گئے....

”آدھے گھنٹے بعد انڈین ایئرفورس کے طیاروں کا ایک اور ریلا آیا۔ اُس وقت سکواڈرن لیڈر افضل اور فلائٹ لیفٹیننٹ سعید افضل خان اُتر آئے تھے اور ان کی جگہ سکواڈرن لیڈر دلاور حسین اور فلائنگ آفیسر شمس الحق فضا میں موجود تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے ساتھی ہوابازوں کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے چھ گنا زیادہ دشمن کو مقابلے کے لیے للکارا۔ فضائی معرکہ لڑا گیا اس میں فلائنگ آفیسر شمس نے ایک ہنٹر کو مار گرایا....

”تھوڑی دیر بعد فلائٹ لیفٹیننٹ سعید افضل خان پھر فضا میں موجود تھا۔

دشمن کے طیاروں کا ایک ریلا آیا۔ فضائی معرکہ لڑا گیا جس میں ہمارا اکیلا ہوا باز کئی ایک بھارتی طیاروں سے لڑ رہا تھا۔ آخر فلائٹ لیفٹیننٹ سعید افضل خان ایک ہنٹر کی گولیوں کی زد میں آگیا۔ وہ پیراشوٹ سے نکل آیا۔ وہ اُترا تو اپنے ہی علاقے میں تھا مگر مکتی باہنی کے ہتھے چڑھ گیا پھر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اسے ستارۂ جرأت دیا گیا۔ اس اعزاز کے ساتھ جو سرکاری سند دی گئی اس میں تحریر ہے۔

"۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز فلائٹ لیفٹیننٹ سعید افضل خان نمبر ۲ کی حیثیت سے اُڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور سیبر طیارہ تھا۔ اس نے چار ہنٹر طیاروں سے مقابلہ کیا اور فوراً ایک کو مار گرایا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہنٹر طیاروں کے ایک اور غول پر حملہ کر دیا اور غیر معمولی دلیری سے اکیلے ان کا مقابلہ کیا۔ اس نے ان میں سے کسی ایک بھی طیارے کو ڈھاکہ ہوائی اڈے کے قریب نہ آنے دیا۔ دشمن کی تعداد زیادہ تھی اور طیارے اُس کے طیارے کے مقابلے میں برتر اور جدید تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود وہ لڑتا رہا اور دشمن کے طیاروں کو اڈے سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ایک ہنٹر نے اس کے طیارے کو زد میں لے لیا۔ وہ طیارے سے نکل آیا مگر اسے مکتی باہنی نے پکڑ لیا۔ اس وقت سے وہ لاپتہ ہے"....

"ایک اور فضائی معرکے میں پاکستان ایئر فورس کا ایک اور جانباز شاہباز ونگ کمانڈر سیّد محمد احمد لاپتہ ہو گیا۔ اسے بھی ستارۂ جرأت دیا گیا۔ ونگ کمانڈر سیّد محمد احمد سٹاف ڈیوٹی پر تھے۔ جنگی پروازیں ان کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھیں۔ انہوں نے سٹاف ڈیوٹی بھی پوری جانفشانی سے کی اور رضاکارانہ طور پر جنگی پروازیں بھی کرتے رہے اور فضائی معرکے بھی لڑے۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز ہمارے کچھ طیارے ایک جنگی مشن کے لیے فضا میں تھے۔ انڈین ایئر فورس کے طیارے آگئے۔ ہمارے ہوا باز ان سے فضائی جنگ لڑنے لگے۔ اس دوران، دشمن کے مزید طیارے آگئے۔ ہمارے طیاروں کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔ ان کے لیڈر نے مدد مانگی۔ ونگ کمانڈر سیّد محمد احمد فوراً ان کی مدد کے لیے طیارے میں بیٹھے اور فضا میں پہنچ گئے۔ ان کے اس قدر جلدی پہنچنے سے ان ہوا بازوں کا حوصلہ بلند ہو گیا جو کئی گُنا طاقتور دشمن کے گھیرے میں آگئے تھے....

"وہ سب خیریت سے اڈے پر آگئے مگر ونگ کمانڈر سیّد محمد احمد دشمن سے اُلجھے رہے۔ حتیٰ کہ دشمن کی زد میں آگئے۔ وہ پیراشوٹ سے نکل گئے لیکن ایسے علاقے میں جا اُترے جو مکتی باہنی کے قبضے میں تھا۔ اُس وقت سے وہ لاپتہ ہیں....

"سارا دن فضا میں طیارے لڑتے رہے۔ ہمارا ایک ایک ہوا باز آٹھ آٹھ بھارتی ہوا بازوں سے لڑتا رہا۔ فلائنگ آفیسر شمس الحق جو سکواڈرن میں عمر اور سروس کے لحاظ سے سب سے چھوٹا بلکہ کمسن تھا، سب سے زیادہ تیز اور دلیر نکلا۔ اُس نے دشمن کے تین طیارے گرائے جن میں دو ہنٹر اور ایک ایس یُوسیون تھا۔ اُس کے ساتھ صرف ایک اور ہوا باز فلائنگ آفیسر شمشاد احمد تھا۔ ان دو کا مقابلہ دو ایس یُوسیون اور چار ہنٹر طیاروں سے ہُوا تھا۔ تین کو شمس نے گرایا اور ایک ہنٹر کو شمشاد نے نشانہ بنایا۔ دونوں کو ستارۂ جرأت دیا گیا۔ فلائنگ آفیسر شمشاد نے اس سے پہلے ایک اور ہنٹر کو مار گرایا تھا جو پاک فوج کے مورچوں پر حملے کے لیے آیا تھا۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کے فضائی معرکوں میں سکواڈرن لیڈر جاوید افضل خان نے بھی دو ہنٹر طیارے مار گرائے۔ اُنہیں بھی ستارۂ جرأت دیا گیا....

"آخری فضائی معرکہ سکواڈرن لیڈر دلاور حسین نے جو جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ستارۂ جرأت ہیں، لڑا۔ ان کے ساتھ فلائنگ آفیسر سجاد تھا۔ دونوں نے چار ہنٹر طیاروں سے مقابلہ کیا۔ ایک کو سکواڈرن لیڈر دلاور حسین نے مار گرایا اور باقی تین اپنا مشن ترک کر کے بھاگ گئے....

"۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز پاکستان آرمی کے ہیلی کاپٹر مختلف سیکٹروں میں سرگرم تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ہم نے کچھ طیارے بھیجے۔ اب بھارتی

طیّارے ڈھاکہ ہوائی اڈے پر رات کے وقت بمباری کے لیے آتے تھے۔

۶ دسمبر ۱۹۷۱ کے روز ہم نے فیصلہ کیا کہ پاکستان آرمی کو مدد دی جائے۔ کومیلا سیکٹر میں پاکستان آرمی پر دباؤ زیادہ تھا۔ فوج پر بھارتی طیّارے بھی حملے کرتے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ چار ہنٹر کومیلا کے قریب ہماری فوج پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہم نے چار سیبر طیارے بھیج دیئے۔ اس فضائی معرکے میں ایک ہنٹر طیّارہ گرایا گیا....

" ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات دشمن نے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پے در پے بمباری کر کے رن وے بالکل ہی برباد کر دیا۔ اس کے بعد انڈین ایئر فورس نے اڈے پر مسلسل بمباری جاری رکھی اور ہمیں مرمت کی مہلت نہ دی۔ دشمن کے پاس طیّارے اتنے زیادہ تھے کہ ہم اتنے تھوڑے طیاروں سے اس کے ریلوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔ ہمارے طیّارے اب اُڑ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ رن وے تباہ ہو چکا تھا اور سارا میدان کھڈوں سے بھر گیا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۱ تک ہوائی اڈے کی یہ حالت ہو گئی کہ مرمت کی سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی"۔

ونگ کمانڈر افضل چوہدری نے رنجیدہ آواز میں کہا — "ہوائی اڈے کے میدان اور رن وے پر گہرے اور وسیع گڑھوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا اور اس سرزمین کی قسمت سربمہر ہو گئی تھی جو اُس وقت تک مشرقی پاکستان کہلاتی تھی ہمارے پاس سولہ میں سے گیارہ طیّارے رہ گئے تھے۔ ہم نے بوجھل دلوں سے گیارہ طیاروں کو جن سے ہم نے بڑے ہی طاقتور اور تیز طیّاروں کا مقابلہ کیا اور مشرقی پاکستان کو دشمن سے بچانے کی کوشش کی تھی، اپنے ہاتھوں آگ لگا دی۔ ہم سب ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اور برما سے ہوتے ہوتے مغربی پاکستان میں آ گئے"۔

مشرقی پاکستان کی فضائی جنگ کی کہانی یہیں پہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی جو ہمارے ہوابازوں کی شاہبازی اور جانبازی کی لازوال داستان شجاعت ہے، ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ ہمیں شرمسار کرتی ہے۔ آج کے دور کی جنگ طاقتور ہوائی بیڑے کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی۔ برّی فوج کتنی ہی زیادہ اور فائر پاور کے لحاظ سے کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، فضائی بیڑے کی مدد کے بغیر محض بیکار ہے۔ فضائی مدد کے بغیر جوش اور جذبہ بھی بیکار ہے۔ جس خطّے کو فتح کرنے کے لیے دشمن نے دس سکواڈرن جدید ترین طیّاروں کے استعمال کیے، اس خطّے کے دفاع کے لیے ہم نے دقیانوسی اور سُست رفتار طیاروں کا صرف ایک سکواڈرن لڑایا۔ اتنے بڑے ملک میں صرف ایک ہوائی اڈہ بنایا اور وہ بھی جنگی پروازوں کی سہولتوں سے محروم۔ دشمن نے صرف اڈہ تباہ کر دیا اور ہمارے اچھے بھلے طیّارے اور اس قدر جرأت مند ہوا باز مفلوج ہو گئے۔ اس سے انڈین ایئر فورس کو کھلی فضا مل گئی اور وہ پاک فوج کے لیے ایک آفت بن گئی۔

اب ضرورت یہ ہے کہ ہم ایسی بھیانک لغزشوں سے عبرت حاصل کریں انڈین ایئر فورس نے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر روس کے وہ بم گرائے تھے جو رن وے کو عام بم کی نسبت بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں تیسرے دن کے اختتام تک ہوائی اڈے کے رن وے اس قدر تباہ ہو چکے تھے کہ طیّارے نہیں اُڑائے جا سکتے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے شاہباز اُڑانے کو بے تاب تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دفعہ طیاروں کو زمین سے اُٹھا لیں پھر اُترتے وقت چاہے کریش ہو جائیں۔ انڈین ایئر فورس کی کمر توڑ دیں گے لیکن انہیں جنرل نیازی نے ایسے خودکُش اقدام سے روک دیا۔ یہ شاہباز بڑے ہی قیمتی تھے۔ انہیں ایسی مہم پر بھیجنا غیر انسانی فعل تھا جس میں دشمن کو نقصان پہنچانا مخدوش اور موت یقینی تھی۔ اڈہ تباہ ہوتے ہی پاکستان ایئر فورس بیکار ہو گئی۔ گیارہ طیّارے رہ گئے تھے۔ انہیں اس وقت اپنے ہاتھوں تباہ کر دیا گیا جب یقین ہو چکا تھا کہ مشرقی پاکستان کو نہیں بچایا جا سکے گا

پاک فوج کے یہ تین ڈویژن فضائی مدد سے تو پہلے ہی محروم تھے۔ اب فضائی مدد کی اُمید ہی ختم ہو گئی۔ وہ ہیلی کاپٹروں سے بھی محروم ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر تو کہیں بھی اُتارا اور چڑھایا جا سکتا ہے مگر دن کے وقت اُڑنے والے ہیلی کاپٹر کو تباہ شدہ ہیلی کاپٹر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ہواباز پاک فوج کے افسر تھے۔ انہوں نے یہ حیران کُن

کمال کر دکھایا کہ وہ رات کے وقت ہیلی کاپٹر اُڑاتے اگلے مورچوں تک جاتے تھے۔ اگر علاقہ میدانی ہو تو رات کی تاریکی میں بتیوں کے بغیر ہیلی کاپٹر اس توقع پر اُڑایا اور کہیں بھی اُتارا جا سکتا ہے کہ نیچے میدان ہوگا مشرقی پاکستان جیسے علاقے میں یہ خطرہ مول لینا خودکشی کے برابر تھا کیونکہ نیچے کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ درختوں کے جُھنڈ ہوں گے، جھیل یا دلدل ہوگی یا ٹیکری۔ ہیلی کاپٹروں کے ہوا باز جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ وہ اگلے مورچوں تک راشن وغیرہ پہنچاتے تھے۔ گھیرے میں آئی ہوئی پوزیشنوں تک بھی انہوں نے سپلائی پہنچائی۔ ڈویژن اور بریگیڈ کمانڈروں کو محاذوں کی مختلف پوزیشنوں تک لے جاتے رہے۔ ان کا سب سے زیادہ دلیرانہ اقدام رات کی پروازیں تھیں۔ اِن پروازوں میں وہ کبھی راستے سے نہ بھٹکے۔ آٹھ میں سے صرف ایک ہیلی کاپٹر کریش ہو کر بے کار ہُوا۔ اِن فوجی ہوا بازوں کا آخری کارنامہ یہ تھا کہ ۱۵ دسمبر کے روز جب دشمن ڈھاکہ تک چھا گیا اور سارے ملک میں پھیل گیا تھا، ان ہوا بازوں نے دشمن کی نظروں کے سامنے تمام کے تمام ہیلی کاپٹر جن کی تعداد سات تھی، اُڑائے اور برما پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے افراد کو نکال کر لے گئے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام تک مشرقی پاکستان والے اپنے تین ڈویژنوں کی جو جسمانی اور ذہنی کیفیت تھی، ایک بار پھر بیان کر دی جائے۔ اس کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ ملٹری ایکشن اُس واحد ڈویژن سے شروع کیا گیا تھا جو وہاں کچھ عرصے سے موجود تھا۔ اس کی مدد کے لیے اپریل میں دو اور ڈویژن بھیجے گئے۔ ان کے پاس صرف سمال آرمز تھے۔ کوئی آرمرڈ رجمنٹ، ہیوی یا میڈیم آرٹلری رجمنٹ، انجینئرز بٹالین، میڈیکل کور اور کوئی امدادی یونٹ ساتھ نہ بھیجی گئی۔ اس نفری میں سے بہت سے زخمی اور شہید ہوئے۔ یہ نفری پوری نہیں کی گئی۔ شہادت ملٹری ایکشن میں بھی ہوئی اور ۲۱، ۲۲ نومبر سے شہادت کی رفتار تیز ہو گئی کیونکہ بھارتی فوج نے ہر طرف سے حملہ کر دیا تھا جسے روکنے کے لیے ہمارے افسر اور جوان بے جگری سے لڑے۔ لہٰذا ۳ دسمبر تک یہ ڈویژن نفری کے لحاظ سے اُدھورے اُدھورے رہ گئے تھے۔

اسلحہ اور ایمونیشن کی جو پوزیشن تھی وہ بتائی جا چکی ہے۔ ملک کے اندر مُکتی باہنی جس میں بھارت کی کمانڈو فورس بھی تھی، اتنی زیادہ سرگرم ہو گئی تھی کہ فوجوں کے لیے بازاروں سے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ محبِ وطن ٹھیکیداروں کو قتل کر دیا گیا تھا یا قتل کی دھمکیوں سے انہیں فوج کو سامان سپلائی کرنے سے روک دیا گیا تھا۔

ہمارے ہاں مشرقی پاکستان کے المیہ سے متعلق باتیں ہوتی ہیں تو ایک عنصر کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ ہے جوانوں کی جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت۔ ہمارے ملک میں صرف جذبے اور مورال کی بات کی جاتی ہے۔ مثلاً فوجی امور کو سمجھنے والے لوگوں اور ایک دو ریٹائرڈ جرنیلوں تک نے کہا ہے کہ ایسٹرن کمانڈ کے پاس طیارے، توپخانے اور ٹینک نہیں تھے تو کیا فرق پڑتا تھا، جوانوں کے پاس جذبہ تھا اور اُن کا مورال بلند تھا۔

یہ رائے حقائق پر مبنی نہیں اور یہ رائے غیر جانبدار بھی نہیں۔ جذبہ راکٹ لانچر نہیں ہوتا اور مورال ٹینک شکن گن نہیں ہوتا۔ مورال اور جذبے صرف اُن مورچوں اور معرکوں میں قائم و دائم رہتے ہیں جہاں لڑنے والوں کو یقین ہوتا ہے کہ اُن کا عقب محفوظ اور مستحکم ہے۔ انہیں کمک اور رسد مِل رہی ہے اور اگر وہ مر گئے یا زخمی ہو گئے تو انہیں اُٹھا لیا جائے گا اور معرکہ جیتنے کے لیے عقب سے تازہ دم جوان آجائیں گے اور یہ بھی کہ وہ جب تھک کر نڈھال ہو جائیں گے تو اُن کے پیچھے اتنی نفری ہے جو اُن کی جگہ آ کر انہیں ذرا سستا[illegible] کے لیے پیچھے بھیج دے گی مگر مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ میں وہ تمام عناصر [illegible] تھے جو فولادی جذبوں کو بھی توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔

یہ نہ بھُولیے [illegible] تمین ڈویژن مارچ اور اپریل سے لڑ رہے تھے۔

۲۰ نومبر تک وہ ایسی جنگ لڑتے رہے جو جسمانی حالت کے ساتھ نفسیاتی تباہی کا بھی باعث بنتی ہے۔ یہ تھی گوریلوں اور کمانڈوز کے خلاف جنگ جو مورچوں، بنکروں یا فاکس ہولز میں بیٹھ کر نہیں لڑی جاتی۔ یہ متحرک جنگ ہوتی ہے۔ متحرک بھی ایسی کہ بٹالین کو کمپنیوں میں، کمپنیوں کو پلاٹونوں میں اور پلاٹونوں کو سیکشنوں میں بکھر کر، جنگلوں اور دلدلوں میں، اُونچی نیچی ٹیکریوں پر، سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں اور اجنبی زمین کی اَن دیکھی دشواریوں میں پا پیادہ دوڑنا، پوزیشن لینا، لڑنا اور تعاقب کرنا ہوتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ کوئی سیکشن یا دو چار جوان دشمن کی گھات میں آجاتے ہیں یا گوریلوں کی بچھائی ہوئی بارُودی سرنگوں میں پھنس جاتے اور تباہ ہو جاتے ہیں۔ گھیرے میں آتے ہوئے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے بعض اوقات میلوں دوڑ لگا کر پہنچنا اور لڑنا پڑتا ہے۔

یہاں انڈونیشیا اور ویت نام کی مثالیں ضروری معلوم ہوتی ہیں جنگِ عظیم دوم کے فوراً بعد انڈونیشیا کے مسلمانوں نے اسی قسم کی گوریلا جنگ شروع کی تھی۔ اُن کے پاس کوئی بڑا ہتھیار نہیں تھا۔ وہ "ضرب لگاؤ اور بھاگو" کے اصول پر لڑے تھے۔ انہیں شکست دینے کے لیے برطانیہ کی فوج کے متعدد ڈویژن جن میں برطانوی ہند کی فوج بھی شامل تھی، ایئر فورس کی مدد سے سرگرم ہوئے۔

اُن کی پیش نہ چلی تو امریکہ نے گوریلا آپریشن کے ماہرین بھیجے، فوج بھیجی، طیارے بھیجے اور ایک متحدہ فوج بنا کر انہیں امدادی یونٹیں دیں۔ طیاروں نے زمین پر ہلتی ہر شے پر فائرنگ اور بمباری کی۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کیے۔ دس دس گوریلوں کے پیچھے پورے پورے بریگیڈ بھیجے مگر ناکام رہے اور اڑھائی تین سال بعد یہ اینگلو امریکی لشکر جسے ایئر فورس کی پُوری مدد اور اپنی حکومتوں کی پُوری پشت پناہی حاصل تھی، انڈونیشیا سے منہ موڑ گیا۔

دوسری مثال ویت نام کی ہے۔ ویت نامیوں نے بھی گوریلا جنگ لڑی ہے۔ امریکہ نے وہاں جتنی بری فوج، جتنے طیارے اور ہیلی کاپٹر استعمال کیے ہیں اور جتنی بمباری کی ہے، اس سے کھُلی جنگ میں امریکی امریکہ جتنے بڑے ملک کو فتح کر سکتے تھے۔ امریکیوں نے نیپام بموں کا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ چپے چپے پر امریکی فوج موجود اور سرگرم تھی۔ بمباری اور گولہ باری سے وہاں کا کوئی پتھر ایسا نہ تھا جو ریزہ ریزہ نہ ہُوا ہو، کوئی ایسا گاؤں نہ تھا، جھونپڑہ نہ تھا جو جلا نہ ہو۔ امریکی لشکر نے اس شک میں وہاں کے لوگوں کا قتلِ عام بھی کیا کہ وہ گوریلوں کو پناہ اور مدد دیتے ہیں۔ اتنے بڑے فضائی بیڑے اور بری فوج کی ایسی وحشیانہ کارروائیوں کے باوجود امریکیوں کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ انڈونیشیا میں لڑنے والی اینگلو امریکی فوج اور ویت نام میں لڑنے والی امریکی فوج کی مختلف یونٹوں کو مسلسل ایکشن میں نہیں رکھا جاتا تھا۔ انہیں کئی کئی دن آرام دیا جاتا تھا۔ دو دو تین تین دن چھُٹی دے کر شہروں میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں اُن کے تھکے ہوئے اعصاب کو سہلانے کے لیے ہر طرح کا سامان موجود تھا۔ کبھی کبھی لمبی چھُٹی دے کر انہیں اپنے ملک میں بھیج دیا جاتا تھا۔ اُن کی جنگی اور دیگر ضروریات بلا تاخیر پُوری کی جاتی تھیں۔

مشرقی پاکستان کی گوریلا جنگ انڈونیشیا اور ویت نام سے کم نہیں تھی بلکہ اس لحاظ سے زیادہ خطرناک تھی کہ مکتی باہنی کے ساتھ بھارت کی تربیت یافتہ کمانڈو فورس بھی تھی اور انہیں بھارت سے نہ صرف اسلحہ بارُود کی مدد ملتی تھی بلکہ بھارتی توپخانے ہمارے ٹروپس کو مورچوں میں دبائے رکھنے کے لیے گولہ باری بھی

کرتے تھے۔ مکتی باہنی کی تربیت یافتہ نفری ایک لاکھ سے کچھ زیادہ بتائی جاتی ہے جس میں ایسٹ بنگال رجمنٹوں اور ایسٹ پاکستان رائفلز کی نفری بھی تھی۔ بھارت کی کمانڈو فورس کی نفری جو مشرقی پاکستان میں سرگرم تھی پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔ اس ڈیڑھ لاکھ سے زائد گوریلا فورس کو بھارت کی مدد اور پشت پناہی کے علاوہ یہ سہولتیں حاصل تھیں کہ وہ اُسی ملک کے رہنے والے تھے، وہاں کی ناقص آب و ہوا اور زمین کی دشواریوں کے عادی تھے اور سب سے بڑی سہولت یہ کہ مقامی آبادی انہیں پناہ اور مدد دیتی تھی۔ گوریلا آپریشن اس قدر خطرناک ہوتا ہے کہ گوریلوں کو کہیں سے مدد اور پناہ نہ ملے تو بھی اُن کے نقصان سے بچنا اور انہیں پکڑنا محال ہوتا ہے۔ اگست ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے مُٹھی بھر کمانڈوز نے مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی ڈیڑھ دو لاکھ فوج کو چند دنوں میں بے بس کر دیا تھا اور تباہی اتنی بپا کی تھی کہ بھارتی فوج کی نقل و حرکت رُک گئی تھی۔ حالانکہ انہیں مقبوضہ کشمیر میں مقامی لوگوں سے جو مدد ملی تھی وہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ذرا تصور کیجیے کہ جن گوریلوں کو ہر طرح کی مدد ملتی ہو اور جن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہو، وہ کس قدر خطرناک ہوں گے۔

پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھانوں نے ۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پوری ایک صدی گوریلا جنگ لڑی ہے۔ مَیں نے اس جنگ کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ انگریز کی آدھی ہندوستانی فوج فرنٹیئر میں رہتی تھی اور اس فوج کا نصف حصہ ہر روز اور ہر وقت کسی نہ کسی جگہ پٹھانوں سے اُلجھا رہتا تھا۔ صرف پچاس پٹھانوں کو گھیرے میں لینے کے لیے چار بریگیڈوں کو جنہیں طیاروں کی مدد بھی حاصل تھی، مَیں نے پہاڑیوں پر اور وادیوں میں لکھوکھہا راؤنڈ اور توپوں کے گولے پھونکتے اور سر پٹختے دیکھا ہے۔ پوری ایک صدی میں انگریز چند ایک پوسٹوں اور دو چار چھوٹی چھوٹی چھاؤنیوں کے سوا وہاں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے بھی انڈونیشیا اور ویت نام کی طرح گاؤں کے گاؤں جلا دیئے تھے۔ یہ یاد رہے کہ پٹھانوں کے پاس گرینیڈ اور بارُودی سُرنگیں نہیں تھیں۔ اُن کے پاس صرف رائفلیں اور خنجر تھے۔ قبائلی علاقے میں جنگل بھی

نہیں، دلدل بھی نہیں، فوجوں کے راستے میں کوئی قدرتی رکاوٹ بھی نہیں تھی بے آب و گیاہ پہاڑیاں ہیں جن پر انسان طیارے سے صاف نظر آ جاتا ہے۔ پٹھان گوریلوں کو محفوظ چھپاؤ میسر نہیں تھا۔ اس کے باوجود پٹھانوں نے برطانیہ کے جنگی وزیر چرچل سے برطانوی پارلیمنٹ میں کہلوا لیا تھا کہ حکومتِ برطانیہ کچھ حاصل کیے بغیر پٹھانوں کے آزاد علاقے میں جانی اور مالی نقصان کرا رہی ہے، مَیں مشورہ دیتا ہوں کہ اس خطّے سے ہمیں دستبردار ہو جانا چاہیئے۔

انڈونیشیا، ویت نام اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں گوریلوں کے خلاف لڑنے والی فوجوں کی نفری، جنگی قوت، امدادی قوت یعنی طیاروں اور توپخانوں کی سپورٹ، کمک، رسد اور دوسری سہولتوں کو پیشِ نظر رکھیے اور یہ بھی کہ اتنی بڑی فوجوں نے سالہا سال کی خونریزی کے بعد ہار مان لی۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ ویت نام میں امریکہ کی اتنی بڑی فوج کے دوش بدوش بیس لاکھ ویت نامی بھی لڑ رہے تھے۔

اس کے مقابلے میں ہم نے تین ایسے ڈویژن گوریلوں کے خلاف لڑانے جن کے پاس اسلحہ اور دیگر سامان گوریلوں سے کمتر تھا۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ان تین ڈویژنوں کے پاس اسلحہ کیا تھا اور انہیں دیگر کتنی کچھ سہولتیں میسر تھیں۔ اتنے وسیع اور اس قسم کے دشوار گزار ملک میں تین ڈویژن فوج کچھ بھی نہیں تھی۔ ان کے پاس امریکہ کی طرح ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ہیلی کاپٹر ہونے چاہئیں تھے تاکہ وہ کم بلندی پر اُڑ کر گوریلوں کو ڈھونڈتے اور اُوپر سے مشین گنیں فائر کرتے۔ ہمارے ان ٹروپس کو آرام میسر نہیں تھا۔ اُن کے لیے رات دن ایک جیسا تھا۔ دلدل ہو یا جنگل، خشکی یا پانی، کھڈنالے یا ٹیکریاں، انہیں لڑنا تھا، گوریلوں کی بُو پر بھاگنا تھا، کٹنا اور مرنا تھا۔ روز بروز اُن کی نفری کم ہوتی جا رہی تھی۔

جسمانی حالت کو تباہ کرنے کے لیے یہی تھکان (بغیر آرام) کافی تھی لیکن کچھ عناصر اور بھی تھے جو ٹروپس کو اَدھ موا کرتے جا رہے تھے۔ ان میں ایک تو بارشیں تھیں۔ وہ ساون کا موسم تھا۔ مسلسل بارشوں سے ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ انہیں برستی بارش میں بھی لڑنا پڑا۔ فضا میں مستقل

نمی اور پانی میں چلتے رہنے سے جوانوں کے پاؤں گلنے سڑنے لگے۔ بعض کے پاؤں کی حالت ایسی بُری ہوگئی کہ انہوں نے بوٹ اتار پھینکے اور پاؤں کی تکلیف کی اذیت برداشت کرتے رہے۔ جونکیں اور زہریلے کیڑے مکوڑے بہت ہی زیادہ تھے۔ ان کے کاٹنے سے ٹروپس ایسی بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے جو انہوں نے کبھی دیکھی نہ سُنی تھیں۔ خارش اور جلد کے امراض وبا کی صورت اختیار کر گئے۔ جوان جو بظاہر کسی مرض میں مبتلا نہیں تھے وہ کسی پہلو تندرست اور توانا نہیں تھے۔ تھکن، نمناک آب و ہوا اور ناکافی غذا نے ان کی جسمانی توانائی ختم کر دی تھی۔ چونکہ کمک نہیں تھی اس لیے آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جن افسروں اور جوانوں نے مارچ کے آخر میں ملٹری ایکشن شروع کیا تھا، ۱۶ دسمبر تک وہی لڑ رہے تھے اور جس قسم کی جنگ اور جن حالات میں یہ جنگ لڑ رہے تھے وہ بیان کیے جا چکے ہیں۔ زخمیوں اور مریضوں کو بروقت طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ مواصلاتی نظام ناکافی اور ناقص تھا۔ ڈھاکہ ہسپتال تک پہنچتے کئی دن لگ جاتے تھے۔ اکثر زخمی اور مریض راستے میں ہی مر جاتے تھے۔ ایسی اموات کی تعداد کم نہیں تھی جو طبی امداد نہ ملنے سے واقع ہوئیں۔

اِن احوال و کوائف کے اثرات صرف جسمانی نہیں ہوتے نفسیاتی بھی ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کو بے بسی اور کسمپرسی کی موت مرتا دیکھ کر جوانوں کے جذبات یقیناً مجروح ہوتے ہیں۔ امراض ایسے دشمن تھے جن کے خلاف جوان لڑ نہیں سکتے تھے۔ نفسیاتی حالت پر اثر انداز ہونے والے عناصر میں ایک تو یہ غیر یقینی جنگ تھی اور ایک یہ کہ ایسی جنگ کے لیے ان کے پاس ہتھیاروں اور ساز و سامان کی کمی تھی۔ سپلائی کا نظام نہ ہونے کے برابر اور ناقص تھا۔ وہ ساری دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ جس ملک کو وہ اپنا پاکستان کہتے تھے، وہ ان کا دشمن تھا۔ اُن کے ذہنوں میں دشمن کا جو تصور تھا وہ اس دشمن سے بہت ہی مختلف تھا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ اُن کا اعصابی نظام اس قدر مجروح ہو چکا تھا کہ اُن میں قوتِ برداشت نہیں رہی تھی۔

جسموں میں بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت بھی نہیں رہی تھی۔ اس جسمانی اور نفسیاتی کیفیت میں موت کا خوف بھی شامل تھا اور یہ احساس کہ وہ اپنے بھائیوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور یہ بھی کہ اُن کے بھائی اسلام کے بدترین دشمن کے ساتھ مِل گئے ہیں، ان کے جذبات کو مجروح کرتا تھا۔

ایک پہلو ایسا ہے جس کی طرف کتابیں اور مضامین لکھنے والے جرنیلوں اور دیگر رائٹروں نے توجہ نہیں دی۔ وہ یہ ہے کہ گوریلوں کو پناہ اور مدد سے محروم کرنے کے لیے ہمارے افسروں نے کسی گاؤں یا جھونپڑے کو تباہ یا نذرِ آتش کرنا تو دُور کی بات ہے، اُن میں داخل ہو کر تلاشی بھی نہیں لی۔ انڈونیشیا ویت نام اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں آپ نے دیکھا ہے کہ جس گاؤں پر شک ہُوا اُسے جلانا ضروری اور جائز سمجھا جاتا تھا اور جس مرد یا عورت پر شک ہوتا اُسے شک رفع کیے بغیر گولی مار دی جاتی تھی۔ گوریلوں کے خلاف ایسی وحشیانہ کارروائیاں روا سمجھی جاتی ہیں، بلکہ بعض اوقات کسی علاقے پر اس علاقے کی نہتی آبادی کو سزا دینے اور دہشت زدہ کرنے کے لیے حملہ کیا جاتا ہے۔ گھر جلا کر، قتلِ عام کر کے اور عورتوں کی آبروریزی سے اُن پر فوج کی دھاک بٹھائی جاتی ہے۔ اسے تعزیری مہم PUNITIVE EXPEDITION کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے ہمارے قبائلی علاقے میں ایسی مہموں میں بہت تباہی مچائی تھی۔

مشرقی پاکستان میں ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی جس میں سزا کے طور پر کسی دیہاتی کو محض شک میں مار دیا گیا ہو بلکہ یہاں تک ہُوا کہ ہماری کوئی سکشن دو چار گوریلوں کے تعاقب میں گئی۔ گوریلے کسی گاؤں میں چھپ گئے اور جب ہمارے فوجی وہاں گئے تو گوریلے دیہاتی لباس میں "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے باہر آگئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ مشکوک لوگ ہیں انہیں کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ وہ نہتے تھے، وہ مسلمان تھے اور یہ ڈر بھی کہ کوئی معصوم نہ مارا جائے۔

۲۵ مارچ کے ملٹری ایکشن میں کچھ بے گناہ لوگ زد میں آگئے تھے۔ ایکشن کی ابتدا کرنے والا ڈویژن بھڑ کا ہُوا بھی تھا۔ اس کے افسروں اور جوانوں نے

غیر بنگالیوں کے قتل کے انتقام میں اندھے ہو کر زیادتیاں کی تھیں نگران کی نوعیت کچھ اور تھی۔ قید سے آنے والے بہت سے افسروں اور جوانوں نے بتایا ہے کہ جنرل نیازی نے ایسٹرن کمانڈ کی کمانڈ لینے کے فوراً بعد ایک حکم نامہ تمام یونٹوں کے نام جاری کیا تھا جس میں سختی سے تنبیہہ کی گئی تھی کہ فوجیوں کے خلاف لوٹ مار اور آبروریزی وغیرہ کی شکایتیں موصول ہوئی ہیں۔ آئندہ کسی کے خلاف ایسی شکایت ملی تو اُس کے عہدے کا لحاظ کیے بغیر اُسے سنگین سزا دی جائے گی۔ اس حکم نامے میں ایسٹرن کمانڈ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ تمہارے مشن میں ظلم و تشدد شامل نہیں۔ تم از خود کسی کو سزا نہیں دے سکتے۔ شہری آبادی کا تحفظ بھی تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ تم گولی صرف اُس پر چلاؤ گے جو تم پر گولی چلائے گا۔ کسی نہتے پر ہاتھ اٹھانا اور کسی شہری یا دیہاتی کو پریشان کرنا جرم تصور ہوگا۔ ظلم و تشدد کی بجائے یہاں کے لوگوں کا اعتماد حاصل کرو اور یاد رکھو کہ یہ پاکستان ہے، کوئی دشمن ملک نہیں ہے۔

اس حکم نامے نے ہماری ہی فوج کو نقصان دیا لیکن اس حکم نامے کے ذریعے دیہاتیوں کو فوج کے ظلم و تشدد سے نہیں بچایا گیا تھا بلکہ انہیں ایک اور مصیبت سے نجات دلائی گئی۔ وہ یہ کہ وہ گوریلوں کو پناہ اور خوراک نہ دیں تو گوریلے ان پر ظلم و تشدد کرتے تھے۔ اگر ان کا ساتھ دیں تو فوج سزا دیتی تھی۔ چنانچہ یہ حکم جاری کر دیا گیا کہ فوج کسی دیہاتی کو محض شک کی بنا پر گرفتار یا پریشان یا ہلاک نہیں کرے گی۔ اگر اینٹی گوریلا اپریشن کے تمام طور طریقوں کو بروئے کار لایا جاتا تو مشرقی پاکستان میں کوئی گاؤں اور کوئی جھونپڑا نظر نہ آتا۔ اس آپریشن کی زد میں صرف وہ گاؤں آئے جنہیں گوریلوں نے مورچہ بنا لیا تھا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء سے سرحدوں پر بھارتی توپ خانوں کی گولہ باری پہلے سے بڑھ گئی اور حملے ہونے لگے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ٹروپس کو سرحدوں پر مورچہ بند کیا گیا۔ یہ کیفیت پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں ذکر افسروں اور جوانوں کی جسمانی اور نفسیاتی کیفیت کا ہو رہا ہے جو ۳ دسمبر کو تھی۔ اکتوبر کے آخر تک جوانوں کی جسمانی حالت

انہیں پاؤں پر کھڑا رکھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اِن میں سے جو مورچوں میں چلے گئے ان کے جسم اکڑنے لگے۔ پھرتی اور مستعدی ختم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ لڑے لیکن متحرک دفاع میں جس تیزی کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہیں رہی تھی۔ اس کا علاج صرف یہ تھا کہ انہیں آرام دیا جاتا اور ان کی جگہ تازہ دم ٹروپس بھیجے جاتے مگر تازہ دم ٹروپس کہاں سے آتے؟ ایسٹرن کمانڈ کے بار بار مطالبے کے باوجود اسلام آباد خاموش تھا یا اس قسم کا جواب ملتا تھا کہ تم بہت بہادر اور دلیر ہو، شاباش لڑتے رہو۔

سپاہی (افسر اور جوان) کی نفسیات کو سنوارنے اور بگاڑنے کے کچھ پہلو اور بھی ہیں۔ ان پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ فوجی انسان بھی ہوتا ہے۔ وہ ہمارے معاشرے کا فرد ہے۔ اُس کا ایک خاندان اور برادری بھی ہے۔ جسمانی اور نفسیاتی ضروریات کے علاوہ وہ معاشرتی زنجیروں میں بھی جکڑا ہوا ہے۔ ایسٹرن کمانڈ کے ٹروپس میں بہت سے افسر اور جوان ایسے تھے جو اپنے اہل و عیال سے ملے بغیر یا بھاگم بھاگ ان سے مل کر روانہ ہو گئے تھے۔ ان کے بہت سے گھریلو مسائل ان کے منتظر تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنہیں گھروں سے نکلے دو دو سال ہو گئے تھے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے عزیز و اقارب بیمار ہوئے، مر بھی گئے تھے۔ انہیں گھروں سے خطوط بھی نہیں ملتے تھے۔ گھروں سے دُوری، مغربی پاکستان سے دُوری اور یہ جسمانی حالت کسمپرسی کی صُورت اختیار کر گئی تھی اور جب آٹھ ماہ تک کوئی کمک نہ ملی تو ان کے ذہنوں میں یہ وہم گھر کر گیا کہ انہیں قوم نے فراموش کر دیا ہے۔

بھارتی ریڈیو کا پروپیگنڈا اپنا الگ اثر دکھا رہا تھا۔ ہمارے ٹروپس پر شرمناک الزامات عائد کیے جا رہے تھے۔ یہ ایک نفسیاتی حملہ تھا جو اُن پر اثر انداز ہو رہا تھا مگر زیادہ زہریلے اثرات ریڈیو پاکستان کے پروگراموں کے تھے جو بے معنی اور بے جان تھے۔ ریڈیو پاکستان کی طرف سے کوئی جوابی حملہ نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے محکمہ نشر و اشاعت سے ٹروپس بدظن اور بددل ہو گئے تھے۔

مشرقی پاکستان کی شکست کی ذمّہ داری ایسٹرن کمانڈ اور اس کے ٹروپس پر

عائد کرنے والوں کو مندرجہ بالا حقائق اور کوائف پر ایک نگاہ ڈال لینی چاہیئے۔ ہم قلمکار گھروں میں بیٹھ کر تبصرے لکھا کرتے ہیں اور ریٹائرڈ جرنیل آرام کرسیوں پر بیٹھ کر نہایت اطمینان سے تجزیے کیا کرتے ہیں اور جو رائے ذہن میں آتی ہے داغ دیتے ہیں، مگر ہماری رائے اور فیلڈ میں لڑنے والے فوجی کی رائے میں زمین اور آسمان جتنا فرق ہوتا ہے۔ جنگی قید سے آئے ہوئے ایک حوالدار سے میں نے کہا کہ وہ مختصراً اپنے ایکشن کو بیان کرے۔ میں نے اُس کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیئے اور صرف اتنا کہا — "میں بیان نہیں کر سکتا" — اور وہ واقعی بیان نہیں کر سکا تھا۔ یہ تھی اس جنگ کے متعلق صحیح رائے — "میں بیان نہیں کر سکتا"۔

ہمارے ملک میں فوجی کو، وہ افسر ہو یا سپاہی، انسان نہیں سمجھا جاتا۔ ہم اُنہیں اُن سبز پوشوں جیسا سمجھتے ہیں جن کے متعلق افواہ اُڑی تھی کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں آسمان سے اُترے تھے۔ ہم ان سے صرف مورال کے زور پر لڑنے کی توقع رکھتے ہیں مگر اُن عناصر کی طرف دھیان نہیں دیتے جو مورال کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں لڑنے والوں سے حکمرانوں نے یہی توقع رکھی تھی کہ وہ مورال کے زور سے لڑیں گے۔ اس توقع کی بنا پر انہیں کمک بھی نہیں دی گئی۔ بڑے ہتھیار بھی نہیں دیئے گئے۔ انہوں نے کمک مانگی تو پنجاب سے پولیس کی نفری اور پولیس کے افسر بھیج دیئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اُس وقت کے حکمران اور ان کے مشیر چاہتے ہی یہی تھے کہ اپنی فوج لڑنے کے قابل نہ رہے۔ ۱۴ دسمبر کے روز سول انتظامیہ نے استعفیٰ دے دیا۔ ڈاکٹر مالک ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں چلے گئے۔ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے پولیس افسران سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔

ایسٹرن کمانڈ کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کا انٹیلی جنس کا محکمہ بیکار ہو کے رہ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انٹیلی جنس میں مقامی افراد استعمال کیئے جاتے ہیں جو سرحد پار کی فوجی نوعیت کی خبریں لاتے ہیں۔ یہ لوگ چونکہ بنگالی تھے اس لیے ملٹری انٹیلی جنس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اس محکمے کے جو فوجی تھے وہ مغربی

پاکستانی ہونے کی وجہ سے وہاں کی زبان نہیں جانتے تھے۔ سرحد پار کی خبریں لانا تو کسی پہلو ممکن ہی نہیں تھا۔ انٹیلی جنس کے بغیر فوج تقریباً اندھی ہوتی ہے۔ سرحد کے دوسری طرف دشمن کی نقل و حرکت کے متعلق کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے ڈویژن اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹروں کو صرف اُس وقت دشمن کی چال کا علم ہوتا تھا جب دشمن اپنے پورے جنگی قہر کے ساتھ اُن کے سر پر آ جاتا تھا۔ اس کے برعکس ہماری کمانڈ اور دیگر ہیڈ کوارٹروں کا کوئی راز دشمن سے پوشیدہ نہیں تھا۔ آستین کے بے شمار سانپ موجود تھے جو منٹ منٹ کی خبر دشمن کو دیتے تھے۔ اس طرح صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اپنی انٹیلی جنس تھی ہی نہیں اور دشمن کی انٹیلی جنس ہمارے اردگرد اور ہمارے اندر موجود تھی۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام جب مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کیا گیا، مشرقی پاکستان میں ہمارے ٹروپس کی یہ حالت تھی جو تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ یہ افسر اور جوان اب کھلی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ وہ ایئر فورس اور بحری قوت سے محروم تھے۔ سمندر اور دریاؤں میں بھارتی نیوی کی اور فضا میں بھارتی ایئر فورس کی حکمرانی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ۳ دسمبر کے روز ایسٹرن کمانڈ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ اِدھر سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا تم کھلی جنگ کے لیے مورچہ بندی میں ردّوبدل کر لو اور بکھرے ہوئے ٹروپس کو اکٹھا کر لو۔

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ایسٹرن کمانڈ کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی تو کیا یہ اطلاع اتنی قبل از وقت تھی کہ سارے ملک میں اور دو ہزار میل لمبی سرحد پر بکھرے ہوئے ٹروپس کو نئی دفاعی ترتیب میں لایا جا سکتا؟ اس کے لیے اگر ایک ہفتہ نہیں تو چار روز کا نوٹس دیا جاتا۔ ذرائع آمدورفت مخدوش اور راستے مسدود تھے۔ اتنی تیزی سے نقل و حرکت ناممکن تھی۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ وہاں تو ۲۰/۲۱ نومبر سے ہمارے ٹروپس کھلی جنگ لڑ رہے تھے اور بڑے شدید اور طاقتور حملے پسپا کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی نفری ملک کے اندر اینٹی گوریلا جنگ لڑ رہی تھی۔ یہاں ہمیں

ہائی کمانڈ کا وہ حکم یاد آتا ہے جو ایسٹرن کمانڈ کو ان الفاظ میں دیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو تاکہ بھارت اور مجیب کو مشرقی پاکستان کے اندر ایسی جگہ نہ مل سکے جہاں وہ بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دے۔ اس حکم کے تحت مشرقی پاکستان کے ٹروپس متحرک جنگ لڑتے رہے کیونکہ انہیں ایک ایک انچ کا دفاع کرنا تھا۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے چپے چپے کا دفاع ملک کے اجتماعی دفاع کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ بعض حالات میں کوئی غیر اہم علاقہ چھوڑنا بھی پڑتا ہے تاکہ دفاعی مورچوں کو بکھرنے سے بچایا جا سکے۔ دشمن کے حملوں کا دم خم توڑ کر جب جوابی حملہ کیا جاتا ہے تو چھوڑے ہوئے علاقے از خود واپس آجاتے ہیں۔ مثلاً، دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز جیسور سے اپنے مورچے ہٹا لیے گئے تھے۔

دشمن نے جیسور کی فتح کو بہت اُچھالا اور اس کے بڑے چرچے کیے تھے۔ پاکستان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی جیسور کے متعلق وہی مواد شائع کیا گیا ہے جو بھارتی پروپیگنڈے سے حاصل کیا گیا ہے۔ جیسور کی حقیقت یہ تھی کہ وہاں بھارت کی نمبر ۲ کور کے دو ڈویژنوں نے حملہ کیا تھا جنہیں طیاروں کے علاوہ کور آرٹلری کی سپورٹ حاصل تھی۔ دو ڈویژنوں کے ایسے شدید حملے کو روکنے کے لیے ہمارے مورچوں میں نفری بہت کم تھی اور اس نفری کی جو کیفیت تھی وہ اُوپر بیان کی جا چکی ہے۔ دشمن کے اِن ڈویژنوں کے آگے فریدپور ایک اہم مقام اور ریلوے سٹیشن تھا۔ اس محاذ کے عینی شاہدوں نے بتایا ہے کہ جنرل نیازی نے ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور ٹروپس کو پیچھے کر کے اس طرح پھیلا دیا کہ دشمن کی کور دو حصوں میں بٹ گئی۔ اگر آپ پاکستان اور بھارت میں چھپنے والی کتابوں میں جنگ کے نقشے پر جیسور کے حملے کے رُخ کو دیکھیں تو یہ دو حصوں میں بکھرا ہُوا نظر آتا ہے۔ ایک حصہ درسنا سے جھینیدا کے جنوب میں فریدپور کی طرف اور دوسرا دولت پور اور کھُلنا کی طرف چلا گیا ہے۔ اگر اس حملہ آور فورس کو یوں توڑا نہ جاتا تو یہ فریدپور تک دو دنوں میں پہنچ جاتی مگر اس صُورت میں اُسے سات دن لگے کیونکہ اُس کے دونوں رُخوں کے سامنے ہمارے ٹروپس کی مزاحمت آگئی تھی۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ ۲ دسمبر تک تو وہ ایک ایک انچ کے دفاع میں لڑتے رہے اور بکھر گئے۔ اچانک انہیں یہ حکم دیا گیا کہ بھارت کا حملہ روکنے کے لیے کھُلی جنگ کی دفاعی مورچہ بندی کر و۔ ۴ دسمبر کی صبح ان پر ہر طرف سے، آسمان سے، سمندر اور دریاؤں سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس صُورتِ حال میں جو جہاں تھا وہیں مورچہ بند ہو گیا۔ پیادہ جوان ٹینکوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ ایک ایک کمپنی پر ایک ایک بریگیڈ نے اور ایک ایک بٹالین کی پوزیشن پر پورے پورے ڈویژن نے حملہ کیا۔ ٹینکوں اور توپوں کی قیامت خیز گولہ باری اُوپر سے طیاروں کے راکٹ، بم اور مشین گنیں۔ اپنے ٹروپس کی جو کیفیت تھی وہ بیان کی جا چکی ہے۔ ایسے درماندہ اور بکھر کر لڑتے ہوئے ٹروپس کو جو کمپنی کمپنی اور پلاٹون پلاٹون کی صورت میں لڑ رہے تھے، بٹالین کمانڈر بھی اپنے رابطے اور اپنی کمان میں نہیں رکھ سکتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایسٹرن کمانڈ اگر یوں نکرتی تبدیلی نہ ہوتا اور اگر یہ چال چلتی تو فلاں کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی مگر یہ رائے دینے والے یہ نہیں سوچتے کہ جنگی چالیں وہاں چلی جاتی ہیں جہاں ضرورت کے مطابق یا دشمن کے حملے کے مطابق فوج پوری ہوتی ہے۔ اس کے پاس اسلحہ پورا ہوتا ہے، مواصلاتی نظام رواں ہوتا ہے۔ ایئر فورس اور نیوی کی سپورٹ ہوتی ہے۔ ٹینک اور توپخانہ رجمنٹیں ہوتی ہیں اور جہاں ٹروپس جسمانی لحاظ سے تازہ دم اور ذہنی لحاظ سے زندہ و بیدار ہوتے ہیں۔

جنگ شروع ہُوئی تو ہمارے مشرقی پاکستان کے ٹروپس کے مورال میں اس وجہ سے جان آگئی کہ مغربی پاکستان سے حملہ ہو گیا ہے، لہٰذا اب وہ دشمن سے اِدھر بھی دو دو ہاتھ کریں گے۔ مغربی محاذ کے متعلق ایسٹرن کمانڈ کو بے بنیاد خبریں سُنائی جاتی رہیں۔ انہیں یہ بتایا ہی نہ گیا کہ اِدھر کا حملہ بے جان ہو چکا ہے، دشمن شکرگڑھ کی پوری تحصیل لے چکا ہے، راجستھان میں دشمن ہمارے ایک ڈویژن کو پسپا کر کے بے شمار علاقے پر قابض ہو چکا ہے اور کوئی بعید نہیں

کہ دشمن لاہور کراچی ریلوے لائن اور سڑک تک آجاتے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے ٹروپس کو ایک دھوکہ اور بھی دیا گیا۔ وہ یہ کہ انہیں خوشخبری سنائی گئی کہ چین ہماری حمایت میں لڑنے کے لیے آ رہا ہے۔ پھر انہیں یہ اطلاع دی گئی کہ چین ہماری طرف سے جنگ میں شریک ہو گیا ہے۔ ان خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر ہمارے افسر اور جوان اور زیادہ بے جگری سے لڑنے لگے۔

ہمارے مشرقی پاکستان میں لڑنے والے ٹروپس یہ سُن کر خوش ہوئے کہ مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا گیا ہے۔ انہیں بجا طور پر توقع تھی کہ اب مشرقی پاکستان سے بھارت کا جنگی دباؤ کم ہو جائے گا۔ صرف افسروں کو معلوم تھا کہ پاکستان کی دفاعی پالیسی یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہوگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مغربی پاکستان سے بڑا ہی زوردار حملہ کیا جائے گا اور اتنا زیادہ دباؤ ڈالا جائے گا کہ بھارت کی افواج کو جان کے لالے پڑ جائیں گے اور وہ مشرقی پاکستان سے توجہ ہٹا لیں گی۔

اس دفاعی پالیسی کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان میں لڑنے والے ہمارے افسروں کی خوشی قدرتی تھی۔ انہیں امید تھی کہ حملہ اس پالیسی کے مطابق زوردار ہُوا ہوگا اور پاک فوج اور پاک فضائیہ بھارتی فوج اور فضائیہ کا بہت بُرا حال کر رہی ہوں گی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ مغربی پاکستان سے رسمی سا حملہ کیا گیا ہے جس سے ہمارے حکمران عوام کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ہم بھارت کو ناکوں چنے چبوا دیں گے۔

ہمارے بادشاہ مشرقی پاکستان میں لڑنے والے پاکستانیوں کو ہی نہیں پوری قوم کو دھوکہ دے رہے تھے۔ ہم یہی حقیقت واضح کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان ایک دھوکے کا شکار ہُوا ہے۔ مغربی محاذ کے بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ اپنی فوج کو بھی دھوکے میں رکھا گیا تھا۔ ان تمام واقعات کو چند صفحات پر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ صرف ایک محاذ کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ یہ حسینی والا کا محاذ تھا۔

۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام حملہ شروع ہُوا۔ ابتدا توپ خانے کی گولہ باری سے کی گئی۔ سیکنڈ ایشلان جو اگلے مورچوں اور توپخانے وغیرہ کو ایمونیشن اور دیگر سامان سپلائی کرنے کا ذِمّہ دار ہوتا ہے، چوکس تھا کہ جونہی آگے سے کسی چیز کی ڈیمانڈ آئے تو فوراً سپلائی کی جائے۔ حسینی والا محاذ کے سیکنڈ ایشلان کے دو صوبیداروں اور ایک نائب صوبیدار سے ملاقات ہُوئی۔ تینوں نے بتایا کہ وہ حملے کے دوسرے دن ہی سمجھ گئے تھے کہ اُن کے ساتھ کھیل تماشہ" کیا جا رہا ہے۔

اسُ کھیل تماشے" کی تفصیل یہ ہے کہ (اِن تینوں افسروں کے بیان کے مطابق) انہوں نے جب دیکھا کہ جس رفتار سے گولہ باری اور چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ کی جا رہی ہے اس سے تو صبح تک ایمونیشن ختم ہو جائے گا۔ رات بھر جنگ جاری رہی۔ ان میں سے ایک صوبیدار ٹرک لے کر رات کو ہی پیچھے اُس ریلوے سٹیشن پر چلا گیا جہاں ایمونیشن کے انبار موجود ہونے چاہئیں تھے، لیکن اُسے جواب ملا کہ ایمونیشن صبح آٹھ بجے ملے گا۔ صوبیدار نے بتایا کہ ایمونیشن اس قدر زیادہ فائر ہو رہا تھا کہ صبح تک بالکل ختم ہو سکتا تھا۔ صوبیدار کو حکم دیا گیا کہ وہ واپس چلا جائے ایمونیشن صبح ملے گا۔

صوبیدار واپس آگیا اور صبح پھر اُس ریلوے سٹیشن گیا۔ اب اُسے جواب ملا کہ ایمونیشن لانے والی ریل گاڑی ابھی آئی نہیں۔ شام چار بجے آئے گی۔ تصور فرمائیے۔ ہماری فوج نے حملہ کیا ہے۔ جنگ لڑی جا رہی ہے اور ایمونیشن دینے والے کہہ رہے ہیں کہ صبح آنا شام آنا۔ آخر شام کو ایمونیشن مل گیا لیکن ایمونیشن راشن کر دیا گیا تھا، یعنی کم دیا گیا اور بتایا گیا کہ یہ اتنے دنوں کے لیے ہے۔ اس سے پہلے اور نہیں ملے گا۔

اِس جنگ کے دوران اخباروں نے عجیب و غریب اور بڑا ہی شرمناک رویّہ اختیار کر لیا۔ محاذوں پر اپنی فوج لڑ رہی تھی اور لاہور کے سرکاری اخبار، خصوصاً پیپلز پارٹی کا ترجمان "مساوات" فوج کے خلاف لکھ رہے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھارت کے اخبار ہوں۔ اخبار یہ سب کچھ خود نہیں لکھ رہے تھے۔ ان سے لکھوایا جا رہا تھا۔ میں حسینی والا کے محاذ پر گیا اور آنکھوں دیکھا حال لکھا۔ یہاں اپنے گیارہویں ڈویژن نے دریائے ستلج کا جو ڈیفنس

توڑا اور جس طرح "قیصرِ ہند" لیا تھا وہ ایک بے مثال کارنامہ تھا۔ آدھے گھنٹے میں سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لے کر لیفٹیننٹ کرنل تک پانچ افسر شہید ہو گئے تھے۔

میں نے اس بے مثال حملے اور حملے کی رات کی لڑائی کی تفصیلات لکھ کر "امروز" کے ایڈیٹر کو اشاعت کے لیے دیں۔ ایڈیٹر صاحب نے انکار کر دیا۔ "پاکستان ٹائمز" کو دیں اور کہا کہ فوج کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، آپ یہ چھاپ دیں تاکہ قوم کو پتہ چلے کہ اپنی فوج کس طرح جذبۂ حب الوطنی سے لڑ رہی ہے مگر "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹوریل سٹاف کے اِن صاحب نے طنزیہ انداز سے میرا مضمون شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے یہ مضمون "حکایت" شمارہ فروری ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

یہی اخبار تھے جنہوں نے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک فوج کے افسروں اور جوانوں کو آسمان سے اُترے ہوئے اللہ کے سبز پوش سپاہی بنا دیا تھا اور مدح سرائی میں انتہا پسندی کا یہ عالم کہ اس قسم کے بے بنیاد واقعات بھی لکھ مارے کہ سیالکوٹ سیکٹر میں ہمارے جوان سینوں کے ساتھ بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے ساتھ ٹکرا گئے تھے۔ اس "کارنامے" پر جنرل ٹکا خان کا لیبل لگایا گیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جنگ ہوئی ہی نہیں تھی۔ ٹینکوں کی جنگ چونڈہ کے میدان میں ہوئی تھی اور اس بکتر بند جنگ کے ساتھ جنرل ٹکا خان کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ شروع ہوتے ہی اخباروں کا رویّہ اپنی فوج کے خلاف ہو گیا۔ کیا اخباروں کا یہ رویّہ آزادانہ تھا؟ بالکل نہیں۔ اخباروں کو یہ معاندانہ رویّہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پریس ٹرسٹ کے اخبار تو حکم کے پابند تھے، پیپلز پارٹی کا اخبار "مساوات" فوج کا مورال توڑنے میں سب سے آگے تھا۔ اخباروں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا کہ اپنی فوج کا مورال توڑا جائے تاکہ اس کے حملے میں جان نہ رہے اور بھارت کو مشرقی پاکستان کے محاذ سے فوج نہ نکالنی پڑے اور وہ اطمینان سے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر سکے۔

قرائن اتنے واضح ہیں کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں رہتا کہ ہماری اُس وقت کی برسرِ اقتدار حکومت نے اپنا دایاں بازو اپنے ہاتھ سے کاٹ کر کُتّوں کے آگے پھینکا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کی مسلح افواج کو بڑی ہی سنگین سزا بھگتنی پڑی۔ اُدھر آدھا ملک دشمن لے گیا اِدھر جوابی حملہ ناکام رہا، بلکہ ناکام کر دیا گیا۔ افواج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ آدھی فوج قید ہو گئی۔ برِ صغیر میں مسلمانوں کو جو عسکری برتری حاصل تھی، وہ گئی۔ روایت ختم ہو گئی۔ جگ ہنسائی الگ ہوئی، اپنوں نے الگ رسوا کیا۔ جس کے منہ میں جو آیا، کہا۔ دماغ میں جو آیا اخباروں اور رسالوں میں لکھ ڈالا۔ دشمن کی توپوں کے دہانے بند ہوتے تو اُس کے ایجنٹوں کے منہ کھل گئے تقریروں اور تحریروں میں افواج کے خلاف وہ طومار باندھے گئے کہ قوم کے دلوں سے فوج کا اعتماد اُٹھ گیا۔ قوم کو اپنی افواج سے متنفر کرنے کی اس مہم میں پاکستان کے بعض قلمکاروں نے "ادبی محفلوں" میں اور اپنے زیرِ اثر جریدوں کے ذریعے روس اور بھارت کے پروپیگنڈے کو بڑی کاوش اور ڈھٹائی سے نشر کیا۔ پاک فوج کو زانیوں، شرابیوں، لٹیروں اور کرائے کے قاتلوں کی فوج کہا۔ ہمارے ملک کے ایک کرم فرما مدیر نے یہاں تک لکھ مارا کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے شہیدوں اور غازیوں کے کارنامے محض افسانے تھے۔ اس مدیر نے جنگی ترانوں کا بھی مذاق اُڑایا اور اپنے غیر ملکی آقاؤں سے اُجرت وصول کی۔ جنہیں فوجی اور جنگی امور کی ذرّہ بھر سُوجھ بُوجھ نہیں تھی وہ بھی جنگی مبصر بن گئے۔ پُرانے زمانے کے ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل نے پاکستان کے ایک انگریزی اخبار میں پاکستان کی مسلح افواج کو ایک بے حد لمبے مضمون میں جی بھر کے رُسوا کیا۔ یہ مضمون کئی قسطوں میں شائع ہُوا۔ اور جب صحیح معنوں میں جنگی اہلیت رکھنے والے تین چار فوجی افسروں نے اس کے جواب میں مضامین بھیجے تو اس ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل نے اپنے مضمون کی آخری قسط میں اپنی "فوجی قابلیت" کا ڈھنڈورا پیٹا اور مضحکہ خیز دلائل سے یہ رُعب جمانے کی کوشش کی کہ "میں ایک بٹالین کی کمان کر چکا ہوں۔ مجھ سے زیادہ جنگی امور کو کون سمجھ سکتا ہے" —— اور اُس نے اپنے مضمون کے جواب میں آئے ہوئے تمام مضامین ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیئے۔

اس طرح شکست کی ذمہ داری افواج پر ڈال کر تمام تر لعن طعن افواج پر مرکوز کر دی گئی۔ قوم کو یہ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی گئی کہ شکست کی ذمہ داری افواج پر نہیں بلکہ اُن پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے دشمن کی طاقت کو نظرانداز کیا، اپنی فوج کو اس کے مطابق اسلحہ بارُود و نفری اور جنگ کے دیگر لوازمات نہ دیئے، بروقت بیدار نہ ہوئے اور اپنی فوج سے اُس وقت حملہ کرایا جب میدان دشمن کے ہاتھ تھا اور وہ اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ ہمارا حملہ روک بھی سکتا تھا اور ہمیں چاروں شانے چت گرانے کے لیے جوابی وار بھی کر سکتا تھا۔ ہماری مسلح افواج کا قصور یہ تھا انہوں نے حکم مانا اور ایسی جنگ میں کُود گئیں جو شروع ہونے سے پہلے ہی ہاری جا چکی تھی۔

دشمن نے جنگ جیت لی اور فوجیں واپس لے گیا۔ فوراً ہی اُس نے پروپیگنڈے کے میدان میں اپنے ففتھ کالم کی فوج اتار دی۔ بھارت کی اس فوج کے ہراول دستے میں پاکستان کے "دانشور" اور "قلمکار" تھے۔ ان میں ایک گروہ تو کھلم کھلا پاکستان اور افواج کے خلاف زہر اُگلنے لگا اور دوسرا گروہ پیار کا پرچار کرنے لگا۔ مقصد دونوں کا ایک تھا ـــ "پاکستان کو ہندوستان بنانا۔"

اس زہرافشانی کا اثر فوجوں پر جو ہُوا سو ہُوا، سب سے بڑا نقصان یہ ہُوا کہ پوری قوم خود اعتمادی سے محروم ہو گئی۔ تخریب کاروں کو یہ کامیابی صرف اس لیے حاصل ہُوئی کہ خود اپنی سرکار نے قوم کو اعتماد میں نہ لیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے بھی قوم کو اصل صورتِ حال سے بےخبر رکھا اور جنگ کے بعد بھی خاموشی اختیار کر کے قوم کو دشمن کے پروپیگنڈے کے رحم و کرم پر پھینک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ محبِ وطن پاکستانی آج بھی مضطرب اور پریشان ہیں اور وہ اس سوچ میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ پاکستان کا انجام کیا ہوگا؟ ضرورت یہ تھی کہ قوم کو اعتماد میں لیا جاتا اور حقائق سے آگاہ کیا جاتا۔

جنگ کے فوراً بعد وہ حکومت ختم ہو گئی جو شکست کی ذمہ دار تھی۔ اقتدار نئی حکومت نے سنبھالا جس نے اپنے آپ کو عوامی حکومت کہا۔ حمود الرحمٰن کمشن بٹھایا، جس کی سرگرمیوں کی خبریں اور تصویریں اخباروں میں چھپتی رہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ یہ کمشن جس پر ساری قوم کی نظریں لگی ہُوئی تھیں کاغذوں کے انبار میں کہیں روپوش ہو گیا اور قوم منہ دیکھتی رہ گئی۔ دشمن کے ایجنٹ اُبھر کر میدان میں آ گئے اور اب کے انہوں نے یہ بھی حتم و یقین سے کہا کہ حمود الرحمان کمشن کی رپورٹ دبا لینے کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ برسرِ اقتدار پارٹی کے سربراہ بھی اس شکست کے ذمہ دار ہیں۔ یہ الزام کہاں تک صحیح ہے؟

اس سوال کا جواب ذوالفقار علی بھٹو ہی دے سکتے تھے لیکن انہوں نے کمشن کی رپورٹ کو دبائے رکھا۔ پھر "اللہ والے" آ گئے۔ قوم کو بجا طور پر توقع تھی کہ جنرل ضیاء پہلا کام یہ کریں گے کہ حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ منظرِ عام پر لائیں گے لیکن وہ بھی چُپ رہے۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں جنہیں مرحوم جنرل صاحب بےنقاب کر کے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ المیۂ مشرقی پاکستان میں کچھ جرنیل بھی ملوّث تھے۔ ضیاء مرحوم نے سوچا کہ مشرقی پاکستان تو واپس آنے سے رہا تو کیوں نہ اس اتنے بڑے حادثے کو پچھلی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ پھر یہی ہوتا رہا۔

یاد رکھیے کہ ۱۹۷۱ء کی شکست عارضی تھی۔ ایک بار ہار جانے کا مطلب ہمیشہ کی ہار نہیں ہوتا۔ اس فلسفے کو دشمن بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا، لہٰذا اُس نے پروپیگنڈے کے زور پر ہماری شکست کو مستقل کر دیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستانی قوم کا جذبہ اور خود اعتمادی بالکل ختم ہو جائے تاکہ وہ آئندہ بھارت کے منہ آنے کی جرأت نہ کرے۔ دشمن کی ان کوششوں کو ناکام کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی شکست کا سامنا کریں اور اس کے اسباب معلوم کریں۔ پھر ان کے مطابق کوتاہیوں اور خامیوں کا سدِباب کر کے اپنے دفاع اور استحکام کے تقاضے پورے کریں۔ اگر اب بھی ہم بیدار ہو جائیں تو مشرقی پاکستان کی تاریخ اپنے آپ کو پاکستان کے کسی اور صوبے میں نہیں دہرائے گی۔

میں کہہ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان سے بھارت کا دباؤ کم کرنے کے لیے ۳ دسمبر کی شام مغربی پاکستان سے حملہ کیا گیا۔ اس حملے کا حکم دینے والوں میں نہ خلوص تھا نہ عزم۔ ہم صرف شکرگڑھ کی مثال پیش کرتے ہیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ اپنی

فوج کو کس طرح ناکام کیا گیا۔ پوری کی پوری شکرگڑھ تحصیل دشمن کو دے دی گئی تھی۔

قوم کو ایک سال بعد یہ خبریں تو سنائی گئیں کہ بھارت کی فوج شکرگڑھ خالی کر گئی ہے۔ اخبار میں تباہ شدہ دیہات کی تصویریں بھی شائع کی گئیں۔ اُن وزراء کی تصویریں بھی شائع کی گئیں جنہوں نے اِن دیہات کے دورے کیے اور پُرجوش تقریریں کیں۔ اپنے فوجیوں کو وہاں پُل اور سڑکیں بناتے ہُوئے بھی تصویروں میں دکھایا گیا مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ دشمن اس تحصیل پر قابض کیونکر ہُوا تھا اور اس کا ذمّہ دار کون تھا اور اگر یہ ہماری کسی لغزش کا نتیجہ تھا تو کیا آئندہ ایسی لغزش تو نہیں ہوگی؟ مگر قوم کو اپنی مظلومیت کے سوا کچھ بھی نہ بتایا گیا۔ اسی سیکٹر میں اپنے ایک جوان کو بے مثال بہادری کے صلے میں نشانِ حیدر بھی دیا گیا۔ ستارۂ جرأت اور تمغۂ جرات بھی بے شمار دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پوری تحصیل دشمن کو دے دی گئی۔ قوم کو آج تک یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ یہ تحصیل دشمن کو کس بہادری کے صلے میں دی گئی تھی؟

جو حقائق سرکاری طور پر سامنے آنا چاہئیں تھے وہ ہم نے اپنے طور پر فراہم کیے ہیں۔ شکرگڑھ کے میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام ہماری افواج کو مغربی پاکستان سے حملے کا جو حکم دیا گیا تھا وہ کس کیفیت، کن حالات میں اور کون سے پس منظر میں دیا گیا تھا۔

جنگ کا تعلق سیاست کے ساتھ ہوتا ہے۔ جنگ قوم کے سیاسی عزائم اور حقوق کے تحفظ اور تکمیل کے لیے لڑی جاتی ہے۔ جنگ لڑنے یا نہ لڑنے کا فیصلہ مرکزی حکومت کرتی ہے۔ افواج اس کا آلۂ کار یا ہتھیار ہوتی ہیں جنہیں حکومت ہائی کمان کے ذریعے استعمال کرتی ہے۔ حکومت ایک الگ تنظیم ہوتی ہے اور ہائی کمان الگ تنظیم مگر پاکستان میں مرکزی حکومت اور ہائی کمان ایک ہی تنظیم تھی اور اس تنظیم پر صرف ایک فردِ غالب تھا جو سربراہِ مملکت بھی تھا اور افواج کا سپریم کمانڈر بھی۔ وہ بیک وقت سیاسی لیڈر بھی تھا اور فوجی لیڈر بھی مگر اصل میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کا ذہن سیاسی تھا نہ فوجی، شرابی ضرور تھا۔ اُس نے اتنی

بڑی اور اتنی نازک حیثیت ذاتی قابلیت اور پُرخلوص جدوجہد سے حاصل نہیں کی تھی بلکہ اُسے اس کرسی پر دھرا گیا تھا۔ یہ ایّوب خان کا کارنامہ تھا جو اُس نے قوم کو اُن احتجاجی ہنگاموں کی پاداش میں سزا دینے کے لیے سرانجام دیا تھا جو قوم نے اُسے گدّی سے اُتارنے کے لیے بپا کیے تھے۔

یحییٰ خان اُن بادشاہوں کی قبیل میں سے تھا جو ہجو پر پھانسی اور مدح پر انعام و اکرام دیا کرتے تھے۔ اُس نے میجر جنرل کے عہدے کو مغل بادشاہوں کی طرح پنج ہزاری اور ہفت ہزاری وغیرہ کا درجہ دے دیا۔ ایک بار اُس نے ایک ہی دن میں گیارہ میجر جنرل بنائے تھے۔ پاک فوج کے ایک افسر نے یہ خبر سُن کر کہا تھا ”ہم نے ایک ہی بار اتنے لانس نائک بنتے بھی کبھی نہیں دیکھے تھے“ ــــ قریبی حلقے بتاتے ہیں کہ یحییٰ خان نے بعض ترقیاں ازراہِ مذاق بھی دیں۔ مثلاً ایک کرنل کو وہ غلطی سے بریگیڈیئر کہہ بیٹھا۔ کرنل نے بصد احترام تصحیح کی کہ حضور، مَیں کرنل ہُوں۔ یحییٰ خان نے ہنس کر کہا ”کل سے تم بریگیڈیئر ہو“ ــــ اور وہ ہنسی ہنسی میں بریگیڈیئر بن گیا۔

فضا خوشامد، چاپلوسی اور موقع شناسی کی بن گئی۔ کئی فوجی افسر اپنے فرائض کو نظرانداز کر کے یحییٰ خان کے درباری بن گئے۔ عسکری قابلیت، سینیارٹی ترقی کے لیے سلیکشن بورڈ وغیرہ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ پھر یحییٰ خان کا دربار دو جرنیلوں کے قبضے میں آگیا۔ ایک تھا جنرل پیرزادہ اور دوسرا جنرل حمید۔ جنرل حمید چیف آف سٹاف بنا اور پیرزادہ یحییٰ خان کے پرسنل سٹاف میں آگیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مشیرِ خاص تھا۔ پیرزادہ ایّوب خان کا پروردہ تھا۔ بریگیڈیئر کے عہدے پر اُس کا ملٹری سیکرٹری تھا۔ وہ اچانک دل کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ صحت یاب ہونے پر میڈیکل بورڈ نے اُسے ایسے زمرے میں رکھ دیا جہاں اُسے مزید ترقی نہیں مل سکتی تھی۔ گویا طبّی نقطۂ نگاہ سے وہ کوئی نازک اور دشوار ذمّہ داری سنبھالنے کے قابل نہیں رہا تھا مگر یحییٰ خان نے پاکستان کے تخت پر بیٹھتے ہی پیرزادہ کو میجر جنرل بنا کر اُسے جی ایچ کیو کی انتہائی نازک اور پیچیدہ پوسٹ، ایجوٹنٹ جنرل کی دے دی۔ پھر اُسے اپنے

پرسنل سٹاف میں لے لیا۔

یحییٰ خان عیاشیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور پیرزادہ وسیع تر اختیارات حاصل کر کے اُبھرتا آیا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پیرزادہ اور یحییٰ خان میں صرف یہ فرق تھا کہ یحییٰ خان صدر کہلاتا تھا، عملاً ملک کی صدارت (اور قسمت) پیرزادہ کے ہاتھ میں تھی۔ ہمیں ایک بریگیڈیئر یاد آتا ہے جو ۱۹۷۱ء میں ہائی کمان اور قصرِ شاہی سے وابستہ تھا۔ اس سے بات ہوئی تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا — "ہم دیکھ رہے تھے کہ پاکستان سیدھا بھارت اور روس کے پیٹ میں جا رہا ہے مگر شام کے بعد ایوانِ صدر میں شراب پانی کی طرح بہتی تھی۔ ہم حکم کے پابند تھے۔ ہم اگر بولتے تو ہمیں یہی ایک جواب ملتا —— وردی اُتار دو اور گھر چلے جاؤ۔"

اسی ایک بریگیڈیئر کے نہیں، دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد ساری فوج کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ جنرل پیرزادہ منہ چڑھا شہزادہ تھا۔ اُس کے لامحدود اختیارات سے فوجی اور سول افسر خائف رہتے تھے۔ وہ جس قدر نااہل تھا، فیصلوں میں اُسی قدر آزاد تھا۔ یحییٰ خان کے سوا مرکزی حکومت اور ہائی کمان کا ہر ایک افسر اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

یحییٰ کے دربار کا دوسرا کرتا دھرتا جنرل عبدالحمید خان تھا۔ یہ ایک صاف ستھرے ذہن کا سیدھا سادہ فوجی تھا۔ حکم اور ڈسپلن کا پابند۔ کالج میں یحییٰ خان کا کلاس فیلو تھا۔ اُسے یحییٰ خان نے چیف آف سٹاف بنایا اور اپنے سانچے میں ایسا لیا کہ وہ یحییٰ خان کا ہم پیالہ بن گیا۔ صدرِ مملکت کی خوشنودی کی خاطر اس نے اپنا وہ کردار جس کی بدولت وہ نیک نام تھا، قربان کر دیا۔ اتنے میں پیرزادہ قصرِ شاہی میں آگیا اور صدرِ مملکت کے اعصاب پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا۔ اُس وقت جنرل حمید کا درجہ صدر کے بعد کا تھا۔ یہ درجہ چھن گیا تو حمید اور پیرزادہ میں رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ اس سے صورت یہ پیدا ہو گئی کہ جب بھارت پاکستان کو ختم کرنے کے لیے اپنے ملک کو فوجی کیمپ اور گولہ بارود کا سٹور بنا رہا تھا اور فوجیں مشرقی پاکستان کے اردگرد جمع کر رہا تھا، اُس وقت

پاکستان کے قصرِ صدارت (جو ہائی کمان بھی تھی) کے اندر دو جرنیل اقتدار کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یحییٰ خان کی روزمرّہ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ صرف دو گھنٹے دفتر میں بیٹھتا اور ضروری فائلیں گھر منگوا لیتا تھا مگر ان فائلوں کو اس نے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ شام کے بعد تو وہ ہوش میں ہی نہیں ہوتا تھا۔

یہ تو تھی ہماری صدارتِ مملکت اور ہائی کمان۔ مسلح افواج کی کیفیت یہ تھی کہ نفری تھوڑی، جدید ہتھیار ناپید، ملک میں جو واحد اسلحہ ساز فیکٹری تھی وہ اس کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں کے لیے سونے کی کان بنی ہوئی تھی۔ لُوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ اس فیکٹری میں جو بدعنوانیاں اور دھاندلیاں ہو رہی تھیں انہیں اخباروں میں بھی بے نقاب کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں فیکٹری کی انتظامیہ کا ایک جواب ایک اخبار میں شائع ہُوا اور بات گول ہو گئی۔ ہماری افواج کو بڑے ہتھیار امریکہ سے ملتے تھے جو ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ملنے بند ہو گئے تھے۔ سپیئر پارٹس تک بھی نہ ملے۔ یہ ضرورت چین کے ہتھیاروں سے پوری کی جانے لگی مگر دسمبر ۱۹۷۱ء تک یہ کمی پوری نہ کی جا سکی۔ دوسرے ممالک سے کچھ اسلحہ خریدا گیا۔ ایک تو کمی پوری نہ ہوئی، دوسرے یہ مشکل پیش آگئی کہ مختلف ممالک کے مختلف اقسام کے ہتھیاروں کی وجہ سے فوج میں عسکری نوعیت کی دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ ایک کھچڑی سی بن گئی تھی جو میدانِ جنگ میں کئی ایک خرابیوں کا باعث بنی۔

فوج کی نفری پوری کرنے کے لیے مجاہد فورس بنائی گئی۔ اس میں کالجوں کے لڑکے اور معاشرے کے ہر شعبے سے جوان بھرتی کیے گئے۔ ان میں دکاندار بھی تھے، کاشتکار بھی، وکیل بھی اور کلرک بھی۔ ان میں بیشتر جذباتی لوگ تھے اور باقی کالجوں کے وہ طلبہ جو ایک آرڈی ننس کے تحت بھرتی کر لیے گئے۔ جنگ لڑنے کے لیے پیشہ ور سپاہیوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ایسے جوانوں کی جنہیں سالہا سال ٹریننگ دے کر اور جنگی مشقیں کرا کے پیشہ ور سپاہی بنا لیا جاتا ہے۔ مجاہد فورس جو ہمارے ہاں بنائی گئی، اُس کنوئیں کی مانند تھی جو آگ لگنے پر کھودا جاتا ہے۔ اس فورس کو معمولی سی ٹریننگ دی گئی۔ جنگی مشق میں شامل نہیں کیا گیا۔ اُن کے سروں کے

اُوپر سے ٹینکوں اور توپوں کے گولے فائر نہیں کیے گئے تھے۔ فوجی زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ BATTLE INOCULATED تھے ہی نہیں یعنی اُس جنگی کیفیت میں وہ لے جائے ہی نہیں گئے تھے جہاں جنگ کھال کے اندر اُتر جاتی ہے بلکہ دل کی گہرائیوں میں سما جاتی ہے۔ یہ لوگ بمشکل اس قابل تھے کہ جنگ کے دوران چھاؤنیوں کی سڑکوں پر راتوں کو گشت کرنے یا گاڑیوں سے اسلحہ بارُود اُتارنے اور چڑھانے میں لگا دیئے جاتے مگر اس فورس کی باقاعدہ بلٹنیں بنا کر انہیں ڈویژنوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ڈویژن کمانڈروں نے انہیں اگلے مورچوں میں بھیج دیا جہاں صرف ریگولر ٹروپس لڑ سکتے ہیں۔

اسی فورس کو طیارہ شکن گنیں بھی دے کر طیارہ شکن بیٹریاں بنائی گئیں۔ طیارہ شکن توپچیوں کو مختلف اقسام کے طیارے پہچاننے AIRCRAFT RECOGNITION کی ٹریننگ دی جاتی ہے جو ٹریننگ کا سب سے زیادہ مشکل حصہ ہوتا ہے۔ اب تو ٹریننگ کا یہ باب اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے کیونکہ جیٹ طیاروں میں نہایت معمولی فرق رہ گیا ہے اور رفتار بہت ہی تیز ہو گئی ہے بھارت کے مگ ۲۱ اور پاکستان کے مگ ۱۹ میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ ٹریننگ میں یہ فرق سمجھایا اور سکھایا جاتا ہے، ورنہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طیارہ شکن توپچی اپنے ہی طیاروں کو مار گراتے ہیں اور بعض اوقات دشمن کے طیاروں کو اپنا سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ طیارہ شکن توپچی کا دل گردہ غیر معمولی طور پر مضبوط اور نظر بہت تیز ہونی چاہیے۔ مجاہد فورس کی طیارہ شکن بیٹریوں کو اتنی ٹریننگ نہیں دی گئی تھی۔

چونکہ پاک فوج کی نفری سرحد کی طوالت اور دشمن کی کثیر طاقت کے پیش نظر بہت ہی کم تھی اس لیے اس کمی کو مجاہد فورس سے پورا کیا گیا۔ ایک ایک ڈویژن کو مجاہد فورس کی پلٹنیں دے دی گئیں جنہیں اگلے مورچوں میں بھیج دیا گیا تاکہ کہیں شگاف نہ رہے اور جب توپوں کی پہلی باڑھ فائر ہوئی اور آگے سے گولیوں کی بوچھاڑیں آئیں تو مجاہد فورس کی پلٹنیں پسپا نہیں ہوئیں بلکہ بھیڑوں کی طرح پیچھے کو بھاگ گئیں۔ ان میں سے کئی ایک جوشیلے مجاہد کہیں رُکے بغیر اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ جس

جس علاقے میں مجاہد فورس کی پلٹنیں تھیں اُس علاقے پر دشمن قابض ہو گیا۔ اس سے ریگولر ٹروپس کی بھی جنگی پوزیشن خراب ہوتی۔ دشمن نے بالادستی حاصل کر لی اور اس کے لیے جوابی حملے آسان ہو گئے۔ جہاں تک ڈویژن، بریگیڈ اور یونٹ کمانڈروں کا تعلق تھا اُن کے لیے مجاہد فورس کی یہ بھگدڑ غیر متوقع نہیں تھی۔ سب جانتے تھے کہ پہلی گولی چلی تو کیا ہو گا لیکن کمانڈر مجبور تھے کہ انہیں جو دیا گیا ہے وہ اسی سے کام چلائیں۔

ان جملہ خامیوں، کوتاہیوں اور بے نیازیوں کے علاوہ پاک افواج کو بنگالی افسروں نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ ان بنگالیوں میں اعلیٰ عہدوں کے فوجی افسر تھے جو چونکہ ہیڈکوارٹروں میں رہتے تھے اس لیے دفاع کے انتہائی اہم رازوں سے واقف تھے۔ بنگالیوں میں چھوٹے عہدوں کے افسر بھی تھے جو سٹاف ڈیوٹیوں پر تھے۔ وہ بھی اہم فوجی رازوں سے واقف تھے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ بنگالی افسروں نے گھر کے بھیدی کا رول ادا کیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب پاک فوج نے مشرقی پاکستان میں بغاوت کو دبانے کے لیے جنگی کارروائی شروع کی اور وہاں باقاعدہ خانہ جنگی شروع ہو گئی تو مغربی پاکستان میں بنگالی فوجی افسروں نے جو ہیڈکوارٹروں میں کام کر رہے تھے نہایت اہم اور نازک راز بھارت کو دینے شروع کر دیئے۔ یہ بنگالی آرمی میں بھی تھے نیوی میں بھی اور ایئر فورس میں بھی۔ تینوں افواج کے ہیڈکوارٹروں کی کوئی بھی بات بھارت سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اِدھر بنگالی فوجی پاک فوج سے بھگوڑے ہو کر سرحد پار جانے لگے۔

ان بھگوڑوں میں سیالکوٹ کے ایک بریگیڈ کا بریگیڈ میجر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اُس کا نام میجر مشرف تھا۔ وہ اہم ترین راز اپنے ساتھ لے گیا۔ بریگیڈ میجر سے کوئی بھی راز پوشیدہ نہیں ہوتا۔ میجر مشرف نے اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بھارت کی طرف سے ایک بریگیڈ کی نفری سے سلہٹ کی سرحد پر حملہ کیا تھا۔ اس بریگیڈ میں زیادہ تر پاک فوج کے بھگوڑے بنگالی تھے اور

باقی نفری بھارت کی تھی۔ اُسے بھارتی توپخانے نے گولہ باری سے سپورٹ کیا تھا۔

جب بنگالیوں نے مغربی پاکستان میں غداری کے یہ مظاہرے شروع کیے تو تینوں مسلح افواج نے ہائی کمان سے مطالبہ کیا کہ بنگالی افسروں اور جوانوں کو نہتّہ کر کے افواج سے الگ کر دیا جائے لیکن کارروائی نہ کی گئی بلکہ بنگالی افسروں کو ترقیاں بھی دی گئیں اور انہیں ہیڈکوارٹروں سے نہ ہٹایا گیا۔ نومبر ۱۹۷۱ تک بنگالی ایک ایک بھی اور باقاعدہ پارٹیوں میں بھی اِدھر سے بھاگ کر بھارت پہنچتے رہے اور ان کی وساطت سے جنگ شروع ہونے تک ہمارے راز بھارت کو ملتے رہے۔ جی۔ ایچ۔ کیو آخر دم تک چیختا رہا مگر جنرل حمید، جنرل پیرزادہ اور جنرل عمر جو چیف آف نیشنل سیکیورٹی تھا، آستینوں میں اِن سانپوں کی پرورش کرتے رہے۔ جونہی جنگ شروع ہوئی اِن سانپوں کا زہر اثر دکھانے لگا۔ ہماری ہر جنگی کارروائی کے متعلق بھارتیوں کو قبل از وقت علم ہو جاتا تھا۔ لاہور سیکٹر میں پوری کی پوری ایسٹ بنگال رجمنٹ ہتھیاروں، ایمونیشن اور دیگر ساز و سامان سمیت بھارت کی فوج سے جا ملی۔ اس رجمنٹ کی دوسری بنگالی بٹالین کو نہتّہ کر کے چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔ اس کے باوجود ہیڈکوارٹروں میں بنگالی افسر بدستور موجود رہے۔ نیوی کے آپریشن روم اور ریڈار سسٹم میں جو بنگالی افسر کام کر رہے تھے، اُنہوں نے اپنی نیوی کے دو جنگی جہاز تک تباہ کروائے تھے۔

سینئر افسر کہتے ہیں کہ مغربی پاکستان کی فوج کے پاس صرف دو چیزیں تھیں جن پر قوم بھروسہ کر سکتی تھی۔ وہ تھیں جذبہ اور حوصلہ، یعنی مورال کے لحاظ اور لڑنے کے عزم کے لحاظ سے فوج لڑنے کے لیے تیار تھی لیکن جنگ اکیلے مورال کے زور پر لڑی تو جا سکتی ہے جیتی نہیں جا سکتی۔

پاک فوج کے افسروں کی عسکری صلاحیتوں کو بیکار کرنے میں مارشل لاء کا بھی عمل دخل ہے۔ مارچ ۱۹۶۹ء سے سینئر کمانڈر اور دیگر افسر شہری انتظامیہ میں مصروف رہے۔ وہ کوئی جنگی مشق نہ کر سکے نہ ٹروپس کو جنگ کے لیے تیار کر سکے۔ اس کے برعکس بھارت پاکستان کو ختم کرنے کے عزم اور جنگی قوت بڑھاتے چلے جانے کے جنون سے باؤلا ہُوا جا رہا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد بھارت نے ڈپلومیسی اور نہایت کارگر اور مؤثر پبلک ریلیشنگ اور خارجہ پالیسی میں حالات کے مطابق ردّوبدل کر کے امریکہ کو قائل کر لیا کہ پاکستان کو جنگی ساز و سامان دینا چھوڑ دے۔ روس سے گٹھ جوڑ کیا جو آخر میں دفاعی معاہدے کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے تحت اُس نے روس سے بے پناہ جنگی مدد لی اور سارے بھارت کو چھاؤنی بنا ڈالا۔ اُس نے روس کے طفیلی ملکوں مثلاً مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ سے بھی جدید ہتھیار لیے۔ اُدھر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل سے بھی اسلحہ بارُود جمع کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے اپنے ملک میں اسلحہ ساز کارخانوں کی پروڈکشن تیز کر دی۔ ٹینک اور طیّارے تک HF-24 تیار کیے۔

اسلحہ بارُود سے سٹور بھرنے کے ساتھ ساتھ بھارتی حکومت نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتائج کو سامنے رکھ کر اپنی خامیوں اور ہماری فوج کی خوبیوں کا تجزیہ کیا۔ نااہل جرنیلوں اور دیگر افسروں کو فوج سے نکالا۔ ٹریننگ میں ردّوبدل کیا اور تینوں افواج (آرمی، نیوی، ایئر فورس) کی مشترکہ جنگی مشقوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ بھارت کے لیڈروں نے اپنی قوم میں جنگی شعور پیدا کیا اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ بھارت کا بچّہ بچّہ پاکستان کے نام سے بھی متنفّر ہو گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے بھارت کے شہریوں کو ہی نہیں، ساری دنیا کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔

یہ کہانی تو سنائی جا چکی ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان میں اپنا اثر و رسوخ کس طرح پیدا کیا اور وہاں جنگی کارروائی کے لیے کس طرح زمین ہموار کی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات ہمارے بادشاہ نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا حکم دے دیا اور ہم اپنی شکست کی طرف چل پڑے۔ بھارت نے وہ تمام فوج مشرقی پاکستان کے اِردگرد جمع کرنی شروع کر دی جس سے اُسے حملہ کرنا اور پاکستان کا یہ بازو کاٹنا تھا

آخر ایک تماشا ہماری سپریم کمان نے جو ملک کی حکمران بھی تھی، وہ حماقت کر رہی دی جس کا بھارت منتظر تھا، اس لیے اُس نے مغربی سرحدوں پر اور کشمیر میں ہمارا حملہ روکنے اور بھرپُور وار کرنے کا پورا اہتمام کر رکھا تھا۔ ہماری ہائی کمان نے

ایک لغزش تو یہ کی اور دوسری لغزش یہ کی کہ اپنی ایسٹرن کمانڈ کو اتنی بھی مہلت نہ دی کہ جنرل نیازی اپنی بکھری ہوئی فوج کو کھلی جنگ کے لیے منظم کر سکتا۔ ہمارے بادشاہ نے اس کے لیے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جہاں اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جنرل اروڑہ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"جنرل نیازی سے (ہتھیار ڈالنے کے بعد) میری دوسری ملاقات جنوری ۱۹۷۲ء میں ہوئی۔ میرا انٹیلی جنس آفیسر کرنل کھیڑا میرے ساتھ تھا۔ ہم دو گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ جنرل نیازی کو علم ہی نہیں تھا کہ جنرل یحییٰ خان نے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز بھارت کے ہوائی اڈوں پر حملہ کرا دیا ہے۔ یہ خبر اس نے ریڈیو سے سُنی تھی۔ اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ ہوائی حملے کے بعد فوج کا حملہ کب ہوگا۔ چیف آف سٹاف جنرل عبدالحمید خان کے ساتھ اس کی آخری بات اکتوبر میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اسے (جنرل نیازی کو) اسی کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جی۔ ایچ۔ کیو سے بھی اُسے کوئی قابلِ ذکر ہدایت نہیں ملتی تھی.... جنرل نیازی کو یہ توقع تھی کہ بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا بلکہ سرحد کے ساتھ کا کچھ علاقہ لے کر وہاں بنگلہ دیش کی حکومت قائم کر دے گا۔"

شکر گڑھ سیکٹر

اِن حالات اور فوجوں کی اس کیفیت میں مغربی پاکستان سے بھارت پر سولہ سو میل لمبے محاذ پر حملے کا حکم دے دیا گیا۔ باخبر حلقوں کا کہنا ہے کہ اِس حملے کے پیچھے کوئی عزم نہیں تھا، دو ٹوک فیصلہ نہیں تھا اور پلان جو بنایا گیا تھا وہ محض خوش فہمیوں اور عجیب بے نیازی کی سی کیفیت میں بنایا گیا تھا۔ جنرل حمید وغیرہ کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے حملے کا حکم دے کر وہ شرمسار ہو رہا ہے یا جیسے اُس کے ضمیر پر کوئی ناگوار بوجھ ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چند ایک اعلیٰ فوجی افسروں کے سوا کسی کو اس حملے کا علم نہیں تھا۔ حد یہ کہ ڈویژن کمانڈروں تک کو حملے کے وقت سے تھوڑی ہی دیر پہلے حملے کا حکم دیا گیا۔ حملے کا وقت تین بجے شام مقرر کیا گیا تھا مگر بعض سیکٹروں میں حملے تاخیر سے ہوئے کیوں کہ ٹینک رجمنٹیں جو پیچھے رکھی جاتی ہیں، انہیں حملے کی اجتماع گاہ تک لے جانے میں بہت سا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سیکٹروں میں حملے دوسرے سیکٹروں کی نسبت جلدی ہو گئے اور جن سیکٹروں میں حملے دیر سے ہوئے وہاں دشمن چوکنا ہو گیا تھا۔ دشمن کو دراصل ہماری سپریم کمانڈ پہلے ہی چوکنا کر چکی تھی۔ وہ اس طرح کہ فوج کو حملے کی پوزیشن میں لانے سے پہلے ہی پاک فضائیہ کو بھارت کے ہوائی اڈوں پر حملوں کا حکم دے دیا گیا۔ وہ تو جیٹ طیارے تھے۔ ذرا سی دیر میں آگرہ تک حملہ کر آئے مگر برّی فوج ابھی تیاری کی حالت میں تھی۔ لہٰذا دشمن کی برّی فوج کو بے خبری میں نہ لیا جا سکا۔ اس کی سزا ہمیں راجستھان اور شکرگڑھ میں بھگتنی پڑی۔

حملے کے حکم کے متعلق راز داری کا یہ عالم تھا کہ اپنی وزارتِ دفاع اور وزارتِ خارجہ کے سیکرٹریوں نے حملے کی خبر ریڈیو پر سُنی اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ بھارت نے مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ انفارمیشن سیکرٹری تک کو حملے کے بعد جی۔ ایچ۔ کیو میں بلا کر بتایا گیا کہ مغربی پاکستان کی سرحد پر بھی جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اس سیکرٹری سے بھی اصل صورتِ حال چھپائی گئی اور اُسے کہا گیا کہ اپنی خبر بنا کر ریڈیو کو دے دو۔ اُس نے ریڈیو سٹیشن سے رابطہ قائم کیا تو وہاں کا ڈائریکٹر نہ مل سکا۔ تلاشِ بسیار کے بعد وہ ملا اور قوم کو یہ خبر دی گئی کہ بھارت نے اِدھر بھی حملہ کر دیا ہے۔ اس خبر نے قوم پر دہشت طاری کر دی کیونکہ قوم کو یہ توقع تھی کہ ہم حملہ کریں گے مگر بھارت نے حملے میں پہل کر دی جس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کے پاس اتنی جنگی قوت ہے کہ اس نے بیک وقت دو محاذ کھول دیئے ہیں — اور جب جنگ ختم ہوئی تو قوم کو پتہ چلا کہ شکرگڑھ کی پوری تحصیل پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہے۔

سیالکوٹ کے دفاع کے لیے ہماری نمبر ۱ کور تھی جس کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان تھے۔ اس میں دو ڈویژن تھے۔ نمبر ۱۵ کمانڈر میجر جنرل

عابد علی زاہد اور نمبر ۸ ڈویژن، کمانڈر میجر جنرل (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) عبدالعلی ملک۔ ان کے ساتھ ٹینکوں کا صرف ایک بریگیڈ تھا۔ ہماری کور کے مقابلے میں بھارت کی پہلی نمبر ۱ کور تھی جس میں پانچ ڈویژن تھے۔ شمال سے جنوب مشرق تک وہ اس طرح ڈیپلائے کیے گئے تھے — نمبر ۲۶۔ نمبر ۵۴۔ نمبر ۳۹۔ نمبر ۳۶۔ نمبر ۱۵ — ہر ڈویژن کے ساتھ ٹینکوں کا ایک ایک بریگیڈ تھا۔ انہیں دُور مار بھاری توپخانے اور بے شمار فضائی بیڑے کی سپورٹ حاصل تھی۔ اس کور کا کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل کے۔ کے سنگھ تھا۔

حملے کی بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اپنی طاقت دشمن کی نسبت سہ گُنا ہو۔ اگر اتنی توفیق نہ ہو تو دُگنی ضرور ہونی چاہیئے۔ جنگ میں حملہ آوروں کا جانی نقصان دفاع میں لڑنے والوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہ کُھلے میدان میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ حملے کے لیے فضائی بیڑے کی بھرپُور اور مسلسل مدد کی ضرورت ہوتی ہے مگر سیالکوٹ سیکٹر میں جو سیالکوٹ کے جنوب میں نارووال سے دُور اُوپر شمال میں چھکیاں تک طویل تھا، ہمارے صرف دو ڈویژن تھے جنہیں پانچ ڈویژنوں اور ٹینکوں کے پانچ بریگیڈوں پر حملہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

اپنی ایک کور جنرل ٹکا خان کے زیرِ کمان محفوظہ کے طور پر رکھی گئی تھی۔ اس کور کو اُس وقت حملہ کرنا تھا جب بھارتی فوج جوابی حملے کرتے کرتے نڈھال ہو چکی ہوتی مگر یہ کور فائر بندی تک محفوظ بیٹھی رہی، افسر اور جوان فیصلہ کُن حملے کے حکم کا انتظار بے تابی سے کرتے رہے۔ جنرل ٹکا خان جیسا جرنیل جو جارحانہ قیادت کی وجہ سے بھارتیوں کے لیے دہشت بنا رہا ہے، مجبور اور حکم کا پابند بیٹھا رہا اور فائر بندی ہو گئی۔

شکر گڑھ کا علاقہ مخروطی شکل میں دشمن کے علاقے کے اندر گیا ہُوا ہے۔ اسی طرح سیالکوٹ کے شمال میں بھی کچھ علاقہ اندر گیا ہُوا ہے۔ ایسے علاقوں کا دفاع مشکل ہوتا ہے۔ عموماً کمانڈر کوشش کرتے ہیں کہ دشمن کو ایسے علاقے کے اندر آنے دیا جائے۔ دشمن پیش قدمی میں کوئی رکاوٹ یا معمولی سی مزاحمت

دیکھ کر بڑھتا چلا آتا ہے حتیٰ کہ وہ گھیرے میں آ کر شکستِ فاش سے دوچار ہوتا ہے۔ یہی چال شکر گڑھ میں چلی گئی۔ یہاں جنرل عبدالعلی ملک کا آٹھواں ڈویژن تھا۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام جسڑ اور نارووال کے درمیان سے بھارت کے اِس علاقے پر حملہ کیا گیا جو ہمارے علاقے میں گِھرا ہُوا ہے۔ یہ دھرم کا مقام ہے۔ ہمارے حملہ آور دستوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ حملہ دشمن کو یہ اشتعال دینے کے لیے کیا گیا تھا کہ وہ شکر گڑھ کے علاقے میں آ جائے۔ ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز بھارتیوں نے جوابی کارروائیاں شروع کیں۔ ان کارروائیوں کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ جنگ سے پہلے ہمارے آٹھویں ڈویژن کے ایک بریگیڈ کا جو بریگیڈ میجر بھاگ کر بھارتیوں سے جا ملا تھا اُس نے اس سیکٹر کے تمام تر راز بھارتیوں کو دے دیئے ہیں۔ بھارتیوں کا پلان جو اُن سے پکڑے ہوئے کاغذات اور قیدیوں سے معلوم ہُوا، یہ تھا کہ وہ مرالہ، سیالکوٹ، پسرور اور نارووال کے علاقوں پر قبضہ کریں گے اور وہاں سے دو کالموں میں وزیر آباد اور گجرات تک بڑھ کر شاہراہِ پاکستان کو اپنے قبضے میں لیں گے۔ یہ وہی پلان تھا جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں سیالکوٹ پر حملہ کیا اور چونڈہ کو میدانِ جنگ بنایا تھا لیکن یہ پلان کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

۱۹۷۱ء میں دشمن کو شکر گڑھ کے علاقے میں گھسیٹنے کی کوشش کی گئی تو دشمن اس چال کو سمجھ گیا۔ ہمارے کمانڈر خوش تھے کہ دشمن ان کے دھوکے میں آ گیا ہے مگر اصل خوشی دراصل دشمن کو حاصل تھی جو ہمارے کمانڈروں کو دھوکا دیتا آگے بڑھتا آیا۔ اُدھر شمال میں ہمارا پندرھواں ڈویژن ایک بھیانک غلطی کر چکا تھا۔ وہ ناقص ڈیپلائے کی وجہ سے چھکیاں کا علاقہ دشمن کے حوالے کر چکا تھا۔ اس سے مرالہ ہیڈ ورکس براہِ راست خطرے میں آ گیا تھا۔ یہ ڈویژن اب دشمن کی مزید پیش قدمی روکنے میں مصروف تھا۔ معتبر ذرائع کا کہنا ہے کہ ہمارے اس ڈویژن کمانڈر نے میدانِ جنگ کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتِ حال کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کیے بلکہ وہ جی۔ ایچ۔ کیو کی ہدایات کا محتاج رہا۔

دشمن کو فضائی بیڑے کی بھرپُور مدد حاصل تھی۔ اس کے مقابلے میں

اپنا فضائی بیڑہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ بہر حال اس ڈویژن کو دشمن نے وہیں اُلجھائے رکھا اور جنرل عبدالعلی ملک کا آٹھواں ڈویژن شکر گڑھ کے دفاع کے لیے اِس حال میں رہ گیا کہ اسے اب پندرھویں ڈویژن سے کوئی تعاون نہیں مِل سکتا تھا۔ آٹھویں ڈویژن کو مرالہ ہیڈ ورکس کے لیے خطرہ پیدا کر کے اپنے ساتھ اُلجھا لینے سے بھارتیوں نے اپنے ان ٹروپس کے لیے جو شکر گڑھ کے اندر آ رہے تھے یہ خطرہ ختم کر لیا کہ وہ گھیرے میں آ جائیں گے۔ لہٰذا شکر گڑھ میں دشمن کو اندر لا کر مارنے کا پلان ناکام ہو گیا۔

دونوں طرف کے ٹینکوں کی تعداد میں جو فرق تھا وہ بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک اور پانچ کا تناسب تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس زیادہ تر ٹینک قدیم شرمن ٹینک تھے جو قسم کے لحاظ سے بھی قدیم تھے اور استعمال کے لحاظ سے ان کے انجنوں کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ چلتے چلتے رُک جاتے تھے اور ان کی حیثیت ایک توپ کی رہ جاتی تھی۔ امریکہ کے پیٹن ٹینک بھی تھے۔ وہ بھی بہت پُرانے تھے، چینی ٹینک فیصلہ کُن جوابی حملے کے لیے رکھے گئے تھے مگر جوابی حملہ کیا ہی نہ گیا۔ اس کے مقابلے میں بھارتیوں کے پاس سنچورئین ٹینک تھے اور روس کے T-55 ٹینک بھی۔ یہ ٹینک رات کے وقت بھی لڑ سکتے ہیں۔ ہمارے پاس شام کے بعد بکتر بند کارروائی کے لیے کوئی ٹینک نہیں تھا۔ اب تصور فرمائیے کہ ٹینک کم بھی اور کمتر بھی اور ٹکر ایک طاقتور دشمن سے لی گئی اور اس چال کے ساتھ لی گئی کہ اسے اندر آنے کا موقع دے دیا گیا۔

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء سے بھارت کی نمبر ا کور نے شکر گڑھ پر تین اطراف سے حملے شروع کر دیئے۔ یہ حملے تین ڈویژنوں — نمبر ۵۴، نمبر ۳۶ اور نمبر ۳۹ — سے کیے جا رہے تھے۔ یعنی ہمارے ایک ڈویژن پر تین ڈویژن حملے کر رہے تھے۔ ہر حملے کو فضائی بیڑے اور ہر قسم کے بے شمار توپخانے کی ایسی مدد حاصل تھی کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین شعلے اُگل رہی تھی۔

ہمارے دستے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے آئے۔ یہاں پاک فوج اور اپنی ہائی کمان کی وہ ساری ہی خامیاں رنگ دکھانے لگیں جن کا [illegible]

نظر تو یہ آ رہا تھا کہ دشمن کا وزیر آباد تک پہنچنے کا پلان کامیاب ہو جائے گا لیکن ہمارے افسروں اور جوانوں کی شجاعت اور جذبۂ حُب الوطنی کا یہ کرشمہ ہے کہ انہوں نے دشمن کی اتنی زیادہ طاقت اور فائر پاور کے باوجود اس کی پیشقدمی نہایت سُست اور دشوار بنائے رکھی۔ نارووال سیکٹر میں ایک جوان سوار محمد حسین شہید نے جرأت کا بے مثال مظاہرہ کیا جس کے صلے میں اُسے نشانِ حیدر دیا گیا۔ یہ اپنی نمبر ۲۰ لانسرز (ٹینک رجمنٹ) تھی جس کے پاس پُرانے شرمن ٹینک تھے۔ یاد رکھئے کہ شرمن ٹینک کی توپ کا گولہ ڈیڑھ ہزار گز تک جا سکتا ہے۔ ان ٹینکوں کا مقابلہ سنچورئین اور ٹی۔۵۵ ٹینکوں سے تھا۔ سنچورئین کی توپ کا گولہ تین ہزار گز تک جا سکتا ہے۔ ہماری اس ایک رجمنٹ نے دشمن کے دو ٹینک بریگیڈوں کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح تمام سیکٹر میں انفرادی شجاعت کے مظاہرے ہوئے مگر جنگ انفرادی شجاعت سے نہیں جیتی جا سکتی۔ بالائی سطح پر جو لغزشیں سرزد ہو رہی تھیں ان کا کفارہ افسر اور جوان شہید اور زخمی ہو کر ادا کر رہے تھے۔

سب سے زیادہ تشکل دشمن کا توپ خانہ پیدا کرتا تھا۔ گولے بارش کی طرح آتے تھے اور تین تین گھنٹے زمین و آسمان ایک کیے رکھتے تھے۔ وہی جنرل عبدالعلی ملک جو ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بریگیڈیئر کی حیثیت سے اسی میدان میں اس حال میں لڑے تھے کہ اُن کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل اسمٰعیل نے دشمن کی بکتر بند طاقت سے گھبرا کر انہیں حکم دیا تھا کہ پیچھے ہٹ آئیں اور سیالکوٹ خالی کر دیں تو جنرل عبدالعلی ملک نے اُن کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک پیادہ بریگیڈ اور صرف ایک ٹینک رجمنٹ سے بھارت کے بکتر بند ڈویژن کو تین دن روکے رکھا تھا۔ وہی جنرل عبدالعلی ۱۹۷۱ء میں اسی میدان میں بے بس ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں اُن کی مدد کے لیے اپنا بکتر بند ڈویژن آ گیا تھا، ۱۹۷۱ء میں انہیں تھوڑی سی کمک بھی نہیں مل رہی تھی۔ توپخانے کی سپورٹ ناکافی بھی تھی ناقص بھی۔ اس کی کمی پاک فضائیہ سے پوری کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پاک فضائیہ کو سب سے زیادہ اسی سیکٹر میں استعمال

کیا گیا جس کے نتیجے میں فضائیہ دوسرے سیکٹروں کو ضرورت کے مطابق مدد نہ دے سکی۔ پاک فضائیہ کا یہ استعمال جنگی اصولوں کے خلاف تھا۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جہاں تک توپ خانہ مار کر سکتا ہے وہاں طیاروں کو استعمال نہیں کیا جاتا مگر شکرگڑھ میں طیاروں کو توپ خانے کی جگہ استعمال کیا گیا۔

پاک فضائیہ کے استعمال کے متعلق چند ایک خامیوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ۱۹۶۹ء کے مارشل لاء سے کچھ عرصہ پہلے اور بعد فضائیہ نے فوج کے ساتھ کوئی جنگی مشق نہیں کی اس لیے جنگ میں فوج اور فضائیہ میں رابطہ ناپید تھا اور کوئی مشترک پلان بھی نہیں تھا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ پاک فضائیہ فارغ بیٹھ گئی۔ اس فراغت سے بچنے کے لیے فضائیہ نے اپنے طور پر اپنی فوج کی مدد اس طرح شروع کر دی کہ کسی منصوبے اور فوج کے بلاوے کے بغیر طیارے چلے جاتے اور دشمن کے عقب میں جا کر اس کی سپلائی لائن اور کمک توڑنے کی کوشش کرتے۔ یہ بڑا ہی غلط اقدام تھا جو اپنی طاقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھئے کہ کسی سیکٹر میں جب طیارے بلائے جاتے ہیں تو انہیں ٹارگیٹ دکھانے اور رہنمائی کرنے کے لیے فوج میں تربیت یافتہ افسر ہوتے ہیں جنہیں FORWARD AIR CONTOLLER کہتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ایسے تجربہ کار افسروں کی کمی تھی اور جو تھے بھی انہیں دوسری ڈیوٹیاں دے دی گئی تھیں۔

یہ شکایت قوم نے بھی کی تھی کہ اپنی فضائیہ کہیں نظر نہیں آتی۔ خود فضائیہ کے زمینی عملے کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ ان کے طیارے زمین پر کیوں کھڑے رہتے ہیں۔ انہیں بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ ایسے وقت جب انڈین ایئر فورس سارے پاکستان کی فضا میں گرجتی پھر رہی تھی، محاذوں پر ہمارے ٹروپس کو چین نہیں لینے دے رہی تھی، پاک فضائیہ کے چار سکواڈرن محفوظ کے طور پر زمین پر رکھ لیے گئے تھے۔ یہ "کسی بڑی لڑائی" کے لیے محفوظ رکھے گئے تھے اور فائر بندی تک محفوظ ہی پڑے رہے۔ پاک فضائیہ کا کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان کا اوپر لایا ہوا ایک شہزادہ ایئر مارشل رحیم تھا جو صرف

شکل سے پاکستانی لگتا تھا، زبان، انداز اور سلوک برتاؤ سے امریکی تھا۔ جنگ میں اس کا کوئی واضح پلان دیکھنے میں نہ آیا۔ وہ دورے کرنے، گارڈ آف آنر لینے اور بادشاہوں کی طرح دور سے شاباش کہنے والا کمانڈر انچیف تھا۔ ان خرابیوں میں مزید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ پاک فوج فضائیہ کو استعمال ہی نہ کر سکی یا اس انداز سے استعمال نہ کر سکی جس سے دشمن پر بالادستی حاصل کی جا سکتی۔

بھارت کے ڈویژن نہایت آہستہ آہستہ قدم پھونک پھونک کر شکرگڑھ کے علاقے میں پیشقدمی کر رہے تھے۔ وہ فضائی بیڑے کی بمباری، راکٹ اور گن فائرنگ سے اور توپ خانوں کی قیامت خیز گولہ باری سے زمین ہموار کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی یہ پیشقدمی ہمارے پلان کے عین مطابق تھی۔ ہمارا پلان یہی تھا کہ وہ اندر آ جائیں۔ وہ آ گئے مگر پلان کے اگلے مرحلے یعنی انہیں گھیرے میں لینے یا انہیں کمر توڑ نقصان پہنچا کر ان پر بھرپور حملہ کرنے کے لیے اپنے پاس کچھ نہ تھا بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسا کوئی پلان ہی نہیں تھا۔

ایک روز کور ہیڈ کوارٹر نے حکم دیا کہ دشمن پر بکتر بند اور پیادہ فوج کا حملہ کر دیا جائے لیکن یہ حملہ منسوخ کر دیا گیا۔ اس سوال کا جواب حملہ منسوخ کرنے والے ہی دے سکتے ہیں کہ حملہ کیوں منسوخ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا کہ اپنے ٹروپس دریائے بین کے مغربی کنارے یعنی اپنی طرف والے کنارے پر آ جائیں۔ ہمارا آٹھواں ڈویژن چھوٹے پیمانے پر جوابی حملے کرتا رہا جن سے دشمن کی پیشقدمی سست رہی لیکن رکی نہیں۔

دوسرے محاذوں پر جنگ رسمی طور پر لڑی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کوئی بڑی یا قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہو رہی تھی۔ صرف شکرگڑھ کا میدان گرم تھا۔ اصل جنگ یہیں لڑی جا رہی تھی۔ ایک روز بھارتیوں نے شکرگڑھ لینے کے لیے شدید حملہ کیا جسے ہماری ۱۹ فرنٹیئر فورس نے حیران کن بہادری سے پسپا کر دیا۔ ہماری طرف اب جنگ کسی پلان کے تحت نہیں بلکہ یونٹوں کی سطح پر یا جذبے کے زور پر لڑی جا رہی تھی۔ ۱۵ دسمبر کے روز دشمن نے ایک شدید

حملہ کر کے ظفروال کے مورچوں سے ہمارے ٹروپس کو پیچھے ہٹا دیا۔ اُسی رات رُوسی ٹینکوں کی دو رجمنٹوں اور دو پیادہ پلٹنوں سے حملہ کر کے دشمن نے ہمارے دو گاؤں بڑا پنڈ اور غازی پور لے لیے۔ بھارتی ظفروال، شکر گڑھ سڑک پر قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہماری ایک ٹینک رجمنٹ نمبر ۱۳ لانسرز نے جوابی حملہ کر کے دشمن سے بڑا پنڈ واپس لے لیا۔ یہ بھی ذاتی شجاعت کا ایک مظاہرہ تھا۔ ہماری اس رجمنٹ کو جان اور خون کی بے دریغ قربانی دینی پڑی۔ اس نوعیت کے جو جوابی حملے مختلف یونٹوں سے کروائے جا رہے تھے اِن سے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اپنا کوئی پلان نہیں ہے اور اگر کوئی تھا بھی تو وہ بیکار ہو چکا ہے۔

راجستھان سیکٹر کی طرح شکر گڑھ میں بھی ایسے واقعات سننے میں آئے تھے کہ بعض یونٹ کمانڈروں نے بالائی کمانڈروں کے غلط احکام کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ صورت اُس وقت پیدا ہُوا کرتی ہے جب میدانِ جنگ بالائی کمانڈروں کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ وہ بوکھلا کر اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کی خاطر انسانوں کو دشمن کے تنور میں پھینکنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا ایک نمایاں واقعہ شکر گڑھ سیکٹر میں ہُوا۔ ۳۵ فرنٹیئر فورس سے جرپال گاؤں پر حملہ کرایا گیا جس میں مکمل طور پر کامیابی حاصل نہ ہوئی تاہم دشمن کی پوزیشن متزلزل ہو گئی۔ پھر اسی بٹالین کو دوبارہ حملے کا حکم دیا گیا جو ایک غلط حکم تھا۔ بٹالین کمانڈر نے احتجاج کیا کہ موت کے سوا اس حملے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا مگر حکم، حکم ہوتا ہے اور فوجی کے لیے حکم ہے کہ وہ ہر حکم مانے۔ لہٰذا اس بٹالین کمانڈر نے حکم مانا۔ اُس نے جانفشانی سے حملہ کیا اور وہی ہُوا جو اُس نے کہا تھا۔ بٹالین کمانڈر شہید ہو گیا اور بھی نقصان ہُوا اور حملہ بھی ناکام رہا۔

اب جنرل ٹکا خان کی کور کے ساتھ جو سلوک ہُوا وہ سنیے۔ اس کور کو جنرل ٹکا خان کی زیرِ کمان محفوظہ کے طور پر رکھا گیا تھا۔ وہ حکم کے منتظر تھے۔ افسر اور جوان حملے کے لیے بیتاب تھے۔ دشمن شکر گڑھ کے اندر آ گیا تھا مگر محفوظہ ابھی محفوظ بیٹھی تھی۔ ۷۔ دسمبر کے روز جنرل ٹکا خان پریشانی کے عالم میں راولپنڈی گئے۔ چیف آف سٹاف سے کہا کہ میدانِ جنگ کی صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ

مجھے حملہ کرنے کی اجازت دی جائے، مگر انہیں اجازت نہ دی گئی۔ جنرل ٹکا خان نے اور زیادہ زور دیا تو اُن کا دل یہ کہہ کر پرچا دیا گیا کہ حملے کی تیاری کے لیے اپنے ٹروپس کو مطلوبہ مقامات تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد ملٹری آپریشن کے ڈائریکٹر نے بھی اور چھوٹے افسروں نے بھی چیف آف سٹاف پر زور دینا شروع کر دیا کہ دشمن کو پلان کے مطابق شکر گڑھ کے اندر لایا جا چکا ہے، پیشتر اس کے کہ وہ قدم جما لے، جنرل ٹکا خان کو حملے کی اجازت دی جائے ورنہ وقت گزر جائے گا۔

اس دباؤ سے گلوخلاصی کرانے کے لیے جنرل حمید نے کہا کہ وہ اگلے روز فیصلہ کریں گے۔ یہ صورتِ حال قابلِ غور ہے کہ حملہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ وہ مر بھی سکتے ہیں اور اس قدر زخمی بھی ہو سکتے ہیں کہ عمر بھر کے لیے معذور ہو جائیں مگر وہ حملے کے لیے بے تاب ہیں۔ ملٹری آپریشن کا محکمہ چلا رہا ہے کہ محفوظہ سے حملہ کراؤ ورنہ دشمن غالب آ جائے گا مگر صرف ایک آدمی کی 'ہاں' پر اور 'نہ' پر پاکستان کی قسمت کا دارومدار ہے۔ وہ پاکستان کی تاریخ پر سیاہی پھیرنے کے لیے ہاتھ میں بُرش لیے کھڑا ہے اور کسی کی سن نہیں رہا۔ اس میں صلاحیت نہیں کہ صحیح اور فوری فیصلہ کرے اور اس میں ہمت نہیں کہ یحییٰ خان پر اپنا فیصلہ ٹھونسے۔

دوسرا دن طلوع ہُوا تو سب منتظر تھے کہ آج چیف آف سٹاف حملے کا حکم دے گا۔ آخر چیف آف سٹاف نے حکم دے دیا مگر یہ حکم حملے کا نہیں تھا۔ یہ ایسا حکم تھا کہ متعلقہ افسروں نے سنا تو حیرت میں ڈوب گئے۔ ان میں سب سے زیادہ بُری حالت ٹکا خان کی ہُوئی —— چیف آف سٹاف نے اپنے اس انوکھے حکم سے محفوظہ کی کور کے حصے ہی بخرے کر دیئے۔ اس کے ایک ڈویژن (نمبر ۲۳) کے ایک بریگیڈ کو راجستھان بھیج دیا اور دوسرے بریگیڈ کو نمبر ۱ کور کے حوالے کر دیا۔ چیف آف سٹاف نے یہ دھاندلی بلکہ سکھ شاہی کی کہ ملٹری آپریشن کے ڈائریکٹر سے نہ مشورہ لیا نہ اطلاع دی۔ ان بریگیڈوں کو جن جن ڈویژنوں میں بھیجا گیا اُن کے کمانڈر بڑے حیران ہوئے کہ انہوں نے کوئی بریگیڈ نہیں مانگا تھا اور نہ انہیں یہ بتایا

گیا کہ یہ بریگیڈ انہیں کیوں دیئے گئے ہیں۔

چیف آف سٹاف کی اس حرکت سے کوئی کیا سمجھے؟ جنرل ٹکا خان کی اتنی بڑی فورس کو جو فیصلہ کُن حملہ کرنے کے لیے بیقرار تھی، جب اس طرح بکھیر دیا گیا تو نہ صرف اس فورس کے افسروں اور جوانوں میں بددلی پھیل گئی بلکہ اُن ڈویژن ہیڈ کوارٹروں میں بھی مایوسی اور کسمپرسی کی کیفیت طاری ہو گئی جو اس انتظار میں تھے کہ یہ کور حملہ کرے گی۔

اس حملے کا (جسے جوابی حملہ کہا جا رہا تھا) ایک اور پلان بنایا گیا۔ چیف آف سٹاف نے ۱۳ دسمبر کے روز غالباً ان اعلیٰ کمانڈروں کے مندرجہ بالا ردِ عمل کو ٹھنڈا کرنے کے لیے حملے کی منظوری دے دی۔ حملے کی تاریخ ۱۶ دسمبر مقرر کی گئی۔ تمام متعلقہ کمانڈروں کو ہدایات بھیج دی گئیں، مگر فوراً بعد یہ حکم بھیج دیا گیا کہ حملہ چوبیس گھنٹوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ڈرامائی حکم تھا جو چیف آف سٹاف نے ان الفاظ میں دیا FREEZE TIKKA (ٹکا کو روک دو)۔ یہ حکم ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام ایک میٹنگ میں دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ میٹنگ میں سناٹا طاری ہو گیا۔ چیف آف سٹاف نے جب یہ ردِ عمل دیکھا تو اُس نے ایسا عذر پیش کیا جو گناہ سے بدتر تھا۔ اُس نے کہا کہ سیالکوٹ سیکٹر میں صورت حال بہت خراب ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ پاک فضائیہ پر اُسے بھروسہ نہیں رہا۔ کسی نے اُسی وقت کانفرنس روم سے ہی سیالکوٹ سیکٹر میں لڑنے والی کور کے کمانڈر جنرل ارشاد سے ٹیلیفون پر پوچھا کہ کیا ان کے سیکٹر کی صورتِ حال بہت بگڑی ہوئی ہے؟

جنرل ارشاد نے جواب دیا ——— "بالکل نہیں۔ میں مطمئن ہوں۔"

ائیر مارشل رحیم بھی وہاں موجود تھا۔ اُس نے یہ جواب سُنا تو چیف آف سٹاف جنرل حمید سے کہا کہ وہاں صورتِ حال ٹھیک ہے تو جنرل ٹکا کو حملہ کرنے دیا جائے مگر جنرل ٹکا خان کو بذریعہ ٹیلیفون یہ حکم دیا گیا کہ وہ حملہ نہیں کریں گے۔

جنرل ٹکا خان کے بیان کے مطابق، ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے اس اطلاع کو دشمن کا دھوکا سمجھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں کسی قیمت پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ حملہ روک دیا گیا ہے۔ میں تو حملے کی تیاری مکمل کر چکا تھا اور حملہ بے حد لازمی ہو گیا تھا۔ تاہم جنرل ٹکا خان نے فوراً دوسرے ذرائع سے تصدیق کی کہ یہ ٹیلیفون چیف آف سٹاف کا ہی ہے۔ اس کے معاً بعد تمام سیکٹروں میں فائر بندی کے احکام بھیج دیئے گئے ——— اور جب فائر بندی ہوئی تو دشمن شکر گڑھ کے آٹھ سو تیس مربع میل علاقے پر قابض ہو چکا تھا۔ صرف شکر گڑھ شہر پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکا۔

اور جب فائر بندی کے احکام محاذوں پر پہنچے تو افسروں اور جوانوں پر صرف افسردگی اور مایوسی طاری نہ ہوئی بلکہ کئی افسر اور جوان رو پڑے۔ ایک میجر جنرل کے متعلق بتاتے ہیں کہ ذرا سی دیر کے لیے جی۔ ایچ۔ کیو میں گیا تھا۔ اس نے فائر بندی کے احکام وہیں سُنے۔ اُس نے بریف کیس پٹخ دیا۔ بیٹھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سیالکوٹ سیکٹر خصوصاً شکر گڑھ محاذ کے افسر بتاتے ہیں کہ کئی جوان دھاڑیں مار مار کر روئے، بعض نے فائر بندی کا حکم بھیجنے والوں کو بلند آواز سے ننگی گالیاں دیں۔ انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ یہ سب کیا دھرا سپریم کمانڈر کا ہے۔ وہ اپنے افسروں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ انہیں اس شرمساری کا بھی سامنا تھا کہ قوم انہیں کہے گی کہ وہ شکر گڑھ کی پوری تحصیل دشمن کو دے بیٹھے ہیں۔

ان کے خدشے صحیح ثابت ہوئے۔ سیالکوٹ شہر میں فوجیوں کو شہریوں نے طعنے دیئے اور انہیں بزدل کہا۔ پاکستانیوں کے بہروپ میں بھارت کے ایجنٹوں نے تحریری اور تقریری طور پر پاک افواج کے خلاف شرمناک پروپیگنڈے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ قوم کو سرکاری طور پر نہیں بتایا گیا کہ مغربی پاکستان کے حملے کی ناکامی کی وجوہات کیا تھیں۔ حمود الرحمان کمشن ایک خفیہ دستاویز بن کر رہ گئی۔ اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ پاک فوج نے انفرادی شجاعت کی روایت کو زندہ رکھا۔ افسر اور جوان پورے قہر سے لڑے۔ یہ ان کے فرض کی لگن کا کرشمہ ہے کہ بالائی کمان کی اس قدر خطرناک کمزوریوں، اپنی طاقت کی کمی، پلان کے فقدان اور دشمن کی قیامت خیز طاقت کے باوجود دشمن کو اتنا آگے بڑھنے نہ

دیا جتنا وہ اتنی طاقت کے زور پر اور پاک فوج کی کمزوریوں کی بدولت بڑھ سکتا تھا۔ دشمن شکرگڑھ میں بارہ دنوں اور بارہ راتوں میں پوری کور کی طاقت کے باوجود صرف آٹھ میل آگے آسکا مگر ہمارے افسروں اور جوانوں کی شجاعت رائیگاں گئی، ان کا خون رائیگاں گیا۔ یہ خون کس کی گردن پر ہوگا؟

مجرموں کی نشاندہی کر دینے سے جُرم ختم نہیں ہوجایا کرتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسی جُرم کا ارتکاب اب بھی تو نہیں ہو رہا!

مجھے ۱۹۶۵ء کا راجستھان یاد آتا ہے۔ پاک فوج نے دشمن کے علاقے میں پچیس میل اندر جاکر جھنڈے گاڑے تھے۔ بھارت کے صحرا میں بھارتی فوج کی ٹوٹی اور جلی ہُوئی گاڑیوں کے ڈھانچے بکھرے ہُوئے تھے۔ بھارتی سپاہیوں کے بُوٹ اور ہتھیار جگہ جگہ پڑے نظر آتے تھے جو وہ بھاگنے میں سہولت پیدا کرنے کے لیے پھینک گئے تھے۔ بھارت کے قلعوں پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بھارتی فوجیوں کی لاشیں صحرائی لُومڑیاں گھسیٹ رہی تھیں میں نے سادھے والا کے قریب ایک مشترک قبر دیکھی تھی جس میں انڈین آرمی کے ڈیڑھ سو سے زائد افسروں اور جوانوں کی لاشیں پاک فوج نے دبائی تھیں۔ اس لق ودق صحرا میں دُور دُور تک بھارتیوں کی پسپائی کے آثار نظر آتے تھے۔

اب مجھے دسمبر ۱۹۷۱ء کا راجستھان یاد آتا ہے۔ صحرا میں ٹوٹی اور جلی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوتے ہیں۔ ہتھیار اور ایمونیشن بھی بکھرا ہُوا نظر آتا ہے۔ ٹینکوں اور ٹریکٹروں کے جلے ہُوئے ڈھانچے بھی نظر آرہے ہیں۔ لق ودق صحرا میں دُور دُور تک پسپائی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر یہ بھارت کی نہیں پاکستان کی شکست کے آثار ہیں —— ایسے لگتا ہے جیسے میں بڑی اچھی تصویر کو اُلٹا کرکے دیکھ رہا ہوں۔

ہوسکتا ہے قارئین کرام یہ سمجھ بیٹھیں کہ ۱۹۶۵ء میں راجستھان میں ہماری جو فوج لڑی تھی وہ ۱۹۷۱ء کی فوج کی نسبت بہتر اور زیادہ تھی۔ جی نہیں ۱۹۷۱ء میں فوج زیادہ اور بہتر تھی۔ ۱۹۶۵ء میں ہماری ڈیزرٹ (صحرائی) فورس لڑی تھی جس میں باقاعدہ فوج کی نفری نہیں بلکہ انڈس رینجرز اور حُر تھے۔ راجستھان کے آدھے سیکٹر میں باقاعدہ فوج تھی جس کے کمانڈر بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) خواجہ اظہر تھے۔ باقی نصف سیکٹر میں بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) خداداد خان کی زیرکمان ڈیزرٹ فورس لڑی تھی اور اس فورس نے دشمن کے سب سے زیادہ علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ ڈیزرٹ فورس کے پاس کوئی

ہتھیار (توپ یا مارٹر گن) نہیں تھا۔ اسے باقاعدہ فوج کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ بھی نہیں دی گئی تھی کیونکہ یہ فورس جنگ کے دوران صرف ایک دن میں بنائی گئی تھی۔ اس کے کمانڈر پاک فوج کے افسر تھے۔

ممکن ہے کہ ہمارے فوجی افسر یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ڈیزرٹ فورس کے پاس کوئی فوجی نقشہ نہیں تھا۔ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ایک میجر L - 19 طیارے میں بیٹھا، تمام علاقے پر اُڑا اور پنسل سے وہ سفید کاغذ پر زمین کے خدوخال، ٹیلے اور دیگر کوائف کی لکیریں کھینچتا رہا۔ جب وہ رحیم یار خان اُترا تو اس کے طیارے کے دونوں پر دشمن کی رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیوں سے چھلنی تھے۔ نقشہ تیار ہو گیا تھا۔ ڈیزرٹ فورس نے چھ سو نفری اور صرف رائفلوں اور دو مشین گنوں سے سادھے والا کے مقام پر بھارت کے ایک بریگیڈ پر حملہ کر کے اسے پسپا کیا اور بیک وقت دو نہایت اہم مقامات، سادھے والا اور رونگا نے والا، لے لیے تھے ــــ اس نیم فوجی ڈیزرٹ فورس اور دوسرے حصے میں صرف ایک بریگیڈ نے دشمن کا دو ہزار مربع میل علاقہ قبضے میں لے لیا تھا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں راجستھان میں پورا ایک ڈویژن لڑا تھا جس کے ساتھ دو ٹینک رجمنٹیں اور ضرورت کے مطابق توپ خانہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ چار مجاہد پلٹنیں بھی تھیں جو نیشنل ڈیفنس سکیم کے تحت کھڑی کی گئی تھیں۔ یہ باقاعدہ فوج دشمن کا کچھ علاقہ لینے کی بجائے بُری طرح پسپا ہوئی، ٹینک اور گاڑیاں تباہ کرا آئی اور اپنا ساڑھے تین ہزار مربع میل علاقہ دشمن کو دے آئی۔ اتنی وسیع زمین کے علاوہ پاکستان کو جو نقصان ہُوا وہ یہ تھا کہ پاک فوج کی وہ روایت ریزہ ریزہ ہو گئی جو بھارت کی فوج کے لیے دہشت بنی ہوئی تھی۔

ہمارے ہاں سیالکوٹ کی تحصیل شکر گڑھ کے نقصان کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ شکر گڑھ آباد اور زرخیز علاقہ تھا۔ وہاں بہت زیادہ آبادی اور زرعی پیداوار متاثر ہوئی لیکن جنگی نقطۂ نگاہ سے راجستھان زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ پاکستان کا ایسا دروازہ ہے جس کے کواڑ نہیں ہیں۔ دشمن چند میل آگے آ کر کراچی کو پاکستان سے کاٹ سکتا ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دشمن کا ٹارگیٹ مشرقی پاکستان تھا۔ مغربی محاذ پر اس کا مقصد علاقہ لینا نہیں بلکہ اپنے ملک کا دفاع تھا۔ اس نے مشرقی پاکستان میں مطلوبہ کامیابی حاصل کر لی اور یک طرفہ فائر بندی کر دی۔

راجستھان سیکٹر میں منہ کی کھانے کی وجوہات یہ ہیں کہ یہ حملہ کسی پلان کسی عزم اور کسی مقصد کے بغیر کرایا گیا تھا۔ اس سوال کا جواب یحییٰ خان کے سوا اور کوئی بھی نہیں دے سکتا کہ مغربی پاکستان سے اپنی فوجوں کو حملے کا حکم کیوں دیا گیا تھا۔ غیر فوجی ذہنوں کا مطالبہ یہی تھا کہ مشرقی پاکستان سے بھارت کی توجہ ہٹانے کے لیے مغربی پاکستان سے بھارت پر حملہ کر دیا جائے۔ مگر صرف فوجی ذہن سمجھ سکتا ہے کہ مغربی پاکستان سے حملہ کر کے ہم نے بھارت کے لیے جواز مہیا کر دیا کہ وہ مشرقی پاکستان پر کُھلا حملہ کر دے۔

پاک فوج کی مشرقی کمان بڑی ہی تکلیف دہ صورتِ حال کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہ ایسی جنگ تھی جو پاک فوج کئی برس لڑ سکتی تھی۔ بھارت کو سمندری راستے سے مشرقی پاکستان جانے والی ہماری سپلائی اور کمک روکنے کا جواز نہ مِل سکتا۔ اس کا نتیجہ فتح بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی کہ کسی مرحلے پر کوئی معاہدہ ہو جاتا جس کے تحت پاک فوج اور غیر بنگالی شہری باعزت طریقے سے مشرقی پاکستان سے نکل آتے۔ کم از کم یہ رسوائی اور جگ ہنسائی نہ ہوتی اور بھارت ہمارے ایک لاکھ کے قریب قیدی رکھ کر ہمیں اپنے دروازے پر جُھکنے پر مجبور نہ کر سکتا ــــ بھارت کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں اُس کی تخریبی کارروائیاں وہاں کے مسلمانوں کے عدم تعاون سے کسی بھی وقت ناکام ہو سکتی ہیں اور شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی بھی وقت کوئی محبِ وطن پاکستانی گولی مار سکتا ہے اور وہاں کے مسلمان بھارت کے خلاف محاذ قائم کر سکتے ہیں۔

چنانچہ بھارت نے مشرقی پاکستان کی سرحد پر دو چار بار توپ خانے کی گولہ باری بھی کی جس کا مقصد ہمارے ہاں یہ بیان کیا گیا کہ وہ مکتی باہنی کو "کور" کر رہا ہے لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ پاکستان مغربی سرحد سے جوابی کارروائی کرے۔ بھارت کی

خواہش اور کوشش شدید ہوتی جارہی تھی کہ پیشتر اس کے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان ہندو اور مجیب کے عزائم کو بھانپ لیں، مشرقی پاکستان پر اس تمام لاؤلشکر سے حملہ کردیا جائے جو اس نے مشرقی پاکستان کے اردگرد جمع کر رکھا تھا۔

اگر اپنی ہائی کمان میں کوئی سنجیدہ سوچ بچار کرنے والا جرنیل ہوتا تو وہ جنرل نیازی سے پوچھے بغیر جان لیتا کہ مشرقی پاکستان میں اس کے ٹروپس کی کیا کیفیت ہے، سپلائی کا نظام کیسا ہے اور جنرل نیازی کس قسم کی جنگ لڑ رہا ہے۔ انٹیلی جنس رپورٹیں ہائی کمان کے سامنے پڑی تھیں جو صاف الفاظ میں بتا رہی تھیں کہ بھارت نے بارہ ڈویژن فوج مشرقی پاکستان کے اردگرد تیار رکھی ہوئی ہے اور بھارت کی ہائی کمان ہماری صرف ایک لغزش کی منتظر ہے۔

اس کے باوجود اپنی ہائی کمان کی سوچیں کچھ اس قسم کی تھیں جیسے وہاں انٹیلی جنس رپورٹیں موجود ہی نہیں تھیں۔ ان غلط فیصلوں کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ ایوب اور یحییٰ نے بعض ایسے فوجی افسروں کو جرنیل بنا دیا تھا جو اُن کے خوشامدی حلقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جرنیلی کی وردی پہن لی تھی کبھی اپنی فوج دیکھی نہیں تھی۔ یہ میدانِ جنگ کے نہیں اسلام آباد کے جرنیل تھے اور اُن جرنیلوں سے بہت ہی مختلف جو ڈویژنوں کی کمان کر رہے تھے۔ ان سے میدانِ جنگ کے متعلق بہتر فیصلوں کی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی مگر بدنصیبی یہ تھی کہ فیصلے انہی کے ہاتھ تھے۔ دوسری وجہ جو یحییٰ خان کے قریبی حلقوں نے بیان کی ہے یہ تھی کہ ہائی کمان کے جرنیلوں کو کوئی فیصلہ لینے یا مشورہ دینے کے لیے یحییٰ خان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہر وقت شراب میں بدمست رہتا تھا۔

ان میں ایک شہزادہ پاک فضائیہ کا کمانڈر انچیف ایئر مارشل رحیم بھی تھا۔ پاک فضائیہ کی مشرقی کمان کے کمانڈر ایئر کموڈور محمد ظفر مسعود نے اُسے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے صرف سولہ سیبر طیارے اور صرف ایک ایئر فیلڈ ہے۔ اگر لڑنا ہی ہے تو دو چار لڑاکا سکواڈرن بھیجو اور یہاں کم از کم دو ایئر فیلڈ بناؤ ورنہ انڈین ایئر فورس کے دس سکواڈرن ایک ہی دن میں ہماری واحد ایئر فیلڈ کو برباد کر کے ہماری ایئر فورس کو بیکار کر دیں گے۔ پھر پاک فوج فضائی مدد کے بغیر سوائے پٹنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکے گی۔ ایئر مارشل رحیم نے غور اور ضروری کارروائی کرنے کی بجائے یہ کیا کہ ایئر کموڈور مسعود کو مشرقی کمان سے ہٹ جانے کو کہا۔ ایئر کموڈور مسعود نے جواب دیا ـــــ "مشرقی پاکستان سے ہی نہیں ہیں تو پاکستان ایئر فورس سے ہی بیٹھ جاؤں گا۔ یہ ہتھیار ڈالنے کی تقریب میں شامل نہیں ہونا چاہتا" ـــــ چنانچہ انہوں نے استعفےٰ دے دیا جو ایئر مارشل رحیم نے منظور کر کے پاکستان کو ایک جرأت مند لڑاکا ہوا باز اور سمجھے ہوئے کمانڈر سے محروم کر دیا۔

ہائی کمان کے جرنیل یحییٰ خان کی خوشنودی کو پیشِ نظر رکھے ہوئے تھے۔ اُن کے لیے پاکستان کے دفاع کی بجائے اپنی جرنیلی کا دفاع زیادہ عزیز تھا۔

ہائی کمان کی اس فضا میں مغربی پاکستان سے حملے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جنرل نیازی کو شکست کی راہ پر انڈین آرمی نے نہیں، اسلام آباد کے جرنیلوں نے ڈالا۔ مغربی پاکستان سے بھارت پر جو حملہ کیا گیا تھا اس کے نتائج کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں کہ یہ حملہ جنرل نیازی پر کیا گیا تھا۔ اس کے نقصانات بھارت کو نہیں جنرل نیازی کو ملے۔ ہم نے اسے کھلی جنگ کی تیاری اور ترتیب کی مہلت ہی نہ دی۔ البتہ بھارت کو جواز مہیا کر دیا کہ وہ فوراً مشرقی پاکستان پر ہماری اس فوج پر حملہ کر دے جو وہاں پلاٹون پلاٹون اور سیکشن سیکشن بکھری ہوئی ہے۔

انڈین ایئر فورس نے ایئر کموڈور مسعود کی پیشین گوئی اور وارننگ کے عین مطابق ایک ہی ہلّے میں ہماری واحد ایئر فیلڈ کو تباہ و برباد کر دیا۔ سولہ میں سے پانچ طیارے تباہ ہو گئے اور باقی گیارہ اپنے ہاتھوں تباہ کر دیئے گئے تاکہ دشمن کے قبضے میں نہ چلے جائیں۔ اس کے بعد آسمان انڈین ایئر فورس کے ہاتھ تھا، زمین انڈین آرمی کے ہاتھ تھی اور سمندر انڈین نیوی کے ہاتھ تھا ـــــ مشرقی پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ ہماری اپنی ہائی کمان نے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام کو ہی کر دیا تھا۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ مغربی پاکستان سے حملہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں حملہ کرنے کا پورا حق پہنچتا تھا۔ ایک محاذ سے دشمن کا دباؤ کم کرنے کے لیے اکثر دوسرا محاذ کھول دیا جاتا ہے لیکن اس اقدام کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو پورے نہ کیے جائیں تو دونوں محاذوں پر ناکامی ہوتی ہے۔ اس صدی میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کی مثال ہمارے سامنے ہے جس نے یورپ اور افریقہ میں لڑتے لڑتے روس پر حملہ کر کے ایک اور محاذ کھول دیا اور یہ نہ سوچا کہ پہلے دونوں محاذوں پر اتحادی جوابی حملے بھی کریں گے۔ اس کا جو حشر ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

اگر مشرقی محاذ سے دشمن کا دباؤ کم کرنا مقصود تھا تو مغربی محاذ کا حملہ اس قدر زوردار اور پُرعزم ہونا چاہیئے تھا کہ دشمن گھبرا کر ساری توجہ اِدھر مرکوز کر دیتا۔ اس کے ساتھ اپنی فوج کو یہ مقصد دیا جاتا کہ مشرقی پنجاب کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کرنا اور بھارت کے لیے ایسا خطرہ پیدا کرنا ہے کہ اس سے اپنی شرائط منوائی جاسکیں لیکن ایسے مقصد کے پیچھے اتنی زیادہ جنگی قوت کی ضرورت تھی جو بھارت جیسی جنگی قوت سے علاقہ چھین کر اس کے لیے مستقل خطرہ بن سکتی۔ ہمارے پاس یقیناً اتنی قوت نہیں تھی۔ مثلاً حسینی والا سیکٹر میں ہمارے ایک ڈویژن کی مختصر سی نفری نے جذبے کے زور پر اور ڈویژن کمانڈر کی ہوشمندی کی بدولت ابتدائی کامیابی حاصل کر لی۔ دشمن کو انتہائی مضبوط دفاعی بنکروں سے نکال کر دریا کے پار بھگا دیا مگر ہمارا ڈویژن دریا پار نہ کر سکا کیونکہ آگے فیروز پور کے مضافات میں دشمن نے ایک آرمرڈ ڈویژن اور ایک انفنٹری ڈویژن تیار رکھا ہوا تھا۔ دفاع میں دشمن کا تیسرا ڈویژن لڑ رہا تھا۔ یعنی صورت یہ تھی کہ ایک ڈویژن سے تین ڈویژنوں پر حملہ کرایا گیا جن میں ایک آرمرڈ ڈویژن تھا۔ ہمارے ڈویژن کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ اس کے ساتھ مجاہد فورس کی بھی پلٹنیں تھیں جو پہلے ہی ایکشن میں بھیڑوں کی طرح بھاگ آئی تھیں۔

دوسرے محاذوں پر بھی یہی کیفیت پیدا ہوئی۔ پہلے حملے میں جو چند گز علاقہ لے لیا سو لے لیا اور جب دشمن نے جوابی حملے کیے تو شکر گڑھ بھی

گیا۔ راجستھان کا ساڑھے تین ہزار مربع میل کا علاقہ بھی گیا اور کشمیر میں بھی کچھ علاقہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے حملے کے پیچھے نہ کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی عزم۔ جہاں تک پاک فوج کی فرض شناسی اور شجاعت کا تعلق ہے اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ اس جنگ میں ستمبر ۱۹۶۵ء کی نسبت شجاعت کے زیادہ مظاہرے ہوئے مگر پاک فوج کی اہلیت اور جذبہ محض رائیگاں گیا۔ یہ قصور ہائی کمان اور پلان (یا پلان کے فقدان) کا تھا۔

دوسری خرابی یہ بھی پیدا ہوئی کہ ہماری ہائی کمان اور شاید ساری ہی پاک فوج کے سامنے ستمبر ۱۹۶۵ء والی انڈین آرمی، ایئر فورس اور نیوی تھی مگر دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارت کی مسلح افواج ستمبر ۱۹۶۵ء والی نہیں تھیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد بھارت نے اپنی خامیوں اور ہماری مسلح افواج کی خوبیوں کے پیش نظر اپنی افواج کو ٹریننگ دی۔ دوسرے ملکوں سے اسلحہ خریدا، اپنے ملک میں ٹینک اور طیارے بنائے۔ افواج میں اضافہ کیا، انٹیلی جنس کو اور تیز کیا۔ اسرائیل سے جرنیل لے کر گوریلے اور کمانڈو تیار کیے اور جب بھارت دونوں محاذوں پر لڑنے کے لیے تیار ہو گیا تو اس نے مشرقی پاکستان پر توجہ مرکوز کر کے مغربی سرحدوں کو مضبوط کر دیا اور اپنی ہائی کمان کو یہ واضح مقصد دیا کہ مشرقی پاکستان کو لینا ہے اور مغربی محاذ پر صرف دفاع میں لڑنا ہے۔

اس کے برعکس ۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے بادشاہ نے فوج میں کوئی ایسا جرنیل نہ رہنے دیا جس میں آزادانہ سوچ بچار کی اہلیت تھی اور جس سے بادشاہ کو اپنے تخت کا خطرہ تھا۔ ترقیاں، جی حضوری کرنے والوں کو دی گئیں۔ یحییٰ کو کمانڈر انچیف بنانے کے لیے نہایت قابل اور تجربہ کار جرنیلوں کو فوج سے نکال دیا گیا جو یحییٰ سے سینئر تھے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ۱۹۶۵ء کے کرنل، ۱۹۷۱ء میں میجر جنرل بن چکے تھے۔ افواج کو افواج کی حیثیت سے مضبوط بنانے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ ترقیاں حاصل کرنے کے لیے ذاتی سیاست بازی اور خوشامد کی فضا پیدا کر دی گئی، اور جب یحییٰ بادشاہ بنا تو جرنیلیاں اور زیادہ ارزاں اور عام ہو گئیں۔ فوج ایک بار پھر شہروں میں آ گئی۔ مارشل لاء نے

میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بٹھا دیا۔

یہاں مجھے پیپلز ہاؤس کا مارشل لاء ہیڈ کوارٹر یاد آتا ہے۔ وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ توپخانے کے نوجوان لیفٹیننٹ اور کپتان ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں فارغ بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ اسمبلی ہال میں بھی یہی منظر دیکھا۔ میجر جنرل (ریٹائرڈ) شیریں دل خان نیازی سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ان سے بات ہوئی تو انہوں نے بڑے افسوس سے کہا کہ ان فوجی افسروں کو ہم کئی سال صرف کر کے جو ٹریننگ دیتے ہیں وہ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی بادشاہی میں چند دنوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ جو افسر ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں محض افسر بنے رہیں گے انہیں میدانِ جنگ کے لیے از سرِ نو تیار کرنے میں دو سال لگیں گے۔

یہ تھی وہ فوج جو ہم نے بھارت کی ایک نئی اور ہر لحاظ سے تیار جنگی قوت کے مقابلے میں بھیجی۔ اس کا جو حشر ہوا اس کی وضاحت کے لیے میں راجستھان سیکٹر کے صرف ایک حصے کی تصویر پیش کرتا ہوں۔

صحرائی لڑائی کے تقاضے میدانی اور پہاڑی لڑائی سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ جنگلاتی اور پہاڑی لڑائیوں میں قدرتی طور پر کچھ سہولتیں میسّر آجاتی ہیں۔ صحرا میں فوجیں ننگی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں چھپایا جا سکتا۔ صحرا کا لینڈ سکیپ دھوکے دیتا ہے۔ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہوتا، زمین کے نشان (جنہیں فوجی زبان میں "مشہور نشان" کہا جاتا ہے) ناپید ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو ذرا پیچھے ہٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ذرا پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا۔ آپ وہاں تک پیچھے ہٹیں گے جہاں پانی (واٹر ہول) ہوگا، یہ خواہ دس میل پیچھے ہو۔ اگر آپ کو یہ گوارا نہیں تو پانی کی سپلائی ساتھ رکھئے مگر دشمن کے طیارے آپ کی سپلائی کو سب سے پہلے ختم کریں گے۔

گاڑیوں، ٹریکٹروں اور ٹینکوں کے پھنس جانے کا خطرہ ہر لمحہ سر پر سوار رہتا ہے لہٰذا "ریکوری ٹیم" زیادہ بھی ہونی چاہیے تیز بھی۔ اگر ایسا نہیں تو آپ کی پھنسی کوئی گاڑی تباہ شدہ گاڑی ہوگی۔ ٹینک جو نصف گھنٹہ بوگ ڈاؤن

رہا، اسے آپ کاغذوں سے نکال دیجئے۔ دشمن کے طیارے اسے ختم کر دیں گے۔ اگر آپ کی ایئر فورس تیز ہے اور ہر لمحہ آپ کو ایئر کور میسّر ہے تو آپ لڑ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ صحرا کی وسعت اور خدوخال ایسے ہوتے ہیں کہ دشمن عقب سے آکر حملہ کر سکتا ہے۔ اگر آپ کی نفری تھوڑی ہے، پوزیشنوں کے درمیان خلا ہیں، مائن فیلڈ نہیں ہے تو عقب سے حملے زیادہ ہوں گے۔ اور ایسی بے شمار ضروریات ہیں جو پوری نہ ہوں تو صحرا میں پٹنے اور پسپائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ راجستھان میں ہمارے ڈویژن کا یہی حشر ہوا۔

راجستھان کے رحیم یار خان سیکٹر کی روئیداد سنئے:

یہاں ایک ڈویژن کو حملے کے لیے بھیجا گیا۔ اسے دو ٹینک رجمنٹیں دی گئیں۔ ایک کا ایک سکواڈرن کم تھا۔ اس ڈویژن کے دو بریگیڈ تھے۔ تیسرا بریگیڈ ابھی بنایا جا رہا تھا۔ ان دو بریگیڈوں میں سے ایک کو جو علاقہ دیا گیا وہ بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے ذمے جو کام لگایا گیا وہ ایک بریگیڈ کی استطاعت سے باہر تھا۔ اسے ستر میل لمبا فرنٹ دیا گیا۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ اس بریگیڈ کو حملہ کرنا بھی تھا، جوابی حملے بھی روکنے تھے، دوسرے بریگیڈ کو کمک اور مدد بھی دینی تھی۔ دشمن اگر عقب میں آنے کی کوشش کرے تو اسے بھی روکنا تھا۔ اس بریگیڈ کو دشمن کے متعلق کوئی معلومات نہیں دی گئیں۔ بریگیڈ کو پلان دکھایا نہیں گیا نہ بریگیڈ کمانڈر سے مشورہ لیا گیا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ ڈویژن کے پاس بھی سوائے حملے کے حکم کے کوئی واضح پلان نہیں تھا یا کوئی مقصد واضح نہیں تھا۔ ہائی کمان نے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ صحرائی جنگ میں جو فوج بھیجی گئی ہے وہ اتنا وسیع علاقہ سنبھال بھی سکے گی یا نہیں۔ اس کے علاوہ ٹینک اچھی حالت میں نہیں تھے۔ انفنٹری کے پاس گاڑیاں ناکافی تھیں اور جو تھیں وہ بہت پرانی تھیں۔

دوسرا بریگیڈ علاقے سے واقف تھا اور یہاں ٹریننگ بھی کر چکا تھا مگر یہی کافی نہیں تھا۔ تیسرا بریگیڈ ابھی آیا نہیں تھا۔ اس کے لیے اِدھر اُدھر

سے نفری اکٹھی کی جا رہی تھی۔ ان حالات میں یہ حکم دیا گیا کہ دشمن کے علاقے میں دُور اندر جا کر حملہ کرنا ہے اور دشمن جن راستوں سے پیشقدمی کر سکتا ہے ان راستوں پر دفاعی پوزیشنیں بھی قائم کرنی ہیں۔ ان دفاعی پوزیشنوں کے لیے مجاہدوں کی چار پلٹنیں مقرر کی گئیں۔ یہ مجاہد فورس کی پلٹنیں تھیں جن میں طلبا، دکاندار، کلرک اور دیگر شہری شامل تھے۔ انہیں تھوڑی سی فوجی ٹریننگ دی گئی تھی۔ جنگ کے متعلق ان کا تصوّر محض جذباتی تھا۔ وہ میدانِ جنگ کی صرف تکالیف ہی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بموں، راکٹوں، توپوں اور ٹینکوں کے دھماکوں سے وہ ناآشنا تھے۔ یہ لوگ چھاؤنیوں میں صرف پہرہ دے سکتے تھے مگر انہیں صحرائی جنگ میں ایک بریگیڈ کے ساتھ بھیج دیا گیا۔

حملے کا وقت ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء رات ساڑھے نو بجے مقرر کیا گیا۔ حملہ ابھی سرحد پر جمع ہو کر شروع کرنا تھا۔ گاڑیوں کی کمی پوری کرنے کے لیے زراعتی ٹریکٹر حاصل کیے گئے تھے جن کے ڈرائیور سویلین تھے۔ ان کے پیچھے ٹرالیاں باندھی گئی تھیں۔ حکم کے مطابق دشمن کے علاقے میں دُور اندر تک جانا اور اہم مقامات پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ مقامات لونگانے والا، رام گڑھ اور جیسلمیر تھے۔ جیسلمیر ایک دُور دراز مقام تھا جہاں تک سحر کے وقت پہنچنے کا حکم ملا تھا جو محض ناممکن تھا کیونکہ ٹینک بھی اچھی حالت میں نہیں تھے، گاڑیاں ناکافی بھی تھیں اور پرانی بھی۔ ایک بریگیڈیئر نے (جس کا نام مصلحتاً حذف کیا جا رہا ہے) ڈویژن کمانڈر سے کہا کہ ہمیں منہ میں اتنا ہی لقمہ ڈالنا چاہیے جو ہم چبا اور نگل سکیں۔ مطلوبہ وقت تک جیسلمیر پہنچنا ہی محال ہے، قبضہ تو بعد کی بات ہے۔ دشمن سویا ہوا تو نہیں ہے۔

"میں حکم دے رہا ہوں مشورے نہیں لے رہا" — ڈویژن کمانڈر نے کہا — "میرا حکم یہ ہے کہ جیسلمیر کی ایئر فیلڈ پر قبضہ کر کے اسے تباہ کیا جائے۔"

اس نادر شاہی حکم کے ساتھ ہمارے جرنیل نے پورے کا پورا ڈویژن حملے کے لیے بھیج دیا۔ جرنیل کو ٹریکٹروں پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اُسے بالکل

خیال نہیں تھا کہ پیچھے لائن آف کمیونیکیشن اور سپلائی لائن کی کیفیت کیا ہے۔

آخر حملے کی اجتماع گاہ کی طرف کوچ شروع ہوا۔ زیادہ تر گاڑیاں شہری ٹرک تھے۔ یہ ٹرک اور ٹریکٹر بہت سا وقت ضائع کر کے مطلوبہ مقام تک پہنچے۔ یہ ۲/۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات تھی۔ وقت بچانے کے لیے جوانوں کو پیدل روانہ کر دیا گیا۔ صحرا میں پیدل چلنا بےحد دشوار ہوتا ہے۔ چلنے والے میدانوں کی نسبت جلدی تھک جاتے ہیں کیونکہ پاؤں ریت میں دھنس جاتے ہیں۔ رفتار بھی کچھ نہیں ہوتی۔ ان کے پیچھے ٹرک اور ٹریکٹر بھیج دیئے گئے۔ جوان ان میں سوار ہوئے۔ تھوڑا آگے جا کر ایسا ریتلا علاقہ شروع ہو گیا جہاں ٹرک اور ٹریکٹر پھنس گئے۔

دوسری صبح صحرا میں یہ منظر تھا کہ جوان ٹرکوں کو دھکیل رہے تھے۔ پہلے وہ پیدل چلتے رہے تھے۔ جب ان کی سواری کے لیے ٹرک آئے تو بجائے اس کے کہ جوان ٹرکوں پر سوار ہوتے، ٹرک جوانوں پر سوار ہو گئے۔ صبح تک دھکیلتے دھکیلتے جوانوں کے جسم شل ہو چکے تھے۔ اب ٹرک کو دھکا دینا تو درکنار وہ اب چلنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دن کے تین بجے جوان مطلوبہ جگہ تک پہنچے۔ وہاں تک انہوں نے پینتیس میل سفر طے کیا تھا۔ صحرا کے پینتیس میل میدان کے ایک سو پینتیس میل کے برابر ہوتے ہیں۔ اس سفر میں انہیں ٹرک بھی دھکیلنے اور گھسیٹنے پڑے تھے۔ یہی دشواری اس توپ خانہ رجمنٹ کو پیش آئی جسے حملے میں شریک ہونا تھا۔ توپوں کو کھینچنے والے ٹریکٹر ریت میں دھنس گئے تھے اور دو توپیں راستے میں ہی پھنسی رہ گئی تھیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ٹرانسپورٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ حملے کا حکم تو دے دیا گیا تھا، لیکن حملے کا اجتماع گاہ تک پہنچنے کا راستہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ وہاں ۳ دسمبر یعنی حملے سے تھوڑی دیر پہلے تک حملہ آور ٹروپس حملے کی حالت میں نہیں تھے۔ توپ خانہ ابھی تیار نہیں تھا۔ ابھی پوری یونٹیں نہیں پہنچی تھیں۔ ایک ٹینک رجمنٹ پہنچ گئی تھی۔ دوسری ابھی راستے میں تھی، اور

رات کا ایک بج چکا تھا۔ حملہ رات ساڑھے نو بجے کرنا تھا۔ پلان اور ڈویژن کے احکام کے مطابق تمام فورس کو رات ساڑھے نو بجے اجتماع گاہ تک پہنچنا تھا۔ ایک راستہ تھا جس سے سب کو آنا تھا لیکن ملٹری پولیس کا چونکہ کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے لوگ راستے سے بھٹک کر ادھر اُدھر گاڑیاں پھنسا رہے تھے۔ رات ایک بجے تک اس راستے کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پھنسے ہوئے ٹینکوں اور گاڑیوں سے راستہ بند ہو چکا تھا، اس لیے پیچھے آنے والی یونٹوں کی گاڑیوں اور ٹینکوں کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ راستے سے ہٹتے تھے تو گاڑیاں ریت میں دھنس جاتی تھیں۔

عینی شاہد بتاتے ہیں کہ یونٹیں ایک دوسری میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ جوان اندھیرے میں اپنی یونٹوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ٹینک اپنے سکواڈرنوں سے الگ ہو گئے۔ توپیں کھینچنے والے ٹریکٹر بھی انفنٹری اور بکتر بند یونٹوں کے ٹریکٹروں سے جا ملے تھے اور اس طرح یونٹوں کی مرکزیت اور جمعیت بکھر گئی تھی۔

راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے ایک پورا بریگیڈ جسے حملے میں شریک ہونا تھا دو بجے رات تک اپنی جگہ سے اجتماع گاہ کی طرف چلا ہی نہیں تھا کیونکہ جو واحد راستہ آگے جاتا تھا وہ بُری طرح بند تھا۔ سحر طلوع ہو رہی تھی۔ یہ ۴ دسمبر کی سحر تھی۔ حملہ دن کے وقت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ورنہ دشمن کے طیارے بُری حالت کر دیتے، چنانچہ حملہ ابھی رات کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ یہ ناکامی کے پہلے آثار تھے جو خبردار کر رہے تھے کہ ٹرانسپورٹ، رابطے اور رسد کے انتظامات ناقص ہیں جو جنگ میں اور زیادہ پریشان کُن ہو جائیں گے۔

اُس وقت تک دوسرے محاذوں پر حملے کیے جا چکے تھے۔ حسینی والا اور سلیمانکی سیکٹر میں امید افزا کامیابی حاصل کر لی گئی تھی اور لاہور سیکٹر میں جنگ دشمن کی سرحد کے اندر لڑی جا رہی تھی مگر راجستھان سیکٹر میں حملہ بدانتظامی کی نذر ہو گیا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہائی کمان کو بتایا جاتا کہ رحیم یار خان سیکٹر میں ان دشواریوں کی وجہ سے حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب

تک انتظامات مکمل اور بہتر نہ ہو جائیں حملہ نہ کیا جائے اور اگر دشمن حملہ کرے تو صرف دفاع میں لڑا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈویژن کمانڈر ہائی کمان سے گھبراتا تھا یا ہائی کمان نے اُسے کہا تھا کہ حملہ ضرور کیا جائے۔

حملے کے نئے احکام دیئے گئے جن کے مطابق حملے کا وقت تین بجے سحر ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء مقرر کیا گیا۔ یونٹوں میں کچھ ردوبدل کیا گیا لیکن ٹرانسپورٹ رابطے اور رسد کی مخدوش حالت کو دیکھ کر کوئی بھی سوجھ بوجھ والا فوجی افسر رائے دے سکتا تھا کہ یہ حملہ صرف اس حد تک کامیاب ہو گا کہ دشمن کو بے خبری میں پکڑ لے گا اس لیے تھوڑی سی کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ حملہ غیر متوقع سمت سے کیا جا رہا تھا یعنی دشمن اس سمت سے حملے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اچانک حملے کی صورت میں دشمن بوکھلا کر پسپا ہو جائے گا لیکن وہاں صرف اس صورت میں قبضہ برقرار رکھا جا سکتا تھا کہ ایئر فورس کی بھرپور مدد ملے جو دشمن کی ایئر فورس کو دور رکھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ٹروپس برق رفتاری سے حملے کی رفتار اور شدت کو برقرار رکھیں مگر ہمارے ہاں ایئر فورس کی سپورٹ بھی مشکوک تھی اور حملے کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے سویلین ٹریکٹر نقصان دہ تھے۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ امدادی انتظامات بہتر بنائے بغیر حملہ کر دیا گیا۔ لیکن علاقے کی خرابی اور دوسرے بریگیڈ کو پچاس میل کا سفر ٹرانسپورٹ اور راستے کی دشواریوں کے خلاف جدوجہد کرتے، طے کر کے حملے میں شریک ہونا پڑا۔ یہ بریگیڈ فوری طور پر حملے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس بریگیڈ کی یونٹوں کا بھی اجتماع گاہ تک پہنچنے تک وہی حشر ہوا جو گزشتہ رات یونٹوں کا ہو چکا تھا۔ شہری انتظامیہ سے ٹریکٹر اور ٹرک مانگے جو روانگی کے اصل وقت سے بہت دیر بعد پہنچے اور جب چلے تو وہ راستے میں ہی ایک ایک کر کے ریت میں دھنسنے اور خراب ہونے لگے۔

ٹینکوں کی بھی یہی کیفیت تھی۔ آر۔ آر گنیں اور توپیں بھی راستے میں پھنس گئی تھیں۔ بدانتظامی کا یہ عالم تھا کہ ریکوری (ٹینکوں اور گاڑیوں کو نکالنے

اور مرمت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ جن جوانوں کو تھوڑی دیر بعد حملے میں شریک ہونا تھا وہ دسمبر کی یخ رات میں گاڑیوں کو دھکیل رہے تھے۔

صبح چار بجے انفنٹری یونٹوں کے جوان، گاڑیاں دھکیل دھکیل کر تنگ آگئے تو پیدل مطلوبہ جگہ تک پہنچے۔ ٹینک رجمنٹ بھی پہنچ گئی لیکن صرف چھ ٹینک۔ باقی تمام ٹینک راستے میں پھنس گئے تھے۔ ان میں بعض کے انجن خراب ہو گئے تھے۔ ان چھ ٹینکوں کو ہی مشن دے دیا گیا۔ پہلا بریگیڈ حملہ کر چکا تھا مگر غلط مقام پر۔ اسے رام گڑھ لینا تھا لیکن لونگانے والا پر حملہ کیا جہاں پیچھے آنے والے بریگیڈ کو قبضہ کرنا تھا۔

وہاں پہلے بریگیڈ نے قبضہ تو کر لیا تھا لیکن افسروں اور جوانوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دشمن کے علاقے میں اتنی دُور اندر لے جا کر ان سے حملہ کرایا گیا تھا۔ یونٹیں اور ان کی کمپنیاں وغیرہ اتنے وسیع علاقے میں اس طرح بکھر گئی تھیں کہ رابطہ قائم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ رسد ناپید تھی۔ صبح ہوتے ہی دشمن کی ایئر فورس آگئی۔ پھنسے ہوئے ٹینک، توپیں، ٹریکٹر اور گاڑیاں سارے صحرا میں بھارتی ہوا بازوں کو نہایت آسان شکار کی دعوت دے رہی تھیں۔ بھارتی طیارے غوطوں میں جا کر راکٹ اور مشین گنیں فائر کر رہے تھے اور چند منٹ بعد صحرا میں جدھر دیکھو سیاہ دھواں اُٹھ رہا تھا ___ اپنی ایئر فورس کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ سارے صحرا میں افراتفری کا عالم تھا۔

بعض یونٹوں کے جوان بلا مقصد بھٹک رہے تھے۔ ایک توپ خانہ رجمنٹ (فیلڈ) فارغ بیٹھی تھی۔ اس کے کمانڈنگ آفیسر کو کہا گیا تھا کہ ٹینکوں کی گنیں توپخانے کا کام کر رہی ہیں۔ ایک ٹینک رجمنٹ کا یہ عالم تھا کہ اس میں صرف دو یا تین ٹینک رہ گئے تھے۔ باقی راستے میں دھنس گئے یا خراب ہو گئے اور جو ایکشن میں گئے ان میں سے بہت سے دشمن کے طیاروں نے تباہ کر دیئے۔ پوری کی پوری ٹینک رجمنٹ صاف ہو گئی۔ دوسری ٹینک رجمنٹ کی بھی حالت دگرگوں تھی۔ ٹینک اچھی طرح چھپائے نہیں گئے تھے اس لیے طیاروں کا شکار ہو گئے۔ یہ چین کے T-59 ٹینک تھے جن کی طیارہ شکن

گنیں نہایت صحیح فائر کرتی ہیں مگر ٹینک سوار ٹینکوں سے نکل کر دُور کہیں چھپ گئے تھے کیونکہ دشمن کے طیاروں نے قیامت بپا کر رکھی تھی۔

مورال ختم ہو چکا تھا۔ بعض جوان یہ افواہ سُن کر واپس چل پڑے کہ ساری فورس کو پیچھے ہٹنے کا حکم مل گیا ہے۔ یہاں تک کہ یونٹ کمانڈر کھلے لفظوں میں پلان بنانے والوں کو کوسنے لگے۔ وہ لڑنا چاہتے تھے۔ انہیں پسپائی منظور نہیں تھی لیکن وہ اپنے ٹروپس کا قتلِ عام بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ایسی بد انتظامی میں ایسے منظم دشمن کے خلاف لڑ کر بے مقصد مرنے اور اپنے جوان مروانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ڈویژن ہیڈ کوارٹر بہت ہی دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ بریگیڈوں کے ہیڈ کوارٹر بھی اتنی اتنی دُور تھے کہ انہیں پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا کہ ان کے ٹروپس کس حال میں ہیں۔ آگے لڑنے والے افسر کہتے تھے کہ آگے دشمن کی نفری بہت زیادہ ہے مگر ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے انہیں انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق دشمن سے متعلق کوئی معلومات نہیں مل رہی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آگے دشمن کی کوئی بڑی فوج نہیں تھی۔ بمشکل ایک بٹالین اور چند ایک ٹینک تھے۔ دشمن کی طرف سے کوئی ایسی گولہ باری بھی نہیں ہو رہی تھی جو بتاتی کہ وہاں کتنی کچھ فوج ہے۔ لونگانے والا پر خاصی جھجک کے بعد حملہ کیا گیا مگر دشمن کے طیاروں نے ہمارے ٹینکوں اور ٹروپس کا بُرا حال کر دیا۔ اس کے باوجود ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر لونگانے والا پوسٹ کو ٹینکوں سے تباہ کر دینا چاہتا تھا مگر اسے پیچھے جانے کا حکم دیا گیا۔ یونٹ کمانڈر اب احتجاج کے رنگ میں باتیں کرنے لگے تھے۔ ایک ٹینک رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کو یہاں تک کہتے سُنا گیا کہ میں اپنے بریگیڈ کمانڈر کا کوئی حکم نہیں مانوں گا۔ اُس نے میری رجمنٹ تباہ کرا دی ہے اور مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا۔

ایسی صورتِ حال میں جہاں یونٹ کمانڈر، بریگیڈ یا ڈویژن کے احکام سے بدظن ہو جائیں اور انہیں یہ احساس ہو جائے کہ انہیں غلط احکام دیئے

جارہے ہیں، وہاں کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بریگیڈ کمانڈروں میں بھی اختلاف پیدا ہوگئے۔ ایک بریگیڈیئر ٹروپس کا مورال بحال کرنے کے لیے نوئگانے والا پہ حملہ کرنا چاہتا تھا مگر دوسرا اس کے خلاف تھا۔ کہتا تھا کہ جوان تھکے ہوئے ہیں اور ایمونیشن کم ہے۔

اس کے فوراً بعد دشمن نے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ ہر حملے کے ساتھ دشمن کو توپخانے کی گولہ باری اور طیّاروں کی مدد حاصل ہوتی تھی۔ ان حملوں نے ہمارے افسروں اور جوانوں کا مورال بحال کر دیا۔ وہ پُورے جذبے سے لڑنے لگے۔ اس صورتِ حال میں ڈویژن کمانڈر سے کہا گیا کہ اپنی ایئر فورس کی مدد لے اور ایمونیشن طیّاروں کے ذریعے اگلے مورچوں میں پھینکا جائے کیونکہ گاڑیوں سے ایمونیشن آگے پہنچانا وقت طلب بھی تھا اور خطرناک بھی۔ دشمن کی ایئر فورس اب اس قدر سرگرم ہوگئی تھی کہ پانی کی گاڑیاں، راشن کی گاڑیاں اور ایمونیشن کی گاڑیاں بھی طیاروں سے دھڑا دھڑ تباہ ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد دشمن نے توپخانے کی گولہ باری اور حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ہمارے ٹروپس میں اب اتنی جان آگئی تھی کہ انہوں نے ہر حملہ پسپا کیا اور دشمن کے ٹینک بھی تباہ کیے۔ مگر ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد ٹروپس کا جذبہ اور مورال ایمونیشن اور دیگر سپلائی کے فقدان کی نذر ہو گیا۔

ڈویژن کمانڈر نے دو دفعہ پیچھے ہٹنے کے احکام بھیجے جو آگے لڑنے والے یونٹ کمانڈر کسی نہ کسی بہانے التوا میں ڈالتے رہے مگر انہیں نہ ایئر فورس کی سپورٹ ملی نہ انہیں ایمونیشن پہنچایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن نے بڑے پیمانے پر حملے شروع کر دیئے۔ اس کے ٹینکوں نے تباہی بپا کر دی۔ ٹینکوں کو طیّاروں کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ اب دفاع میں لڑنا بھی محال ہو رہا تھا۔ کئی جوان پیچھے کو بھاگے آرہے تھے۔ ان میں کئی ایک پانی مانگ رہے تھے۔ بعض ٹینکوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ کئی ایسے تھے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔ ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کو ننگے پاؤں

دیکھا گیا۔ صحرا میں تباہ شدہ گاڑیاں، ٹریکٹر اور ٹینک بکھرے پڑے تھے۔

آخر پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ حکم نئے ڈویژن کمانڈر نے دیا تھا کیونکہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ دشمن بہت آگے آجائے گا۔ پہلے ڈویژن کمانڈر کو کمان سے سبکدوش کر دیا گیا۔ یہاں سے تو دشمن آگے نہ آسکا۔ البتہ اس علاقے کے شمال میں دشمن نے کچھ علاقہ اور جنوب میں مونا باؤ سے نگر پارکر تک کی سرحد سے اندر آکر ہمارا بے شمار علاقہ لے لیا جو مجموعی طور پر ساڑھے تین ہزار مربع میل تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مغربی پاکستان سے حملے کا حکم سوچے سمجھے بغیر دیا گیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہُوا کہ بھارت کو کھُلی جنگ کا جواز مل گیا۔ اُس نے ایک ہی بار فوج کشی کر کے مشرقی پاکستان لے لیا۔

یہ تھی مغربی پاکستان کے محاذ کی صورتِ حال لیکن مشرقی پاکستان میں لڑنے والے اپنے ٹروپس کو اس مخدوش صورتِ حال سے بے خبر رکھا جا رہا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ انہیں دھوکہ دیا جا رہا تھا تاکہ وہ لڑتے رہیں اور اتنا نقصان اٹھائیں اور ایسے بے حال ہو جائیں کہ ہتھیار ڈال دیں اور مشرقی پاکستان سے چھٹکارا حاصل ہو۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ مغربی محاذ پہ اپنی فوج کو شکست دلانے کے لیے کیسے کیسے دھوکے دیئے گئے۔ یہ وہ فوج ہے جس نے بہت ہی قلیل تعداد میں ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت کے اکیس ڈویژنوں کا منہ پھیر دیا تھا۔ اُس وقت پاک فوج کے پاس دشمن کے جدید اور برتر ہتھیاروں کے مقابلے میں گھٹیا اور قدیم ہتھیار تھے۔ اِس فوج کو غیر ملکی جنگی وقائع نگاروں نے "دُنیا کی عمدہ" فوج کہا تھا۔ بی بی سی کے نمائندے نے محاذوں کا آنکھوں دیکھا حال لکھا تھا جس میں اُس نے پاک فوج کے افسروں اور جوانوں کو FINEST SOLDIERS ON EARTH کہا تھا۔ پھر اس فوج کو چھ ہی سال میں کیا ہوگیا تھا جب اس کے پاس جدید ہتھیار تھے۔ اور چین کے دیئے ہوئے نئے ٹینک بھی تھے؟ — آپ یہ نکتہ سمجھ لیں تو سقوطِ مشرقی پاکستان کا راز پالیں گے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

پاکستان کے ایک مشہور جرنیل میجر جنرل (ریٹائرڈ) سرفراز خان، ہلالِ جرأت، ستارۂ جرأت کراس کی رائے پیش کی جائے۔ جنرل سرفراز خان نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں صرف ایک ڈویژن سے دشمن کے تین ڈویژنوں کا حملہ نہ صرف روکا تھا بلکہ جنگ کے تیسرے ہی روز جوابی حملہ کر کے دشمن کی سرحد کے اندر چلے گئے اور کچھ علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے قلیل تعداد ٹروپس کو ایسے کلاسیکل طریقے سے لڑایا تھا کہ دشمن بی آر بی سے آگے نہ آ سکا۔ دشمن کا سب سے زیادہ جانی نقصان اسی سیکٹر میں ہوا تھا۔

جنرل سرفراز خان جو شام کے سفیر بھی رہ چکے ہیں، جنگوں کی تاریخ اور بڑی بڑی جنگی طاقتوں کے عروج و زوال کی تاریخ پر عبور رکھتے ہیں۔ جنرل موصوف جرنیل بھی ہیں اور عالم بھی۔ ہم نے اُن سے یہ گفتگو کچھ عرصہ پہلے کی تھی۔ یہ انہی کے الفاظ میں پیش کی جاتی ہے۔

"مشرقی پاکستان میں اسی ہزار جری اور بہادر جانبازوں کا ساتھ جرنیلوں سمیت ہتھیار ڈالنا اور بھارت کا فاتح کی حیثیت سے ڈھاکہ میں داخل ہونا ہر پاکستانی کے سینے میں جس کی رگوں میں حمیت اور غیرت کا ایک قطرہ خون بھی موجود ہے، ایک ایسا گہرا زخم ہے جس کا اندمال کبھی ممکن نہیں" —— جنرل سرفراز خان نے کہا —— اگر یہ اسی ہزار جانباز ایک ایک کر کے وطنِ عزیز کے دفاع میں شہید ہو جاتے تو ہمیں مشرقی پاکستان کے المیہ کا کچھ دُکھ نہ ہوتا، مگر اسی ہزار فوج کا ذلت آمیز سقوط ایک ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ فہم صدمہ ہے۔"

"جنرل صاحب!" —— ہم نے کہا —— "کیا کبھی ہم اس شکست کا انتقام لینے کے قابل ہو سکیں گے؟"

"انشاء اللہ!" —— جنرل صاحب نے کہا —— "بھارت کے ساتھ ہمارا وعدہ ہے کہ اس کا اُدھار ہم کوڑی کوڑی چکائیں گے۔ اگر ہم سے نہ ہو سکا تو ہماری نسلیں چکائیں گی، اور اگر اُن سے بھی نہ ہو سکا تو پھر اُن کی نسلیں چکائیں گی۔ ہمارا یہ وعدہ اٹل اور ابدی ہے۔ اس المیے کی بیلنس شیٹ یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس المیہ باب کے جو مصنف ہیں ان کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا، خواہ ان کا جرم نااہل قیادت کا نتیجہ ہو یا منظم اندرونی، بیرونی یا مخلوط سازش کا نتیجہ ہو۔ یہ دنیا کے قانون سے بچ سکتے ہیں، اللہ کے قانون سے نہیں۔"

"کیا مشرقی پاکستان کا المیہ افواجِ پاکستان کی شکست کا نتیجہ ہے؟" —— ہم نے پوچھا۔ "یا کیا یہ یحییٰ خان اور اس کی جنتا کی نااہل قیادت کا نتیجہ ہے یا یہ بیرونی سازش کا نتیجہ ہے؟"

"اس جانکاہ المیہ کے بہت کچھ حالات ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں" جنرل سرفراز خان نے جواب دیا —— "مگر کچھ حالات روزِ روشن کی طرح عیاں بھی ہیں۔ میں ان حالات کو قارئین کے سامنے غیر جانبدار فوجی محقق کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں جو امور ایک فوجی مہم اور جنگ پہ اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:

۱۔ غیر ملکی طاقتوں، خصوصاً عالمی طاقتوں کے متاثرہ علاقے میں مفادِ پرستانہ عزائم کیا ہیں اور ان عزائم کے ہوتے ہوئے ان کی خفیہ چالوں کا اثر کیا ہے؟

۲۔ متحارب فریقین کا سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کیا ہے اور وہ جنگ کے بوجھ کو کہاں تک برداشت کر سکتا ہے؟

۳۔ اعلیٰ قیادت کا فنی معیار اور اخلاقی توازن کیا ہے اور کیا ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ناساعد حالات میں بلند کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے عالی حوصلگی اور قوتِ فیصلہ کے استحکامی عناصر کو بروئے کار لا سکیں گے؟

۴۔ متحارب ہائی کمانڈ جس میں بری فوج، فضائیہ اور بحریہ کی کمانڈ شامل ہے۔ دشمن کے پولیٹیکل، سٹریٹیجیکل عزائم کو کہاں تک بھانپ سکتی ہے اور کہاں تک اس کا سدِباب کر سکتی ہے؟ آیا ان میں فکری ہم آہنگی موجود ہے اور کیا وہ اپنے جنگی نصب العین کو اچھی طرح پہچانتے ہیں؟ اور اس کو پہچانتے ہوئے اپنے نصب العین کے حصول میں

غیر متزلزل ارادے سے گامزن رہ سکتے ہیں؟

۵۔ کیا ہائی کمانڈ کے اراکین میں تنظیم اور اعلیٰ لیڈر شپ کی صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ فوج میں ناقابلِ تسخیر عزم، بھروسے اور یقین کے جذبات ابھار سکتے ہیں یا نہیں؟

۶۔ کیا متحارب فریقین میں جنگی سامان بنانے کے ذرائع موجود ہیں؟ اگر نہیں تو ذخائر اکٹھے کرنے کے لیے کون سے اقدام کیے گئے ہیں اور جنگ میں نقصان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے انہیں معتمد دوستوں کی اعانت کہاں تک میسر ہے؟

ہم ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کو انہی امور کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں گے....

"جنوبی ایشیا میں چین، روس اور امریکہ کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھارت کے لیے مشرقی پاکستان کا خطہ جو اب بنگلہ دیش کہلاتا ہے، اہم ترین سٹریٹیجکل اہمیت کا حامل ہے، چین اور بھارت کا ایک تصادم ہو چکا ہے جس کے بعد ان کے تعلقات متواتر ناخوشگوار ہوتے چلے گئے ہیں۔ نیفا میں بھارتی افواج چین کے خلاف دفاع میں صف آرا ہیں۔ نیفا کو رسد اور کمک پہنچانے کا راستہ بنگلہ دیش کے شمال میں ایک تنگ اور غیر محفوظ وادی سے گزرتا ہے جو بنگلہ دیش سے فوجی کارروائی کر کے کسی بھی وقت کاٹا جا سکتا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان کا جغرافیائی محلِ وقوع نیفا کے دل میں ایک نوکدار خنجر کی طرح اترا ہوا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان پر بھارت کے تسلط سے یا کسی دوست حکومت کے قیام سے یہ خطرہ نہ صرف ٹل سکتا ہے بلکہ بھارتی سلسلۂ دفاع کو مزید وسعت مل سکتی ہے اور اس کے علاوہ سمندر اور خشکی کے وسیع متبادل راستے بھی اُس کے تصرف میں آ سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا خطہ بھارت کے لیے چین کے خلاف ایک مؤثر بیس (اڈے) کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے بھارت ہر قسم کا خطرہ مول لینے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار تھا....

"انہی عزائم کی تکمیل کے لیے بھارت نے 'بنگلہ دیش' کا مسئلہ کھڑا کیا اور مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے کا بہانہ تلاش کیا جس کا بھیانک نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اس فوجی نقطۂ نظر کے علاوہ یہ امر بھی اپنی جگہ خاص اہمیت کا حامل ہے کہ سابق مشرقی پاکستان میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کی آبادی تھی جو مذہبی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی روایات کے نقطۂ نظر سے بھارت کے ساتھ زیادہ وابستہ تھی۔ برِ صغیر کی تقسیم سے پہلے قریب قریب مشرقی بنگال کا تمام اقتصادی نظام ہندو تاجروں اور صنعت کاروں کے ہاتھوں میں تھا جسے تقسیم کے بعد نمایاں تنزل ہوا۔ مشرقی پاکستان پر بھارت کا تسلط یا بھارت کی کٹھ پتلی حکومت کا قیام نہ صرف ان کی فوجی حکمتِ عملی کی ضرورت پوری کرتا تھا بلکہ ان کی اقتصادی بدحالی کا ازالہ بھی کرتا تھا....

"چین پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ رُوس اور امریکہ دونوں چین کی ناکہ بندی پر متفق اور متحد ہیں اور اسے مؤثر بنانے کے لیے بھارت کو آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصے سے امریکہ اور رُوس پُرامن بقائے باہمی کے راستے پر گامزن تھے اور نظریاتی اختلافات کے باوجود چین کی ناکہ بندی کو قدرِ مشترک بنائے ہوئے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے چین بھارت تصادم کے بعد بھارت جو کسی وقت غیر جانبدار پالیسی پر سختی سے کاربند تھا، اب اپنی فوجی قوت کو مضبوط اور مربوط کرنے کے لیے امریکہ اور روس کا آلۂ کار بن گیا۔ اور دونوں ملکوں سے اقتصادی اور فوجی امداد لینے لگا....

"دوسری جانب بھارت کی مخاصمت چین اور پاکستان کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ متحد اور مستحکم پاکستان کا وجود چین کے لیے اشد اہمیت کا حامل ہونا چاہیے، ورنہ جنوبی ایشیا میں وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پائے گا۔ خلیج بنگال اور مشرقی پاکستان میں بھارت یا روس کا کنٹرول یا اثر و رسوخ چین کے تحفظ کے لیے کس قدر مہلک ثابت ہو سکتا تھا، چین اس کے احساس سے غافل نہیں تھا اس لیے نہیں کہ صورتِ حال اس کی توسیع میں رکاوٹ کا باعث بنے گی۔ بلکہ اس لیے کہ سہ طرفہ

گٹھ جوڑ کا شکنجہ کسی نہ کسی وقت اس کا اپنا گلا بھی گھونٹ دے گا...

"اب دیکھنا یہ ہے کہ بھارت اور اس کے حامیوں کی جانب سے چین اور پاکستان کو جو خطرہ لاحق تھا اس نے چین اور پاکستان کے درمیان کس حد تک ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اور فوجی نقطۂ نظر سے دونوں طاقتوں نے متحد ہو کر اس مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے کون سے مؤثر اقدام کیے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چین نے پاکستان کے حق میں نہایت مؤثر رول ادا کیا تھا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ چین کے رویّے کے باعث کسی تشویش کا باعث نہ بنا۔ ۱۹۶۵ء سے لے کر اب تک چین ہمیں اقتصادی اور فوجی امداد دیتا رہا ہے لیکن اس کے مقابلے میں بھارت کو روس اور امریکہ سے جو امداد ملتی رہی وہ وسیع تر پیمانے پر تھی۔ چین کی دوستی پاکستان کے حق میں اس صورت میں ثمر آور ثابت ہو سکتی ہے کہ چین کے ساتھ ہمارا دفاعی معاہدہ ہو جس میں فریقین میں سے کسی پر حملے کی صورت میں عملاً مداخلت کی ضمانت موجود ہوتی...

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان نے اس واضح حقیقت کی طرف کیوں قدم نہ بڑھایا؟ خصوصاً اُس وقت جب بھارت اور روس کے درمیان دفاعی معاہدہ ہو چکا تھا جس کی رُو سے بھارت کے حق میں روس کی مؤثر مداخلت ایک یقینی امر بن چکی تھی۔ ہماری وزارتِ خارجہ کے دیوالیہ پن کی اس سے بدترین مثال شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ اس ضمن میں ذہن میں یہ سوال بھی اُبھرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے چین کا ردِ عمل سرد رہا ہو یا اُمید افزا نہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے چین کے شمال میں روسی افواج کی نقل و حرکت سے چین دب گیا ہو۔ ہو سکتا ہے چین اقوام متحدہ میں داخل ہونے کے بعد محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔ اگر اس قسم کے امکانات موجود تھے تو مشرقی پاکستان کے مسئلے کو فوجی کارروائی سے حل کرنا ایک احمقانہ فعل تھا یا ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ واقعات جو منظرِ عام پر آئے وہ یہ تھے کہ وزارتِ خارجہ نے بار بار اصرار کے ساتھ کہا کہ چین اور پاکستان کی دوستی

اس قدر مستحکم اور غیر متزلزل ہے کہ کسی رسمی معاہدے کی ضرورت ہی نہیں...

"اس کے بعد جناب بھٹو مرحوم کی چین سے فاتحانہ مراجعت نے ہمارے حوصلے اور توقعات اور بھی بڑھا دیں لیکن اس کا ثمر یہی ملا کہ چین پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہ بچا سکا۔ یہ ٹریجیڈی وزارتِ خارجہ کی نااہلی کی وجہ سے ہوئی یا خود چین کی گریز پا پالیسی کی وجہ سے، اس کا نوٹس لینا چاہیئے تھا۔ پہلی صورت میں متعلقہ افسروں کے خلاف مناسب کارروائی ہونی چاہیئے اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمیں کسی متبادل انتظام کی ضرورت ہے؟...

"امریکہ اور روس بظاہر پُرامن بقائے باہمی کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ روس، بھارت اور امریکہ کے درمیان چین کی ناکہ بندی قدرِ مشترک ہے۔ روس کے قدیم اور ازلی سٹریٹیجکل عزائم یہی رہے ہیں کہ گرم سمندروں میں اسے اڈے جمانے کے لیے کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے۔ امریکہ اور روس کے درمیان بقائے باہمی کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو عقلِ سلیم یہ تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ مشرقی پاکستان اور خلیج بنگال سے پاکستان کے انخلا کے متعلق ان دونوں میں کچھ سمجھوتہ ہے۔ ان دو عالمی طاقتوں میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس اہم خطۂ زمین پر ان میں سے کسی ایک کا تسلّط ہو۔ اگر روس اپنے اڈے جما لیتا ہے تو امریکہ کے وقار اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس کے دائرۂ اثر کو سخت زک پہنچتی ہے...

"جب تک بھارت اور روس کا دفاعی معاہدہ نہیں تھا تو امریکہ کی خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان خود مختار ہو کر امریکہ کی جھولی میں گرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امریکہ نے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں خفیہ تحریک بھی چلائی اور الیکشن میں شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت بھی کی اور بھارت کو اپنا ہمنوا بھی بنا لیا لیکن روس بھارت معاہدے کے بعد اُسے شدت سے یہ احساس ہُوا کہ روس نواز بھارت کا مشرقی پاکستان پر تسلط حقیقتاً روس کا تسلّط ہو گا۔ اس احساس کے ساتھ

اس کی سوچ میں انقلابی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنے کے لیے مجبور ہو گیا....

"اس کے علاوہ ایسا معلوم ہونے لگا کہ امریکہ اور رُوس کے مابین پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی میں کچھ رخنہ پڑ چکا ہے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکی مداخلت کی وجہ سے امریکہ کی مالی حالت پر بہت بُرا اثر پڑا۔ جو مالی ذرائع اُسے انوکھے آلاتِ جنگ کی ریسرچ میں خرچ کرنے چاہئیں تھے وہ ویت نام کی جنگ کی نذر ہو گئے۔ امریکہ کی اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر روس میزائل بنانے کی دوڑ میں بہت آگے بڑھ گیا جس کا اعتراف امریکی وزیرِ دفاع نے بھی کیا۔ امریکہ کے لیے اب روس کا خطرہ چین کے خطرے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ امریکہ دیدہ و دانستہ روسی فوجی قوت یا اس کے حلقۂ اثر کی توسیع میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ امریکہ اب روایتی چین دشمنی کی پالیسی پر بھی نظرثانی کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس امر میں پاکستان کی وساطت اسے حاصل ہو گئی تھی۔ حقیقتاً تو پاکستان کا یہ رویّہ ہی روس بھارت دفاعی معاہدے کا موجب بنا۔ امریکہ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ خلیج بنگال اور مشرقی پاکستان میں بھارت اور روس کا تسلط جہاں چین کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے وہاں مشرقِ بعید میں امریکی وقار کا جنازہ بھی نکل سکتا تھا اور اس کی لہریں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا تک محسوس کی جا سکتی تھیں مگر المیّہ تو یہ ہے کہ جب امریکہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے حالات کا رُخ بدلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو وقت کا دھارا بھارت روس کی متحدہ طاقتوں کے حق میں فیصلہ کن نتائج پیدا کر چکا تھا۔"

"ایک تو اپنی سیاسی نااہلی اور بددیانتی تھی" — ہم نے کہا — "آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ بڑی طاقتوں کے مفادات بھی وابستہ تھے؟"

"بالکل وابستہ تھے" — جنرل صاحب نے جواب دیا — "جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے، سقوطِ مشرقی پاکستان کے نتیجے کے طور پر عالمی طاقتوں کی رسّہ کشی دو صورتوں میں نمودار ہو سکتی تھی۔ پاکستان کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر روس اپنے پرانے "ایشیائی تحفظ" کے پلان کو دہرائے گا اور پاکستان کو ہندوستان سے کنفیڈریشن بنانے پر مجبور کرے گا جس کا مقصد روس نواز اور چین دشمن اثر کی بنیاد قائم کرنا ہو گا۔ یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کو ملا کر ایک سٹیٹ بنائی جائے گی اور کنفیڈریشن کا ڈھانچہ بنگال، بھارت، مغربی پاکستان اور افغانستان پر مشتمل ہو گا۔ مشرقی پاکستان کے فوجی انقلاب (فوج کے ہاتھوں شیخ مجیب کے قتل) کے بعد مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کی کنفیڈریشن یا نہیں ایک سٹیٹ بنانے کے امکانات ختم ہو گئے....

"دوسری صورت یہ نظر آ رہی تھی کہ امریکہ ایک ایسی کنفیڈریشن کھڑی کرنے کی کوشش کرے گا جو امریکہ نواز ہو اور سینٹو کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اس میں ایران، مغربی پاکستان اور افغانستان کو شامل کرنے کے امکانات تھے۔ امریکہ اس بات کو نظرانداز نہیں کر سکتا کہ روس نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے عرب ساتھیوں کی شکست کی خفت کو مشرقی پاکستان میں بھارتی جارحیت کی عملی حمایت کر کے دھو ڈالا ہے۔ اگر امریکہ اسے اس سازش کے نتائج ہضم کرنے دیتا ہے تو اسے مشرقِ وسطیٰ میں بھی اپنے اقتدار کا بستر لپیٹنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔

"بہرصورت کنفیڈریشن کا مسئلہ تو پاکستان کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہی حل ہو سکتا تھا۔ نہ تو امریکہ کی فوجی قوت اس پر حاوی ہو سکتی ہے اور نہ ہی روس کی۔ عوام کی خواہشات کے منافی فوجی قوت خواہ وہ عالمی قوت ہی کیوں نہ ہو، کوئی سیاسی حل پیش نہیں کر سکتی۔ پاکستان کے عوام کسی قسم کی کنفیڈریشن کے پرچار پر کان دھرنے کو تیار نہیں، سوائے اس کنفیڈریشن کے جو مشرقی پاکستان کو پھر سے مغربی پاکستان کے ساتھ متحد کر دے۔ عالمی طاقتوں کی رسّہ کشی کا مقصد یہی ہے کہ پاکستان کسی صورت میں بھی غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے یہ پالیسی اختیار کرنی چاہیئے، لیکن ہمیں عالمی طاقتوں کی صف آرائیوں سے صرف اتنی سی دلچسپی ہے کہ پاکستان کے تحفظ کی ضمانت ہمیں کس طرح مل سکتی ہے۔ روس تو ویسے ہی ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے اور بھارت اور رُوس کے اتحاد کی کڑی کو توڑا نہیں جا سکتا۔ اگر چین اور امریکہ

کے رجحانات پاکستان کے حق میں ہیں تو دونوں کے ساتھ ہمارے تعلقات زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے چاہئیں۔ چین کے ساتھ دفاعی معاہدہ اب ناگزیر ہو چکا ہے۔ یہ فرض کر لیا جائے کہ چین دفاعی معاہدے پر رضامند نہ ہو تو پھر یہ سوچنا ہو گا کہ ہمیں امریکہ کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری رکھنے سے کیا فائدہ ہے۔

"فیلڈ مارشل ایوب خان نے یحییٰ خان کو عنانِ حکومت سونپنے سے چند دن پہلے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ اس کے خیال میں ایک عرصے تک پاکستان کو فوجی حکومت کی شدید ضرورت ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہی پاکستان کی تخریب کاری کا باعث بنا۔ یہ وہ وقت تھا جب آر۔ ٹی۔ سی کی سرگرمیاں بام عروج پر تھیں اور سیاسی لیڈر یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ اب اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل ہونے کو ہے۔ اِدھر خفیہ طور پر جنرل یحییٰ خان کے بنگلے پر مارشل لاء لگانے کی تدابیر مکمل کی جا رہی تھیں۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ میں ایوب خان کو حقیقی محبِ وطن سمجھتا تھا لیکن میں اسے فوجی نظام کی بقا کی سنگین غلطی کا مرتکب بھی ضرور گردانتا ہوں۔ جب پاکستان میں پہلا مارشل لاء لگا تو جنرل یحییٰ خان ہی اس کا حقیقی معمار تھا۔ پھر جب ملک کے سیاسی حالات دگرگوں ہونے شروع ہوئے اور ایوب خان دوسرے مارشل لاء کی ضرورت محسوس کرنے لگا تو اُس کی نظرِ انتخاب یحییٰ خان پر ہی پڑی کیونکہ اس مسئلے میں دونوں کی پولیٹیکل فلاسفی منطبق تھی کہ پاکستان کو طویل عرصے تک فوجی حکومت کی ضرورت ہے۔ اس کا خفیہ مقصد یہ تھا کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر دوسرے فوجی ڈکٹیٹر کو اقتدار منتقل کرتا چلا جائے اور دوسرا پہلے کے تحفظ کی ضمانت دیتا چلا جائے....

"اس سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فوج کو دفاعی قوت سے منتقل کر کے حصولِ اقتدار کا آلۂ کار بنا دیا گیا۔ فوج میں ترقی کا معیار فنی قابلیت کی بجائے اندھی غلامی قرار پایا جس کی وجہ سے بے شمار اعلیٰ فوجی افسروں اور جرنیلوں کو جنہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور بھارتی افواج پر اپنی برتری کا سکہ بٹھایا تھا، فوج سے ریٹائر کر دیا گیا۔ یحییٰ خان

نے کرسیٔ صدارت پر متمکن ہوتے ہی اپنے چہیتے افسروں پر ترقی کے تمام ناجائز دروازے کھول دیئے اور محبِ وطن افسروں کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے ہوئے باہر نکال دیا۔ پاکستانی فوج میں فنی زوال کا یہی پیش خیمہ تھا جس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء میں نمودار ہوا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس سلسلے کا حتمی انجام کیا ہو گا....

"یحییٰ خان کے ذہن میں سیاسی مقاصد کا جو ڈھانچہ تھا اس کا بنیادی تصور ایک تو یہ تھا کہ امورِ حکومت میں فوج کی برتری کو قائم رکھا جائے۔ دوسرا یہ کہ سیاسی معاملات میں فوجی مداخلت کے حتمی حق کو تسلیم کیا جائے اور تیسرا یہ کہ یحییٰ خان کی کرسیٔ صدارت کو کسی صورت میں بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ وہ انہی مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی شطرنج کے بورڈ پر مختلف چالیں چلتا رہا۔ اُس نے مختلف سیاسی پارٹیوں کو آپس میں متصادم رکھا۔ جھوٹ بولے، دھوکے دیئے، اقتصادی نظام کی دھجیاں بکھیریں حتیٰ کہ وہ نہ صرف خود اپنے دامِ فریب کا اسیر ہو گیا بلکہ اس جواری نے ملک کے تحفظ اور سالمیت کو بھی داؤ پر لگا دیا اور بازی ہار دی۔"

"کیا یحییٰ خان کے سامنے کوئی سیاسی مقصد تھا؟"

"یحییٰ خان کے سامنے کوئی واضح سیاسی مقصد نہیں تھا"———— جنرل سرفراز خان نے کہا۔ "وہ اپنے گرد خفیہ سازشوں کے جال بُنتا رہا، جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غیر ملکی طاقتوں نے خود اس کے درباریوں کے ذہنوں میں پاکستان کی جغرافیائی معقولیت کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے اور اپنی سازشوں کو فروغ دینے کے لیے فضا سازگار بنا لی۔ ایران کے ساتھ کنفیڈریشن بنانے کے متعلق شوشے چھوڑے گئے۔ چونکہ مشرقی پاکستان اس منصوبے میں نہیں سما سکتا تھا اس لیے ان خیالات کا اظہار کیا گیا کہ مشرقی پاکستان جاتا ہے تو جانے دو۔ یحییٰ خان خود ایرانی نژاد تھا۔ اس کے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی اور وہ ایرانی تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا۔ اس بنا پر مشرقی پاکستان کی نسبت ایران کے ساتھ اس کی مناسبت زیادہ یقینی اور فطری تھی۔ اگر اس جنگ میں مشرقی پاکستان کے تحفظ میں بے اعتنائی یا تساہل کے

آثار ملتے ہیں تو پھر اس قسم کی سازش کے وجود سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

"مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سیاسی شطرنج کے بورڈ پر کس مہرے نے کیا کردار ادا کیا، یہ ابھی تک صیغۂ راز میں ہے اور جب تک اس سے پردہ نہیں ہٹتا اس عظیم المیہ میں یحییٰ خان کے تمام تر اور خفیہ شریک کاروں کا تعین نہیں ہو سکتا۔ ملک کے استحکام کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ان مجرموں کا کھوج لگانا آج بھی اشد ضروری ہے۔ بہر حال فوجی نقطہ نظر سے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افواجِ پاکستان ایک ٹھوس منظم اور مستحکم سیاسی نظام کی پشت پناہی سے محروم تھیں۔ یحییٰ خان کے دور کی اخلاقی پستی کا پس منظر بتانے کی ضرورت نہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کے دور کی رنگینیاں یحییٰ خان کے دور کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں ....

"پاکستان کے دونوں بازوؤں کا جغرافیائی محلِ وقوع ملٹری سٹریٹیجی کے نقطۂ نظر سے واقعی قابلِ تشویش تھا۔ پاکستان کے دونوں بازو ایک دوسرے سے بارہ سو میل کے طویل فاصلے پر واقع تھے۔ ان کے خاطر خواہ دفاع کا انحصار تین نکات پر تھا :

۱۔ مضبوط اور طاقتور بحری بیڑہ جو سمندری راستوں کے تحفظ کا ضامن ہوتا۔
۲۔ طاقتور فضائیہ جو ہوائی راستوں کو مسدود نہ ہونے دے اور فوج کو جنگی کارروائیوں میں خاطر خواہ سپورٹ دے سکے۔
۳۔ ملک کی فوجی قوت اور ذرائع اس قدر وسیع ہوتے کہ جنگ کی صورت میں ایک بازو کو دوسرے کی اعانت کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر ضرورت محسوس ہوتی تو اس کا مؤثر انتظام کیا جا سکتا ....

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جنگ میں ان تین شرائط میں سے ہمیں کوئی بھی میسر نہ تھی اور اس بنیادی کمزوری نے دونوں بازوؤں کے یکساں تحفظ کو غیر متوازن بنا دیا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ کسی عالمی طاقت کے ساتھ دفاعی معاہدہ ہوتا جو اولاً جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے سے پہلے امتناعی حیثیت رکھتا۔ پھر اگر جنگ ناگزیر ہوتی تو مؤثر

اور یقینی مدد کی ضمانت دیتا ....

"ہم کیوں کسی عالمی طاقت کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے میں ناکام رہے؟ یہ ایک معمّہ ہے جو وزارتِ خارجہ کی فرض ناشناسی پر دلالت کرتا ہے یا سخت نااہلی اور کوتاہی پر۔ بھارت اور روس کے درمیان جب دفاعی معاہدہ ہو گیا تھا تو اس کے بعد چین کے ساتھ معاہدہ کرنے میں ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگا دینا چاہیئے تھا۔ حکومت نے اس کے متعلق کیا اقدام کیے؟ ہم نہیں جانتے۔ البتہ وزارتِ خارجہ کے نمائندے نے بس اتنا کہا کہ چین اور پاکستان کے دوستانہ تعلقات اتنے مستحکم ہیں کہ کسی رسمی معاہدے کی ضرورت نہیں۔ اس رویّے کے خلاف میں نے خود پُر زور احتجاج کیا تھا لیکن یا تو چین اس اَڑے وقت میں ہماری سُن نہیں رہا تھا یا ہماری حکومت اس آزاد رویّے کی احمقانہ پالیسی پر ڈٹی ہوئی تھی ....

"امریکہ کے ساتھ ہمارے جو دفاعی معاہدے موجود تھے انہیں غیر مؤثر بنانے کے لیے ہم نے ہر ممکن کوشش کی اور خارجہ پالیسی کے اس زرّیں اصول کو نظر انداز کر دیا کہ خارجہ پالیسی کا محوری نقطہ ملک کے اپنے مفاد پر مرکوز ہوتا ہے لیکن ہم نے تمام عالمِ اسلام کے تحفظ کی اجارہ داری اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھی تھی۔ آج میں پوچھتا ہوں کہ عالمِ اسلام میں کتنے ممالک ہماری مؤثر اعانت کے لیے آگے بڑھے؟ ....

"بھارت نے اپنی جارحیت کا آغاز مشرقی پاکستان سے کیا جو فوجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے متوقع اقدام تھا۔ مشرقی پاکستان فوجی قوت کے لحاظ سے نسبتاً کمزور تھا اور سیاسی نقطۂ نظر سے اندرونی خلفشار میں مبتلا تھا۔ دنیا کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لیے موزوں سٹریٹیجی یہی تھی کہ وہ دونوں بازوؤں کے درمیان مواصلات کا سلسلہ منقطع کر دے اور پھر DEFEAT IN DETAIL یعنی پہلے ایک اور پھر دوسرے کو باری باری شکست دینے کے اصول پر عمل پیرا ہو اور اس سٹریٹیجی کو اپنانے کے لیے بھارت کا پلان یہ تھا کہ پہلے مشرقی پاکستان یعنی پاکستان کے کمزور بازو کے خلاف فوجوں

کا زیادہ سے زیادہ اجتماع کرے۔ اس پر بھرپور حملہ کرے اور اسے فیصلہ کن شکست دے۔ اس اثنا میں دفاعی POSTURE اختیار کرے اور مشرقی پاکستان سے نمٹنے کے بعد اپنی تمام تر فوجی قوت کو مغربی پاکستان کے خلاف جھونک دے....

"بھارت کے لیے ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر کمک اور وسائل منتقل کرنے کے لیے زمینی، سمندری اور فضائی راستے میسّر تھے۔ اس کے برعکس پاکستان کے یہ سب راستے مسدود کیے جا سکتے تھے جو حقیقتاً کر دیے گئے۔ چونکہ پاکستان کی فوجی طاقت اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ دونوں بازوؤں کا یکساں دفاع کر سکتی اس لیے پاکستان کے لیے مناسب سٹریٹیجی یہی تھی کہ وہ اپنی افواج کو دونوں بازوؤں میں برابر تقسیم کرنے سے گریز کرے، ورنہ وہ دونوں حصوں میں کمزور رہتا اور دونوں محاذوں پر اس کی شکست کے امکانات پیدا ہو جاتے۔ چونکہ مغربی پاکستان زمینی، فضائی اور کسی حد تک بحری راستوں سے مشرقِ وسطیٰ اور یورپ سے منسلک تھا اس لیے موزوں سٹریٹیجی کا تقاضا یہی تھا کہ پاکستان مغربی پاکستان کو اپنا مین بیس MAIN BASE بنائے۔ حقیقتاً پاکستان نے اس سٹریٹیجی پر عمل درآمد کیا....

"یہاں تک تو سب معاملہ درست تھا۔ مشرقی پاکستان کو کسی حد تک کمزور رکھا جا سکتا تھا لیکن ہمارے منصوبہ بندی کے ماہر اس کا صحیح توازن قائم کرنے سے قاصر رہے یا اسے عمداً نظر انداز کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں اندرونی مواصلات کو ترقی دینے میں ناقابلِ معافی غفلت برتی گئی اور دریائی مواصلات کو کافی سمجھا گیا۔ حالانکہ اندرونی خلفشار کے ہوتے ہوئے دریائی راستوں کا منقطع ہونا یقینی تھا۔ اگر ہم مشرقی پاکستان کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ریل اور سڑک کے بیشتر راستے سرحدوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں جو نہایت آسانی سے کاٹے جا سکتے ہیں۔ جنگ میں حقیقتاً ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ جب ڈھاکہ کے دفاع کے لیے سرحدوں سے ہٹ کر فوج کے اجتماع کی ضرورت پیش آئی تو آمدورفت کے ذرائع اس [illegible] کے متحمل نہ ہو سکے اور کمانڈر اس نازک موڑ پر

مؤثر کنٹرول کرنے سے قاصر رہا....

"اس کے علاوہ سپورٹنگ آرمز، توپ خانہ، ٹینک اور فضائیہ کا تناسب مضحکہ خیز حد تک ناکافی تھا۔ یہاں تک کہ انہی امور کی نامعقولیت کو دیکھتے ہوئے بار بار یہ گمان ہوتا ہے کہ ہماری بری اور بہادر افواج ایک منظم سازش کا شکار ہوئی ہیں۔ فیلڈ آرٹلری کی صرف تین رجمنٹیں تھیں جن کی تعداد بارہ ہونی چاہیے تھی۔ میڈیم اور ہیوی آرٹلری سرے سے مفقود تھی۔ ٹینک رجمنٹ صرف ایک تھی جس کے پاس بہت ہلکی قسم کے بوسیدہ ٹینک تھے۔ فضائیہ کا صرف ایک سکواڈرن تھا جس کے مقابلے میں بارہ بھارتی سکواڈرن تھے۔ جیٹ طیاروں کی پرواز کے لیے ڈھاکہ کا صرف ایک ہوائی اڈہ تھا جسے بھارت کی بمباری نے بہت جلد ناکارہ بنا دیا تھا۔ طیارہ شکن توپوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے نازک مرحلے پر بھارت نے چھاتہ بردار اور ہیلی کاپٹر بردار فوج اتار کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تو اس کے ردِعمل کے طور پر اپنی بچی کھچی فضائیہ بھی استعمال نہ ہو سکی۔ ان تین خامیوں کا جو حقیقتاً ہماری شکست کا باعث بنیں کیوں نہ بروقت تدارک کیا گیا؟ خدا ہی جانتا ہے!....

"ہماری جنگی تربیت میں دو ایسے فلسفوں نے جنم لیا جس نے ہمیں بہت زک پہنچائی ہے۔ اولاً ہم نے جارحیت DEFENCE کی نسبت دفاع کو غیر ضروری اہمیت دی ہے۔ آج تک کسی قوم یا فوج نے محض دفاعی اقدام پر عمل کرتے ہوئے کبھی کوئی جنگ نہیں جیتی۔ بے شک ایسی طاقت کو جو فوجی نقطۂ نظر سے نسبتاً کمزور ہو، کچھ وقت کے لیے دفاعی پوزیشن اختیار کرنی پڑتی ہے، لیکن اس حالت میں بھی اسے جوابی حملے کے مواقع تلاش کرنے چاہئیں۔ سٹریٹیجیکل پلان میں تو پیش قدمی کے لیے مستقل اور اٹل تدابیر تیار رہنی چاہئیں۔ اس جنگ میں مغربی محاذ پر بھرپور حملے کے مواقع موجود تھے (جن پر آگے چل کر مفصل بحث کروں گا) لیکن ہم نے ان سے کچھ استفادہ نہیں کیا۔ ثانیاً ہم نے علاقائی فتوحات کو زیادہ اہمیت دی ___ کون کتنے میل ایک دوسرے

کی سرحدوں کے اندر گھس گیا، بس یہی ہماری فوجی کارروائی کا نصب العین بن گیا، حالانکہ فوجی کمانڈر کا نصب العین دشمن کی افواج کو نیست و نابود کرنا ہونا چاہیئے۔ ایک کمانڈر کے لیے اپنے وطنِ عزیز کا ایک انچ بھی دشمن کے حوالے کرنا سخت اذیت کا موجب بنتا ہے لیکن اس میں اتنی اخلاقی قوت اور کردار کی پختگی ہونی چاہیئے کہ وہ بڑے نصب العین کی خاطر چھوٹی چھوٹی قربانیاں دے سکے، خواہ اسے وقتی طور پر نادانستہ نکتہ چینی کا شکار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔"

"جنرل صاحب!" — ہم نے پوچھا — "کیا جنرل نیازی کسی طریقے سے شکست سے بچ سکتے تھے؟"

"میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی جنگ میں ایک مقام ایسا آگیا تھا جب جنرل نیازی سرحدوں سے اپنی افواج ہٹا کر ڈھاکہ کو کور COVER کرتے ہوئے کلوز ڈیفنس اختیار کرتے" — جنرل صاحب نے کہا — "اس طریقے سے وہ بہت مدت تک ڈھاکہ کا دفاع کر سکتے تھے اور ڈھاکہ پر قبضہ کرنے کے لیے بھارت کو ناقابلِ برداشت قیمت ادا کرنی پڑتی....

"مشرقی پاکستان بڑے سے بڑے دریاؤں اور ندی نالوں کا علاقہ ہے۔ یہ دریا اور ندی نالے دفاعی اعتبار سے بہت مفید ثابت ہو سکتے تھے، لیکن دشمن کے پاس چھاتہ بردار اور ہیلی کاپٹر بردار فوج ہونا بہت بڑا خطرہ تھا جو دریاؤں اور ندی نالوں کی دفاعی اہمیت کو بیکار بنا دیتا تھا اور جس کا مؤثر سدِباب ہمارے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ اس خطرے کا مؤثر سدِباب دو طریقوں سے ہو سکتا تھا۔ ایک مؤثر فضائی طاقت کا موجود ہونا اور دوسرے متحرک محفوظ MOBILE RESERVE جس میں ایک ٹینک رجمنٹ شامل ہوتی جو اسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کمانڈر کے اپنے ہاتھ میں ہوتی لیکن اس انوکھے اور غالباً غیر متوقع خطرے سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مؤثر انتظام موجود نہ تھا۔ ہو سکتا ہے ہماری سراغرساں ایجنسیوں کو اس خطرے کی سنگینی کا علم ہی نہ تھا....

"اپریل ۱۹۷۱ سے نومبر کے وسط تک مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر بھارتی فوج مکتی باہنی کا رُوپ دھار کر بٹالین اور کہیں بریگیڈ کی تعداد میں حملہ آور ہوتی رہی جنہیں توپ خانے، ٹینکوں اور فضائیہ کی سپورٹ حاصل تھی۔ ہماری جری بہادر اور جانباز فوج نے نہایت جرأت اور استقامت کے ساتھ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دشمن کو ہر جگہ بھاری جانی نقصان کے ساتھ ناکامی ہوئی....

"مشرقی پاکستان خشکی پر تین اطراف سے دشمن میں گھرا ہوا ہے اور چوتھی سمت پر سمندر ہے جسے دشمن کی بحریہ نے منقطع کر دیا تھا۔ سرحدی علاقہ اڑھائی ہزار میل لمبا ہے۔ پاکستانی افواج چار ڈویژن پر جن میں ایک ڈویژن نامکمل تھا، مشتمل تھیں۔ بھارتی ایسٹرن کمانڈ بارہ ڈویژن پر مشتمل تھی جس میں چار یا پانچ ڈویژن اس فوج کا حصہ تھا جو نیفا میں چین کے خلاف صف آرا تھیں۔ اگر چین کی طرف سے اتنا دباؤ رہتا کہ بھارت یہ ڈویژن نیفا کی سرحد سے نہ ہٹا سکتا تو جنگ کا نقشہ اور اس کے نتائج کچھ اور ہوتے....

"ان نامساعد حالات کے اندر پاکستانی افواج اڑھائی ہزار میل لمبی سرحد پر تمام بڑے بڑے راستوں پر ڈیفنس جمائے ہوئے تھیں اور ہر مقام پر اپنے سے کئی گنا دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھیں۔ یہ صورتِ حال آٹھ ماہ تک جاری رہی۔ المیہ تو یہ ہے کہ دنیا اور تاریخ سقوطِ ڈھاکہ کو تو یاد رکھے گی لیکن پاکستانی افواج کی قلیل تعداد اور اُن نامساعد حالات کو جن کے اندر انہوں نے طویل عرصے تک فقید المثال شجاعت سے مقابلہ کیا، بھول جائے گی....

"فوج کی دلیری اور استقامت ایک طرف، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر دشمن کو نفری، وسائل اور اسلحہ میں نمایاں برتری حاصل ہو تو وہ وقت آ جاتا ہے جب کمزور فوج اپنی شجاعانہ روایات کے باوجود پاؤں نہیں جما سکتی۔ ہر کمانڈر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ ایسے ناسازگار حالات سے نمٹنے کیلئے اپنی تدابیر تیار رکھے اور ان تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری وسائل مہیا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ میرے خیال میں ۳ سے ۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے درمیان وہ وقت آ گیا تھا جب کمانڈر سرحدوں سے افواج ہٹا کر ان کی منتشر قوت کو مجتمع کر کے لڑاتا۔ اس کا عملی طریقہ یہ تھا کہ ڈھاکہ کو کور کرتے ہوئے دریائے

بدھا ماور میگھنا کے درمیانی علاقے میں نیا ڈیفنس جماتا اور یہاں پر آخری جوان اور
آخری گولی تک لڑتا، اور اگر ایسا ممکن ہو سکتا تو پھر دشمن کے نو ڈویژنوں کا بھی
صفایا ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ احتیاط کے طور پر برما کو جانے والے راستے
بھی اپنے لیے محفوظ کر لیے جاتے ....

" ہمارے کمانڈر ایسٹرن کمانڈ کے پاس اس قسم کا منصوبہ تھا یا نہیں،
اس کے متعلق ہمیں ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ ہمیں اس کا بھی علم نہیں کہ
ان کے راستے میں کس قسم کی مشکلات حائل تھیں اور فضائی قوت ختم ہونے
پر نقل و حرکت کہاں تک ممکن تھی، اس لیے ہم کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے۔
بہر حال جنگی تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ ایک نہایت اہم باب ہے جس کی
کبھی نہ کبھی پردہ کشائی ہونی چاہیئے اور ہو کے رہے گی۔ برطانیہ کے سابق اور
آنجہانی وزیرِ اعظم چرچل نے جنگی منصوبہ بندی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا ——
"جنگ کی بنی ہوئی تدابیر اُس وقت تک کام دیتی ہیں جب تک کہ دشمن کے
ساتھ تصادم نہیں ہوتا۔ جب متحارب فوجیں ایک دوسری سے ٹکراتی ہیں تو
جنگی منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد کمانڈر یا تو دشمن کے
رحم و کرم پر رہ جاتا ہے یا اپنی صلاحیتوں اور فنی مہارت کے سہارے پر زندہ
رہتا ہے۔ وہ جنگ کی دُھندلی تصویر کو کیسے دیکھتا ہے، اور اس سے کیا
نتائج اخذ کرتا ہے؟ یہی اس کی فتح یا شکست کا باعث بنتا ہے"....

" جنرل نیازی نے جنگ کی دُھندلی اور سُرعت کے ساتھ ابتر ہوتی ہوئی
تصویر کو کیسے دیکھا اور اس سے کیا نتائج اخذ کیے، اس کا ہمیں کچھ علم نہیں،
لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کے ذرائع مضحکہ خیز حد تک
محدود تھے اور ہائی کمانڈ کی طرف سے ہتھیار ڈالنے کے لیے دباؤ پڑ رہا تھا۔
بی بی سی کا یہ بیان کہ ہتھیار ڈالنے کی تقریب کے بعد جنرل نیازی نے کہا تھا کہ
مجھے دھوکہ دیا گیا ہے، تعجب خیز ہے کہ وہ کس دھوکے کی طرف اشارہ کر رہے
تھے —— ظاہر ہے یہ دھوکہ اُس سازش کی کڑی ہے جو اسلام آباد کی
ہائی کمانڈ اپنی سازش کو چھپانے کے لیے فوجی شکست کے رنگ میں پیش
کرنا چاہتی تھی لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جنرل نیازی جو ۱۴ اور ۱۵ دسمبر
تک ہتھیار ڈالنے کے خیال کو قابلِ توجہ ہی نہیں سمجھتے تھے اور آخری جوان اور
آخری گولی تک لڑنے کے عزم پر سختی سے کاربند تھے، کیسے ایک دم ۱۶ دسمبر
کو ہتھیار ڈالنے کی تجویز کو قبول کرنے پر رضامند ہو گئے؟ ....

" ہو سکتا ہے کمانڈ اور کنٹرول کا نظام ۱۵/۱۶ دسمبر کی رات تک
اس قدر درہم برہم ہو گیا ہو کہ انہیں صحیح فوجی صورتِ حال پر عبور نہ رہا ہو
اور اُن کے عزم میں تزلزل پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن دفعتاً فوجی نظام کا دگرگوں
ہونا بعید از قیاس ہے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہونے کے امکانات ہوتے
تو اس کا اندازہ انہیں دو تین دن پہلے لگا لینا چاہیئے تھا۔ ان حالات کو مدِ نظر
رکھتے ہوئے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جنرل نیازی کا اس دھوکے
میں پھنسنا اندرونی اور بیرونی سازش کی عیّارانہ چالوں کا نتیجہ تھا....

" یحییٰ خان نے جہاں اور سینکڑوں ہتھکنڈے کھیلے وہاں وہ ہتھیار
ڈالنے کی لعنت اور فوجی شکست کا طوق بھی ڈاکٹر مالک گورنر مشرقی پاکستان کے
گلے میں ڈالنا چاہتے تھے۔ گورنر کے فوجی مشیر، میجر جنرل راؤ فرمان علی کو ہدایت
دی گئی کہ وہ گورنر کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کے متعلق اقوامِ متحدہ کے
سکریٹری جنرل سے سلسلہ جُنبانی کرے۔ اس کے بعد دوسرا سگنل موصول
ہُوا —— "انتظار کرو، دوست آ رہے ہیں" —— اس کے بعد واشنگٹن
سے خبر موصول ہُوئی کہ صدر نکسن نے بھارت کو متنبہ کیا ہے کہ اگر اُس نے
جنگ بند نہ کی تو امریکہ براہِ راست مداخلت کرے گا اور اس بات کا حوالہ
بھی دیا کہ امریکہ معاہدوں کی رُو سے پاکستان کی مدد کرنے کا پابند ہے۔ اس
وارننگ کے ساتھ یہ خبر موصول ہُوئی کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ خلیج بنگال
کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ اِدھر صدرِ مملکت یحییٰ خان نے بھی معتبر سیاسی
حلقوں کو مژدہ سنایا کہ امریکی بحری بیڑہ پاکستان کی مدد کے لیے بڑھ رہا
ہے اور چینی افواج بھی نیفا کے شمال میں نقل و حرکت کر رہی ہیں۔ امریکی
ساتواں بحری بیڑہ انٹرپرائز واقعی خلیج بنگال میں نمودار ہُوا، مگر اس کی آمد

سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں وہ دھری کی دھری رہ گئیں اور یہ راز ابھی تک سربستہ ہے کہ ساتویں بیڑے کے آخر عزائم کیا تھے؟ اس کے متعلق اب تک جو قیاس آرائیاں ہُوئی ہیں وہ یہ ہیں :

۱ : بھارت کو جنگ بند کرنے پر مجبور کیا جائے اور ڈھاکہ پر بھارتی قبضے کو روکا جائے۔

۲ : پاکستانی افواج کو مشرقی پاکستان سے نکالا جائے۔

۳ : امریکی باشندے جو مشرقی پاکستان میں موجود ہیں ان کو نکالا جائے۔

۴ : ساتویں بیڑے کی نقل و حرکت کا مقصد پاکستان کے عوام اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تھا اور حقیقتاً یہ بھی سازش کی ایک کڑی تھی۔۔۔

"ان میں سے چوتھی تھیوری کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیک اینڈرسن نے ہنری کسنجر کی جس خفیہ کانفرنس کا انکشاف کیا ہے اس سے بیڑے کا سازش میں شامل ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس سے پیشتر مَیں اس مسئلے پر بحث کر چکا ہُوں کہ اوائل میں امریکہ بنگلہ دیش کی خود مختاری کا تو یہاں تک حامی تھا کہ وہ امریکہ کے دائرۂ اثر میں جائے لیکن روس بھارت دفاعی معاہدے کے بعد جب روسی اثر کے نفاذ کے امکانات روشن ہو گئے تو امریکہ نے اپنی پالیسی بدل لی۔ پہلی تین صورتوں میں سے ایک بھی عمل میں نہیں لائی گئی۔ اگر ساتویں بیڑے کی نقل و حرکت کا مقصد امریکی باشندوں کو نکالنا تھا تو پورے کے پورے بیڑے 'انٹرپرائز' سمیت آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے ایک یا دو کروزر کافی تھے۔ پاکستانی قیدیوں کو نکالنے کا انحصار بھارت کے رویے اور رضامندی پر تھا، لیکن بھارت نے تو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ پاکستانی افواج کو نکالنے کی کوشش کو بھارت ایک غیر دوستانہ اور جارحانہ عمل سمجھے گا جس کی ذمہ داری امریکہ پر ہو گی۔۔۔۔

"اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب ساتواں بیڑہ روانہ ہُوا تو اس کا مقصد بھارتی افواج کی بڑھتی ہُوئی پیش قدمی کو روکنا اور جنگ بندی کرانا تھا لیکن اس کی تکمیل کے لیے امریکہ کوئی عملی کارروائی کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور

چاہتا تھا کہ محض دھمکی دے کر اپنا مقصد حاصل کرے، لیکن اُس وقت بھارتی افواج ڈھاکہ کے بہت قریب پہنچ چکی تھیں اور آخری وار کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ اس میں بھارت کو روس کی طرف سے مکمل حمایت اور یقین دہانی حاصل تھی۔ بھارت نے یہ بھانپ لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو امریکہ عالمی جنگ کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں اور ساتویں بیڑے کی نقل و حرکت محض ایک دھونس ہے۔

ساتواں بیڑہ جب جنگ بند کرانے میں ناکام رہا تو اسے رسوائی سے بچانے کے لیے اس قسم کی خبریں نشر کی گئیں کہ اس کا اصل مقصد امریکی باشندوں کو نکالنا تھا۔

"جیک اینڈرسن نے ساتویں بیڑے کے متعلق جو مؤقف پیش کیا تھا اس سے مَیں صرف اس حد تک اتفاق کرتا ہوں کہ اس کا اصل مقصد امریکی باشندوں کو نکالنا نہیں تھا، لیکن اینڈرسن نے تین فوجی نوعیت کے مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ (۱) بھارتی طیارہ بردار بحری جہاز 'وکرانت' کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے اور بھارتی ناکہ بندی کو کمزور کرے۔ (۲) بھارت اپنے بحری جہاز اور طیارے ساتویں بیڑے کی نقل و حرکت پر لگا دے۔ (۳) بھارت مجبور ہو جائے کہ وہ اپنے طیاروں کو دفاعی تیاری DEFENCE ALERT پر لگا دے جس سے اُس کی برّی فوج کی فضائی سپورٹ کمزور ہو جائے۔۔۔۔

"اس مشن کی صداقت پر تو تب ہی یقین کیا جا سکتا ہے کہ بھارت کے لیے ساتویں بیڑے کا مقابلہ کرنے کی ذرا سی بھی سکت ہوتی۔ دوسرے جس مشن کا اینڈرسن نے ذکر کیا ہے اس کا مشرقی پاکستان کی جنگ پر کوئی معتدبہ اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور اس مشن کی تکمیل میں ساتویں بیڑے کا نکلنا ہوا میں گھونسہ مارنے کے مترادف تھا۔ ساتویں بیڑے کا اوّلین مقصد جنگ بند کرانا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل میں وہ کہاں تک عملاً کارروائی کرنے کے لیے تیار تھا اس پر ایک ہی چیز اثر انداز ہو سکتی تھی کہ روس کا رویّہ کیا تھا اور اس کی روشنی میں عالمی جنگ کے امکانات کیا تھے۔ بھارت نے امریکہ کی اس تذبذب آفریں کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جوا کھیلا جو کامیاب رہا۔۔۔۔

"ادھر مغربی پاکستان کی سرحدوں پر جو ڈرامہ کھیلا گیا وہ فوجی مبصروں کے

لیے معمّہ بنا ہُوا ہے۔ مغربی محاذ پر بھارتی اور پاکستانی برّی افواج کی قوّت تقریباً برابر تھی، بلکہ ٹینکوں اور فضائی قوّت میں ہمیں کسی قدر برتری حاصل تھی۔ اگر مغربی پاکستان کے محاذ پر ہمارے جوابی حملے کا مقصد یہی تھا جو ہم نے حاصل کیا تو جنگوں کی تاریخ میں اس سے بڑی حماقت کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ مغربی پاکستان کے جوابی حملے کا ایک اور صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ اس محاذ پر پوری قوّت سے بھرپُور حملہ کیا جائے اور دشمن کی فوجی قوّت اور جغرافیائی سرحدوں کو اس قدر زک پہنچائی جائے کہ بھارت اپنی مشرقی فتوحات سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا تو پھر مشرقی پاکستان میں سیاسی تصفیے کے مطالبے کو تسلیم کر لینا چاہیئے تھا۔ حقیقتاً مغربی محاذ پر بھارت کو بھاری زک پہنچانے کے لیے ہم میں قوت بھی تھی اور حالات بھی سازگار تھے۔ مشرقی پاکستان میں بھارت کے نو سے بارہ ڈویژن جنگ میں مصروف تھے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے تھی کہ دشمن کی اس مصروفیت سے فائدہ اُٹھا کر مغربی محاذ پر بھرپُور حملہ کیا جاتا....

"۴ر دسمبر کو ہماری افواج نے فاضلکا، حسینی والا، جسڑ اور چھمب کے مقامات پر برّج ہیڈ بنا لیے تھے اور کٹھوعہ اور مشرقی پنجاب پر یلغار کرنے کے مواقع فراہم کر لیے تھے۔ اس سے ہماری بڑی کاؤنٹر آفینسو فورس (جوابی حملہ کرنے والی فوج) کو گزار کر آگے بڑھایا جا سکتا تھا مگر اس قسم کی تمام توقعات بے سود ثابت ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری ہائی کمانڈ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ ہم اپنی جوابی حملہ کرنے والی فورس کو استعمال کرنے سے پہلے دشمن کے آرمرڈ ڈویژن کو کسی طرح پابندِ عمل کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر یہ درست تھا تو ہائی کمانڈ نے اس امر کو نظر انداز کر دیا تھا کہ جب تک مشرقی پاکستان کی جنگ کسی فیصلہ کُن مرحلے تک نہیں پہنچتی، مغربی پاکستان کے محاذ پر بھارت دفاعی پوزیشن ہی اختیار کیے رکھے گا۔ اس صورت میں اسے اپنے آرمرڈ ڈویژن کو ہم سے پہلے COMMIT کرنے کی امید نہیں تھی۔ اس صورت میں بھی بھارت کو آرمرڈ ڈویژن کو مِٹ کرانے کے طریقے تھے جس کے بعد اسے بائی پاس BY PASS

کیا جا سکتا تھا۔ (میں اس کا ذکر کُھلے الفاظ میں نہیں کرنا چاہتا)....

"ہماری ہائی کمانڈ نے یا تو اپنی مکمل نااہلی کا ثبوت دیتے ہُوئے اس بات کی اہمیّت کا احساس ہی نہیں کیا یا پھر عمداً یہ اقدام نہیں کیا گیا۔ اس طرح ہمارے چار ڈویژن جن میں بیشتر حصّہ بکتر بند فوج کا تھا، بالکل ہی استعمال نہیں ہُوئے اور جب پاکستان کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا تو وہ خاموش تماشائی بن کر درختوں کی آڑ میں چھپائے رکھے رہے اور اب مشرقی پاکستان کے المیہ کو فوجی شکست کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے، جبکہ پاکستان آرمی کے مؤثر اور طاقتور حصّے کو قطعاً استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ یہ شکست دراصل ہماری نااہل قیادت کی شکست ہے جو ہماری جانباز فورس کو اس کی جرأت اور صلاحیتوں کے مطابق کام میں لانے میں ناکام رہی۔ یہ ایسی شکست ہے جو خود غرض سازشیوں کے ہاتھوں ہمیں اُٹھانا پڑی۔ ان کا مقصد ہوسِ اقتدار کے لیے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا تھا۔ ہماری فوج کو میدانِ جنگ میں شکست نہیں ہوئی بلکہ اس کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا گیا ہے....

"اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیشک ہماری OFFENSIVE FORCE دُور تک دشمن کے علاقے میں گھُس سکتی تھی لیکن مفتوحہ علاقے کو تسلط میں رکھنے کے لیے ہمارے پاس نفری ناکافی تھی۔ اس قسم کی سوچ جنگ کے اس زرّیں اصول کو نظر انداز کرتی ہے کہ جب دشمن کو صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کتنی قوّت سے حملہ ہُوا ہے۔ تو اُسے اپنے آپ کو منظّم کرنے کا ہوش نہیں رہتا۔ جب ایک فریق پیشقدمی کرتا ہے تو مخالف فریق اس کی تدابیر کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جُوں جُوں حملہ کرنے والوں کا ایڈوانس آگے بڑھتا ہے وہ خود بخود اپنا تحفّظ کرتا جاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں نازی جرمنی نے اس پر عمل پیرا ہو کر سات دنوں کے اندر مغربی یورپ کو فتح کر لیا تھا، حالانکہ اتحادیوں کے پاس ٹینک بھی زیادہ تھے، برّی اور بحری فوج بھی زیادہ تھی....

"ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چھوٹے پیمانے پر بہت قلیل تعداد سے لاہور کے محاذ پر ہم نے جوابی حملہ کیا تھا جس سے دشمن کی دس گُنا قوّت کو پیچھے دھکیل کر

منتشر کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دشمن ہماری قلیل نفری کا صحیح اندازہ ہی نہ کرسکا اور ہمارے اس جرأت مندانہ اقدام سے وہ یکسر بوکھلا گیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مغربی محاذ سے بھرپور حملہ نہ کرنے کا ایک جواز یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ سندھ کے علاقے میں بھارتی افواج نے جو رخنہ اندازی کی تھی اسے پُر کرنے کے لیے ریزرو فوج سے ایک ڈویژن بھیجا گیا تھا جس سے جوابی حملے کا توازن بگڑ گیا۔ اگر ایک ڈویژن کے اِدھر اُدھر ہونے سے توازن بگڑتا ہے تو یہ ہائی کمانڈ کی منصوبہ بندی کے دیوالیہ پن کا بیّن ثبوت ہے۔۔۔

"سقوطِ ڈھاکہ کے جواز میں متعلقہ فوجی حلقوں میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے سامنے دو صورتیں تھیں کہ یا تو اسّی ہزار جوان کٹ کر مر جاتے یا پھر ان اسّی ہزار تربیت یافتہ جوانوں کو بچا لیا جاتا کہ وہ پھر کسی وقت استعمال ہو سکیں ـــ "پھر" ـــ کا سوال بہت ہی مضحکہ خیز ہے۔ کیا پاکستان کے آدھے حصّے اور سات کروڑ آبادی کو کھو دینے کے بعد بھی کوئی اور ـــ "پھر" ـــ رہ جاتی تھی؟ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر اس اسّی ہزار فوج کو منظم صورت میں لڑایا جاتا تو یہ کم از کم دو لاکھ دشمن کا صفایا کر سکتی تھی۔ ہم نے اسّی ہزار جانبازوں کی جانیں بچا کر دشمن کی دو لاکھ فوجی جانوں کو بھی بچا لیا۔ یہ دو لاکھ بھارتی فوج کشمیر اور مغربی پاکستان پر کسی بھی وقت حملہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مورال اور عسکری وقار پر جو بُرا اثر پڑا اُس کی تلافی نہ جانے کیسے ہو گی۔ تیسرے راؤنڈ میں جس کے بادل فضا میں منڈلاتے ہی رہتے ہیں، ہماری فوج مغلوب فوج کی حیثیت سے صف آرا ہو گی۔ بھارتی افواج کے دلوں میں جو اس کا خوف اور دبدبہ تھا وہ نکل چکا ہے۔۔۔۔

"۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایک امریکی وقائع نگار لوئیس کرار نے لکھا تھا ـــ اس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو۔ میں نے پاکستانی افواج کے جوان سے جرنیل تک کو موت سے یوں کھیلتے دیکھا ہے جیسے گلیوں میں بچے کانچ کی گولیوں کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں" ـــ اور اب بی بی سی کا نمائندہ براڈ کاسٹ کرتا ہے ـــ "پاکستانی فوج کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا فسوں یکلخت ٹوٹ گیا ہے۔ آئندہ پاکستان کبھی بھی بھارت کے مقابلے میں اپنی فوج کی برتری کا جواز پیش نہیں کر سکے گا"۔۔۔

مشرقی پاکستان میں ہماری فوج کا بیشتر حصّہ ہتھیار ڈالنے پر رضامند نہ تھا۔ ہتھیار ڈالنے کے احکام جاری ہونے کے بعد بھی انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ٹولیوں ٹولیوں میں لڑتے رہے، مگر منتشر ٹولیوں میں لڑنا اور بات ہے اور منظم دفاع کی صورت میں لڑنا اور بات ـــ خود جنرل اروڑہ کا بیان ہے ـــ "کھلنا میں ہمیں لاشیں ہی لاشیں ملیں، قیدی کوئی نہ ملا۔ آخری حملے کے طور پر پاکستانی جانباز ہماری صفوں میں گھس گئے۔ وہ خود بھی شہید ہوئے اور ہماری فوج کا بھی صفایا کر دیا" ـــ اس جذبے کے ہوتے ہوئے سقوطِ ڈھاکہ ایک عظیم المیہ اور سازش نہیں تو اور کیا ہے؟۔۔۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یحیٰی خان، اس کے حواریوں اور اس تمام تر قیادت کو جنگ کے نتائج سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں اور سقوطِ مشرقی پاکستان ایک پہلے سے طے شدہ واقعہ تھا جو عین پروگرام کے مطابق اپنی پیچیدہ منزلیں طے کرتا ہوا حتمی نصب العین تک پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان کی جنگ محض رسمی کارروائی تھی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ پاکستان کی قطع و برید کی تمام تر ذمّہ داری فوج پر ڈال دی جائے اور اسے فوجی شکست کہا جائے اور قوم کی توجہ سازش سے ہٹی رہنے دی جائے۔ مغربی پاکستان کے محاذ پر بھی جنگی کارروائی ایک فریب تھا جس کا خفیہ مقصد قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تھا۔ جب مشرقی پاکستان کا قصّہ تمام ہو گیا (جس کا انتظار تھا) تو مغربی پاکستان کے منظر پر بھی پردہ گرا دیا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک سفّاک اور سنگدل ڈکٹیٹر نے اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لیے لاکھوں جانوں کے خون سے ہولی کھیلی اور اس خونی ڈرامے کے آخری منظر میں نہ صرف قومی وقار اور فوجی ساکھ کی دھجیاں اُڑا دیں بلکہ ملکی سالمیت کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔۔۔

"اب ہم اپنے کانوں میں رُوئی نہیں ٹھونس سکتے۔ تیسرے راؤنڈ کی گھنٹی کبھی کی بج رہی ہے۔ اس کا علاج ایک دفاعی کونسل کا قیام ہے جو مختلف سیاسی لیڈروں اور فوجی ماہرین پر مشتمل ہو۔ کشمیر کے متعلق بھارت کی نت نئی پالیسیاں اور سرگرمیاں بتا رہی ہیں کہ اب اس کا ٹارگیٹ پورے کشمیر کو ہڑپ کرنا ہے۔ اس کے

زعم میں پاکستان سقوطِ مشرقی پاکستان کے بوجھ تلے دب کر اپنا فوجی اور سیاسی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اگر ہمیں بحیثیت باوقار قوم زندہ رہنا ہے تو ہمیں یہ چیلنج قبول کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں فوج کو نئے سرے سے منظم کرنا ہوگا اور بین الاقوامی کش مکش میں کسی ایسے ساحل کی جستجو کرنی ہوگی جہاں سے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ طوفان کا مقابلہ کر سکیں۔"

محترم جنرل سرفراز خان کے اس تجزیے اور تبصرے کے بعد کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ جاتا۔ راز تو پھر بھی راز ہی ہیں۔ انہیں سرکاری طور پر قوم کے سامنے لانا ہی ان سرکاری حضرات کی نیت کو بے نقاب کرتا ہے جو اُس وقت اس المیہ ڈرامے کے اہم کردار تھے یا پس پردہ کام کر رہے تھے۔

ضیاء مرحوم نے بھی اس رپورٹ کے ساتھ بھٹو مرحوم والا سلوک کیوں کیا؟

اب یہ رپورٹ کہاں ہے؟

اس تمام تر تجزیے سے جو ہم نے کچھ اپنے مشاہدات سے اور زیادہ تر دوسروں کے حوالوں سے پیش کیا ہے، المیہ مشرقی پاکستان کی یہی وجہ سامنے آتی ہے کہ یہ ایک سازش تھی اور اپنی فوج کو دھوکے دیے گئے۔

بھٹو مرحوم نے حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ کو کیوں دبائے رکھا؟

اِدھر مغربی پاکستان والوں کو مشرقی پاکستان کے متعلق دھوکے میں رکھا گیا۔ اُدھر سے ڈاکٹر مالک (گورنر) اور جنرل نیازی کے الگ الگ پیغام ایوان صدارت اور ہائی کمانڈ کے نام آتے تھے جن میں وہاں کے ٹروپس کی مخدوش حالت، تیزی سے بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور دشمن کی کامیابیوں کی تفصیل دی جاتی تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ جنرل نیازی یہ فقرہ ضرور لکھتے تھے کہ ہم آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑیں گے ـــــ ہمارے اسلام آباد کے حکمران سارا پیغام گول کر جاتے اور اخباروں اور ریڈیو کو صرف یہ خبر دیتے کہ جنرل نیازی نے کہا ہے کہ ہم آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑیں گے ـــــ اگر آپ اپریل ۱۹۷۱ء سے بعد کے اخبارات دیکھیں تو آپ کو جنرل نیازی کا یہی ایک بیان نظر آئے گا کہ ہم آخری سپاہی اور آخری گولی تک لڑیں گے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے دو روز پہلے بھی حکومت کی

طرف سے ان کا اسی قسم کا بیان اخباروں کو دیا گیا تھا۔ پاکستان میں سب سے پہلے جو کتاب لکھی گئی اور اسے مستند کہا گیا اس میں بھی یہ غلط بیانی پائی جاتی ہے کہ جنرل نیازی ہمیشہ اچھی رپورٹ بھیج کر اپنی غلطیوں کو چھپاتے رہے۔ یہاں تک لکھا گیا کہ جنرل نیازی شہیدوں اور زخمیوں کی تعداد کم بتایا کرتے تھے اور وہاں کی نہایت خوشگوار رپورٹ بھیجا کرتے تھے جس سے ہائی کمانڈ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئی۔

اسی کتاب میں اس کی تردید بھی موجود ہے۔ متعدد جگہوں پر لکھا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے حالات اور ٹروپس کی کیفیت اتنی مخدوش نہیں تھی جتنی نیازی رپورٹوں میں بیان کرتے تھے یعنی ایک ہی کتاب میں یہ بھی لکھا گیا کہ جنرل نیازی خوشگوار رپورٹیں دیتے تھے اور یہ بھی لکھا گیا کہ مایوس کن رپورٹیں دیتے تھے حقیقت یہ تھی کہ وہاں کی کیفیت مایوس کن تھی۔ ہمارے ایسٹرن کمانڈ کے تمام جرنیل صرف اس لیے لڑ رہے تھے کہ شکست کو زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے ملتوی کیا جائے۔ اب شکست کو روکا نہیں جا سکتا تھا۔

یہ کتاب ایک ریٹائرڈ جرنیل سے لکھوائی گئی تھی۔ اس کا اس جرنیل کو نقد معاوضہ الگ دیا گیا اور انہیں بھٹو مرحوم نے ڈیفنس سیکرٹری کا اہم رتبہ بھی عطا کیا تھا۔

سفارتی میدان میں ہماری مرکزی حکومت بڑی ہی شرمناک شکست کھا چکی تھی۔ بھارت کی پروپیگنڈہ مشینری نے عالمی برادری کو اپنے حق میں اور ہمارے خلاف کر دیا تھا۔ ہم نے جس طرح مغربی پاکستان سے حملہ تاخیر سے کیا تھا اسی طرح اقوام متحدہ میں بھی ہم اُس وقت گئے جب بھارت ہم پر بلکہ عالمی برادری پر چھا چکا تھا۔ اب ہمارے لیے ہر طرف شکست تھی۔ مغربی پاکستان سے ہم نے جو حملہ کیا وہ بھی شکست میں بدل چکا تھا۔ بجائے اس کے کوئی کامیابی حاصل کی جاتی، بھارتی فوج ہمارے علاقوں پر قابض ہوتی چلی جا رہی تھی لہٰذا بھارت اس محاذ سے بے غم تھا۔ ہمارے حاکموں نے اُسی وقت یعنی جنگ کے دوران ہی شکست کی تمام تر ذمہ داری افواج پر ڈالنی شروع کر دی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال پیپلز پارٹی کے ترجمان روزنامہ "مساوات" کی ہے۔

اس اخبار نے ایڈیٹوریل میں لکھا کہ سپاہی محاذوں پر لڑ رہے ہیں اور ان کے کمانڈر رات کو لاہور میں آکر شراب پیتے ہیں —— اس سے زیادہ مضحکہ خیز الزام اور کیا ہو سکتا ہے۔

یحییٰ خان اور اس کے درباریوں نے جب دیکھا کہ ان کی آمریت اور نا اہلی رنگ لا رہی ہے تو انہوں نے جنگ کے دوران نہایت چابکدستی سے اختیارات اور ذمہ داریاں ڈاکٹر مالک اور جنرل نیازی کے کندھوں پر پھینکنی شروع کر دیں۔ ہُوا یوں تھا کہ ڈاکٹر مالک صدرِ مملکت کو مشرقی پاکستان کی جنگ کے متعلق صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرتے اور اس قسم کے مشورے دیتے تھے کہ فائر بندی کراؤ اور کوئی سیاسی تصفیہ کراؤ۔ جنرل نیازی کی رپورٹیں جی۔ایچ۔کیو کے نام الگ ہوتی تھیں۔ یحییٰ خان اور اس کے پروردہ درباری جرنیلوں نے ڈاکٹر مالک کو یہ کہہ دیا کہ جنرل نیازی کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ آپ کے احکام کے مطابق کارروائیاں کریں۔ جنرل نیازی کو ایسی ہدایات دی گئیں جن میں اختیارات انہیں سونپے جا رہے تھے۔ کرتے کرتے مرکزی حکومت جو ہائی کمانڈ بھی بنی ہوئی تھی مشرقی پاکستان کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی اور ایسٹرن کمانڈ کو اس کی بے بسی اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

ہمارے افسر اور جوان جس انداز سے لڑ رہے تھے وہ دشمن کے لیے اس قدر حیران کُن تھا کہ وہ آج تک ہمارے ٹروپس کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جوان اپنی کمزوریوں اور بے مائیگی کے باوجود بے جگری سے لڑ رہے تھے اور یہ بھی کہ ان کے افسروں کی قیادت جارحانہ اور بے خوف تھی۔

مگر انہیں ہم نے تنہا چھوڑ دیا۔

چند دنوں بعد ڈھاکہ کی سول گورنمنٹ بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ گورنر استعفیٰ دے کر رخصت ہو گئے۔ سول حکام رخصت ہو گئے، پولیس حکام رخصت ہو گئے۔

مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ میں جو معرکے لڑے گئے ان کی

روئیداد بہت ہی طویل ہے۔ ہر معرکہ پوری تفصیل سے سنانے کے قابل ہے۔ یہ معرکے جس جذبے اور شجاعت سے لڑے گئے ہیں اسے ہم بھارت کے جنرل پَلیت کے الفاظ میں ایک بار پھر پیش کر دیتے ہیں۔ اس بھارتی جرنیل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی طور پر ہتھیار نہیں ڈالے گئے۔ بہت سے علاقوں مثلاً ہلّی، جمال پور، کھلنا اور چند دیگر جگہوں پر دشمن (پاک فوج) نے اتنا شدید مقابلہ کیا کہ ان جگہوں پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ایک فرد کو ہلاک کرنا پڑا۔ میمن سنگھ اور جیسور سے دشمن خود پیچھے ہٹ کر شدّت سے لڑا۔ ہتھیار ڈالنے کے اعلان کے وقت بھی مینامتی (کومیلا) کھلنا، دیناج پور، سیدپور اور سلہٹ کے کچھ حصّے پر پاک آرمی کا قبضہ تھا۔ اگر ہماری (بھارتی) فوج ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتی تو لڑائی کئی اور ہفتے لڑی جاتی"۔

جنرل پَلیت کی اس تحریر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ جیسور سے ہمارے ٹروپس بھاگے نہیں تھے بلکہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنرل نیازی نے انہیں ایسے طریقے سے پیچھے ہٹا کر پھیلا دیا تھا کہ دشمن کی حملہ آور کور دو حصوں میں کٹ گئی تھی۔ اس کا ایک حصّہ کھلنا کی طرف گیا جہاں ہمارے ٹروپس جنرل پلیت کے الفاظ میں شدّت سے لڑے۔ جنگ بندی تک انہوں نے دشمن کو کھلنا پر قبضہ نہ کرنے دیا۔ جنرل اروڑہ نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے ٹروپس پر ایسٹرن کمانڈ کی گرفت اور کنٹرول اتنی جلدی ختم نہیں ہُوا تھا جتنا بتایا جاتا ہے۔

بھارتی فیلڈ مارشل مانک شا نے ایک انٹرویو میں کہا تھا —— "یہ جنگ غیر متوازن تھی۔ ہم پچپن کروڑ ہیں، وہ بارہ کروڑ تھے۔ میں اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ وہ محاصرے میں تھے .... وہ (پاکستانی) نہایت اچھے لڑنے والے فوجی ہیں اور وہ نہایت ہی اچھی طرح جنگ لڑے .... مُکتی باہنی بھی ان کے خلاف جوابی اور انتقامی کارروائیوں میں مصروف تھی۔ پھر بھی وہ (پاکستانی)

غاروں میں چھپ کر نہیں بیٹھ گئے تھے۔ وہ بڑی ہی سخت جنگ لڑے
مگر اُن کے لیے وہ مرحلہ آگیا جہاں انہیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ بھارتی
فوج ان پر غالب آگئی ہے اور جنگ جاری رکھنا دانشمندی نہیں"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ٹروپس پر بھارتی فوج اوچھے طریقوں
سے غالب آئی تھی جن میں ایک یہ تھا کہ انڈین ایئر فورس نے شہری آبادیوں پر
بے تحاشہ بمباری شروع کر دی تھی اور دوسرا یہ کہ مانک شا نے اعلان کیا تھا کہ
پاک فوج نے ہتھیار نہ ڈالے تو وہ مکتی باہنی کو قتلِ عام کے لیے کھلا چھوڑ دے
گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مکتی باہنی اُن غیر بنگالیوں کا قتل عام کرے گی جو وہاں
ریفیوجی کیمپوں، گھروں اور کونوں کھدروں میں اہلِ وعیال سمیت چھپے ہوئے
تھے۔ ہمارے فوجی اپنا قتلِ عام تو کرا ہی رہے تھے، مگر وہ یہ برداشت نہیں
کر سکتے تھے کہ شہریوں پر بمباری جاری رہے اور غیر بنگالیوں کا قتلِ عام ہو۔

جنرل نیازی نے امریکی کونسل کو اس قسم کی شرائط لکھ کر دیں کہ انہیں ایسا
علاقہ دیا جائے جہاں وہ اپنی فوج کو اور تمام غیر بنگالیوں کو اکٹھا کر کے مغربی
پاکستان لے جائیں۔ یہ شرائط مانک شا تک پہنچیں تو اُس نے شہری آبادی پر
بمباری اور زیادہ تیز اور وحشیانہ کر دی۔ گورنر ہاؤس اور جنرل نیازی کا ہیڈ کوارٹر
بھاری بموں اور راکٹوں کے خصوصی ٹارگیٹ تھے۔ اسی بمباری کے متعلق جنرل
اروڑہ نے بڑے فخر سے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ میں نے تین دن اور
راتیں جنرل نیازی کو سونے نہیں دیا اور اسے کچھ سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا۔
جنرل نیازی کے ہیڈ کوارٹر کے ایک افسر نے اس انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے
کہا تھا کہ جنرل نیازی تو ۲۰ نومبر سے جاگ رہے تھے۔ انہیں کسی نے کبھی سویا
ہوا نہیں دیکھا تھا۔

یہ بھی پیشِ نظر رکھیے کہ روس نے مشرقی پاکستان کو ختم کرنے کے لیے
بھارت کو دو ہفتے کا وقت دیا تھا مگر دو ہفتوں میں (۲۰ نومبر سے ۴ دسمبر
تک) انڈین آرمی سرحدوں کے ساتھ ساتھ بھی ذرا سے علاقے پر بھی قبضہ
نہیں کر سکی تھی۔ اگر ہماری حکومت مغربی پاکستان سے حملہ کر کے بھارت کو مشرقی

پاکستان پر کھلے حملے کا جواز مہیا نہ کر دیتی تو ہمارے ٹروپس اسی دگرگوں حالت
میں دشمن کے عزائم کو سرحدوں پر ہی ختم کر دیتے۔

دشمن کو یہ خطرہ تھا کہ پاک فوج کے ٹروپس جو پیچھے ہٹ رہے ہیں وہ
ڈھاکہ کے گرد دفاع میں مورچہ بند ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس نے نفری، جنگی
قوت اور طیاروں کی مدد سے ایسی چالیں چلیں جن سے ڈھاکہ کے راستے
بند کرنا مقصود تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے طیاروں سے فوج اتار دی۔
آخر وہ مرحلہ آگیا کہ ایسٹرن کمانڈ نے تسلیم کر لیا کہ اب جنگ جاری رکھنے کا مطلب
شہریوں اور فوجیوں کے قتلِ عام کے سوا کچھ بھی نہیں۔ فتح اور فائر بندی کا تو
سوال ہی ختم ہو گیا تھا اور شکست کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ صدرِ مملکت نے
۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز ایک پیغام کے ذریعے جنرل نیازی کو ہتھیار ڈالنے کے
احکام بھیج دیئے تھے مگر وہ ۱۵ دسمبر تک اس حکم کو ٹالتے رہے۔

ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے گئے لیکن محاذوں پر جنگ جاری رہی۔
فیلڈ مارشل مانک شا نے اپنے انٹرویو میں اور جنرل پیلیٹ نے اپنی کتاب
میں اس کی تصدیق کی ہے کہ تمام فوج نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے ——— اور
اس کے بعد پاکستان میں یہی ایک آواز سنائی دینے لگی —— "جنرل نیازی نے
ہتھیار ڈال دیے ہیں، فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، ہماری فوج شکست
کھا گئی ہے" —— یحییٰ خان نے ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز ریڈیو سے
اعلان کیا کہ جنگ جاری رکھی جائے گی مگر مغربی پاکستان میں بھی فائر بندی کا
حکم دے دیا گیا۔ یہ حکم بالکل ایسا تھا جیسے اِدھر بھی ہتھیار ڈال دیئے گئے
ہوں۔ قوم کا جو ردِ عمل تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ وہ کون سا پاکستانی
تھا جس کی آنکھیں اشکبار نہیں تھیں مگر قوم کی آنکھوں میں ایسی دھول
جھونکی گئی کہ آج تک قوم سرکاری جھوٹ اور حکمرانوں کی ریاکاریوں کے اندھیرے
میں اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی ہے کہ اس شکست کا ذمہ دار کون تھا؟
اور ایسے کئی ایک سوال ہیں جو قوم پوچھنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ الگ
بات ہے کہ قوم کو اندھیرے میں ہی رکھا جائے۔ البتہ ایک مطالبہ جو دراصل

عدل و انصاف کا تقاضہ ہے، حکومت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہتھیار ڈالنے والے جرنیلوں کے خلاف اخباروں اور رسالوں میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مشرقی محاذ کے متعلق کچھ ایسے حضرات کے لکھے ہوئے تبصرے اور تجزیے بھی شائع کیے گئے ہیں جنہیں فوجی امور کی سوجھ بوجھ ہی نہیں۔ کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں فوج کو شکست کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

یہ مضامین اور کتابیں یک طرفہ ڈگری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قوم کو صحیح تصویر صرف اُس روز نظر آئے گی جس روز دوسرے فریق کو بھی بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ اگر اس فریق کو بولنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تو کسی کو بھی رائے زنی کا حق نہ دیا جائے۔ یہ فیصلہ حمود الرحمٰن کمشن کو آزادانہ طور پر کرنے دیا جائے کہ شکست کے اصل اسباب کیا تھے اور اس کے ذمہ دار کون تھے۔

ہمارے ہاں ایک رٹ اور بھی لگائی جاتی رہی وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں لڑنے والے جوانوں کا مورال بڑا بلند تھا اور یہ بھی کہ ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جرنیلوں، بریگیڈ اور یونٹ کمانڈروں پر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا کہ جوانوں کو اعلیٰ قیادت ملتی اور کمانڈر حوصلہ نہ ہارتے تو وہ چند ہفتے اور لڑ سکتے تھے۔ کوئی کہتا ہے وہ چھ مہینے اور لڑ سکتے تھے۔ فرض کیجئے کہ ہمارے ٹروپس چند ہفتے یا چند مہینے اور لڑتے بھی رہتے تو حاصل کیا ہوتا؟ مغربی پاکستان میں بھی جنگ جاری رہتی اور جس تیزی سے دشمن ہمارے علاقوں پر قابض ہوتا چلا جا رہا تھا اس کے پیشِ نظر تصور کیا جا سکتا ہے کہ مغربی پاکستان کی تاریخ کیا ہوتی۔ مشرقی پاکستان میں ہمارے ٹروپس کی جو کیفیت تھی وہ میں نے اسی لیے تفصیل سے بیان کی ہے کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ چند ہفتے اور لڑ سکتے تھے وہ اپنی رائے پر حقائق کی روشنی میں نظرِ ثانی کر سکیں۔

بعض فوجی افسر جن کا تعلق مشرقی محاذ سے نہیں تھا، کہتے ہیں کہ جنرل نیازی کو چاہیئے تھا کہ اپنی فوج کو اسی ترتیب میں لے آتے کہ لڑتے لڑتے برما چلے جاتے۔ اس طرح وہ ہتھیار ڈالنے اور جنگی قید کی ذلت سے بچ جاتے۔ اس کے متعلق یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ فوج کو اِن حالات میں جو میں نے بیان

کر دیئے ہیں اس ترتیب میں لانا کہ وہ محاصرہ توڑ کر نکل جاتے ناممکن تھا اور اگر وہ اس پسپائی میں کامیاب ہو بھی جاتے تو ہم سب بشمولیت اِن حضرات کے جنہوں نے یہ رائے دی ہے، انہیں محاذ کا بھگوڑا کہتے اور سب کا کورٹ مارشل کر دیا جاتا۔

یہ بھی کہا گیا بلکہ لکھا گیا کہ جرنیل اور دیگر افسر جنگی قیدی بننے کی بجائے برما کی طرف نکل جاتے۔ ایک پاکستانی مقالہ نویس نے لکھا کہ جنگی قید سے بھاگنے کا حق ہر فوجی کو حاصل ہے۔ مقالہ نویس نے یہ نہیں سوچا کہ جنگی قید سے بھاگنے کا حق قیدی ہو کر ملتا ہے اور اگر کوئی افسر یہ سوچ کر بھاگ جائے کہ دشمن اُسے قید کر لے گا تو یہ جرم ہے۔ کوئی افسر اپنی یونٹ کو یہ فرض کر کے مورچوں میں چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا کہ وہ قید ہو جائے گا ــــ اپنے افسروں اور جوانوں کی حُب الوطنی اور شجاعت کی تعریف ہم نہ بھی کریں تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہم اپنے جس دشمن کو کمینہ اور ریا کار کہتے ہیں اُس نے بھی ہماری فوج کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ تقریباً ہر ملک کے اخباروں نے ہماری فوج کی تعریف کی تھی۔ ان میں سے ہم امریکہ کے ایک روزنامے "سٹار" کی رپورٹ پیش کرتے ہیں جو اس اخبار کی ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ کی اشاعت میں "سپیشل رپورٹ" کے طور پر اس عنوان سے شائع ہوئی تھی ــــ "اس جیسے دنیا میں بہت کم ہیں"۔ رپورٹ کا متن درج ذیل ہے:

"واشنگٹن، ۱۷ دسمبر۔ مشرقی محاذ کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل نیازی کے فائر بندی قبول کرنے کے فیصلے کو یہاں انسانی اور دلیرانہ کارروائی کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل نیازی اور اُس کے ٹروپس جن کا دشمن سے تناسب چھ اور ایک تھا (یعنی دشمن کی طاقت چھ گنا تھی) اور جو زمین سے فضا اور سمندر سے تمام راستے بند ہونے کی وجہ سے ضروری ساز و سامان سے محروم تھے بھارتیوں کے خلاف کئی مہینوں تک لڑتے رہتے لیکن اس سے شہریوں کا بے تحاشا جانی نقصان ہوتا کیونکہ فضا میں کوئی مزاحمت نہ ہونے سے بھارتیوں نے شہری آبادی پر بے دریغ بمباری شروع کر دی تھی....

"یہاں (واشنگٹن) کے سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ جنرل نیازی نے شہری آبادی کو، خصوصاً اُن مہاجرین کو جو مشرقی پاکستان میں آباد ہوئے تھے مکتی باہنی کے ظلم و تشدد اور بربریت سے بچانے کے لیے فائر بندی قبول کی ہے، کیونکہ بھارتی کمانڈر انچیف جنرل مانک شا اس قدر گری ہوئی سطح پر پہنچ گیا تھا کہ اُس نے کہا تھا کہ اگر فائر بندی قبول نہ کی گئی تو وہ مکتی باہنی کو من مانی کرنے کے لیے کھُلا چھوڑ دے گا....

"امریکی انٹیلی جنس سے ملنے والی اطلاعات سے پتہ چلا ہے کہ جس طرح جنرل نیازی اور اُس کے ٹروپس نے دشمن کا مقابلہ کیا ہے اُس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ کوئی ایسی فوج جو سپلائی سے مکمل طور پر محروم ہو، کبھی اس بے جگری سے اتنے لمبے عرصے تک نہیں لڑی۔ کوئی اور کمانڈر ہوتا تو وہ مہینوں پہلے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ ضابطۂ جنگ اس کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس دلیر پاکستانی کمانڈر اور اُس کے ڈسپلن کے پابند جوانوں نے ہر اُس دشواری کے باوجود جو تصور میں آسکتی ہے، بھارتیوں کو بہادرانہ مزاحمت دی ہے۔ اطلاعوں کے مطابق مشرقی میدانِ جنگ میں بھارتیوں کی اموات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔"

اس رپورٹ کے بعد کوئی اور رائے پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس رپورٹ کو ہم اس لیے مستند سمجھتے ہیں کہ یہ امریکی انٹیلی جنس سے ملنے والی اطلاعات سے مرتب کی گئی ہے۔ ایسی بیسیوں رپورٹیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

یہاں تھوڑا سا مزید تذکرہ مغربی محاذ کا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حملہ غیر سنجیدگی سے کرایا گیا تھا۔ فوج میں جوش اور جذبہ قہر اور غضب کی حد تک تھا مگر حکومت ایک سیاسی کھیل کھیل رہی تھی جس کا فوج کو علم نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دو ہفتوں کے اندر اندر دشمن ہمارے ملک کے ۵ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہوگیا۔ اس میں شکر گڑھ کی پوری تحصیل شامل تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ اور اس کا ذمہ دار کون تھا کہ ہماری ایک پوری کور بیکار بیٹھی رہی اور جنگ میں شریک ہی نہیں ہوئی؟ اور اس کا ذمہ دار کون تھا کہ پاک

فضائیہ کے چار سکواڈرن اُڑے ہی نہیں؟ انہیں اُس وقت بھی استعمال نہیں کیا گیا جب بھارت کے طیارے بے دھڑک آتے اور بمباری کر کے چلے جاتے تھے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کسی سازش کا نتیجہ تھا یا حکمرانوں کی شہنشاہیت کی کرشمہ سازی، یہ ہماری تاریخ کا بہت بڑا حادثہ اور شرمناک واقعہ ہے۔ یہ ایسی قوم کی شکست ہے جو دشمن کے لیے سراپا قہر تھی مگر اس کے حکمران ذہنی مریض اور سیاسی لیڈر اقتدار کے بھوکے تھے۔ انہیں جنگ لڑنے کا ڈھنگ نہ آیا، انہیں ہارنے کا سلیقہ بھی نہ آیا۔ اس حادثے اور المیے کا ایک بے حد خطرناک پہلو یہ ہے کہ سیاستدانوں نے اپنی لغزشوں اور ریاکاری پر پردہ ڈالنے کے لیے تمام تر سیاہی فوج کے منہ پر مل دی ہے جس کے نتیجے میں قوم کو فوج سے بدظن اور بددل کیا گیا ہے۔

ہمیں جو مواد مل سکا ہے وہ پیش کر دیا ہے۔ ابھی بہت سی شہادت پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ پردے نہ جانے اُٹھیں گے یا نہیں۔ ہم قوم سے درخواست کرتے ہیں کہ یک طرفہ رائے اور تبصروں سے متاثر ہو کر اُس دیوار کو مسمار نہ ہونے دیجئے جسے قرآن نے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کہا ہے۔ دشمن کی جنگی تیاریوں اور زمین دوز کارروائیوں کو سامنے رکھئے۔ ملک و ملت کی بقا کے لیے فوج اور قوم کا اتحاد لازمی ہے۔ اُن شہیدوں کی قربانیوں کو نہ بھولیے جن کی ہڈیاں مشرقی پاکستان کی مٹی میں مل گئی ہیں۔ وہ بھوکے اور پیاسے لڑے تھے، وہ بیماری کی حالت میں لڑے تھے۔ وہ دشمن کی جنگی قوت کے مقابلے میں نہتے تھے، ہم نے انہیں دھوکے دیئے وہ پھر بھی لڑتے رہے۔ تاریخ ہمارا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گی کہ دشمن انہیں خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے اور ہم انہیں مجرم کہہ رہے ہیں۔ یاد رکھئے مجاہد مجرم نہیں ہوتے، مجرم مجاہد نہیں بن سکتے، البتہ وہ حکمران بن سکتے ہیں —— اور جب ملک و ملت کی قسمت اِس قبیل کے حکمرانوں کے ہاتھ آتی ہے تو تاریخ اس قوم کو سقوطِ غرناطہ سے سقوطِ ڈھاکہ تک پہنچاتی ہے۔

اٹھارہ برسوں بعد گڑے مُردے اکھاڑنے سے ہمارا مقصد یہ ہے

کہ ہمیں ایک اور سقوط کی طرف لے جایا جا رہا ہے —— ایک اور خانہ جنگی کی طرف!